دلیر یا بیوقوف؟

جرم اور سراغرسانی کی پانچ حقیقی سنسنی خیز کہانیاں

احمد یار خاں

فہرست

کاغذ کے گھوڑے	۵
ماں کی خاطر	۴۷
ماتا کے سپوت	۹۷
کالی چھپکلی اور ریت کے رُستم	۱۶۱
وہ دلیر تھا یا بے وقوف	۲۲۷

پیش لفظ

احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا چوتھا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے تین مجموعے "کار، شلوار اور دوپٹہ"، "بال ایک چڑیل کے" اور "جب مجھے اغوا کیا گیا" آپ پڑھ چکے ہوں گے۔

احمد یار خان کا نام جُرم اور سراغرسانی کی کہانیوں میں ایک سند بن گیا ہے۔ پاکستان میں جُرم اور سراغرسانی کی کہانیاں امریکہ اور برطانیہ سے درآمد ہوتی رہی ہیں۔ انہیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ پاکستان کے ڈائجسٹ پرچے انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی انہی کہانیوں کی بدولت مقبولِ عام ہوئے۔ شرلک ہومز کو ہمارے ہاں خوب استعمال کیا گیا، اور ان رسالوں کے شائقین نے کہا کہ جُرم اور تفتیش کی کہانیاں سمندر پار سے ہی ملتی ہیں، لیکن احمد یار خان نے ان لوگوں کو جُھٹلا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی کہانیوں سے شرلک ہومز کو لوگوں کے ذہن سے اُتار دیا۔

احمد یار خان افسانے نہیں سُناتا بلکہ ہمارے اپنے معاشرے کے وہ ڈرامے پیش کرتا ہے جو پڑھنے والے کے جذبات کو ہلا دیتے اور سنسنی پیدا کر دیتے ہیں مگر ہمارے معاشرے میں یہ ڈرامے ہر روز کھیلے جاتے ہیں۔ احمد یار خان کی کہانیوں میں بلا جواز لذّت نہیں چونکا دینے والی حقیقت ہوتی ہے۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

کاغذ کے گھوڑے

گھوڑے بیچنے والی کو مَیں نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا کہ شیطان عورت ہے۔ اُس کی آنکھیں ہر طرف چوکس ہو کر پھرتی تھیں۔

بچوں کے اغوا کو میں قتل سے زیادہ بھیانک اور گھناؤنا جرم سمجھتا ہوں۔ آج کل یہ جرم اور زیادہ بھیانک ہو گیا ہے کیونکہ بچے اغوا کر کے خرکاروں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ آپ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہوں گے کہ خرکاران بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ بعض بچوں کو پیشہ ور بھکاری بڑے ہی ظالمانہ طریقوں سے بازوؤں اور ٹانگوں سے معذور کر کے انہیں مانگنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ایک اچھے گھرانے کے بچے کا ساری عمر بھیک مانگتے رہنا تو ایک حادثہ ہے، اگر آپ وہ طریقے دیکھیں جن سے بچے کے بازوؤں اور ٹانگوں کو ٹیڑھا کیا جاتا ہے تو آپ کے ہوش ٹھکانے نہ رہیں، آپ کا غش کھا جانا حیران کن نہ ہو۔ بچہ شدید درد سے چیختا رہتا ہے اور یہ عمل کئی مہینے جاری رہتا ہے۔ جسمانی معذوری کے ساتھ بچہ انتہا درجے کی اذیت اور درد کے اثر سے ذہنی طور پر بھی معذور ہو جاتا ہے۔

ہمارے وقتوں میں یعنی جب ہم بھی جوان ہوا کرتے تھے بچوں کے اغوا کی وارداتیں بہت ہی کم تھیں۔ اغوا انتقامی کارروائی کے تحت ہوا کرتا تھا۔ اس وقت انسان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ خرکاری جیسا درندگی اور انسان کشی سے بھرپور پیشہ اختیار کرنے

کی سوچتا۔ ٹانگیں اور بازو توڑ کر یا ٹیڑھے کر کے بھکاری بنانے کی بھی انسان نے نہیں سوچی تھی۔ یہ تو نئی تہذیب کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ انسان جذبات سے خالی ہو کر مشین بن گیا ہے۔ اس میں اخلاق اور کردار بھی نہیں رہا اور انسانی محبت کی جگہ درندگی نے لے لی ہے۔

ہمارے وقتوں میں کسی کا بچہ انتقامی طور پر اغوا کر لیا جاتا تھا اور اغوا کی ایک وجہ یہ بھی سُنی گئی تھی کہ جنگلی خانہ بدوش بچوں کو اغوا کر کے اُن کے سر سے مومیائی نکالتے ہیں جس سے بچے مر جاتے ہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ مومیائی آبِ حیات کی طرح ہر مرض کی دوا ہوتی ہے لیکن مَیں نے اتنی لمبی سروس میں ایسی ایک بھی واردات نہیں سُنی۔ مَیں نے مومیائی دیکھی بھی نہیں۔ یہ محض ایک سنسنی خیز روایت یا حکایت معلوم ہوتی تھی۔

ہندوستان کے جنگلی علاقوں میں ہندو نسل کے بعض قبیلے کبھی کبھی بچے کی قربانی دیا کرتے تھے۔ ایسی وارداتیں بھی بہت ہی کم سُننے میں آتی تھیں، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ برِصغیر کی پولیس کو اغوا کی واردات کی سراغرسانی کا نہ کوئی تجربہ تھا نہ عملی ٹریننگ۔

میرے پاس جب پانچ سال عمر کے ایک بچے کی گمشدگی کی رپورٹ آئی تو مَیں پریشان سا ہو گیا۔ مجھے بھی ایسی وارداتوں کی سراغرسانی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس سے پہلے میں ایک دودھ پیتی بچی کے اغوا کی تفتیش کامیابی سے کر چکا تھا۔ آپ کو یہ واردات سُنا چکا ہوں۔ میرا تجربہ اسی ایک واردات تک محدود تھا۔ مَیں قتل اور ڈکیتی جیسی سنگین اور پیچیدہ وارداتوں سے کبھی نہیں گھبرایا تھا بلکہ مجھ پر تفتیش کا جنون سا طاری ہو جاتا تھا۔ اس دودھ پیتی بچی کے اغوا کے تقریباً ساڑھے تین سال بعد مَیں ہندوستان کے ایک اور قصبے کے تھانے کا انچارج تھا۔ غروبِ آفتاب سے کچھ دیر بعد ایک مسلمان سفید پوش روتا ہُوا تھانے میں آیا

اور بتایا کہ اُس کا لڑکا جس کی عُمر پانچ سال سے دو چار مہینے زیادہ ہے، صبح دس گیارہ بجے کے درمیان گھر سے نکلا پھر واپس نہیں آیا۔ گھر والے جہاں جہاں ڈھونڈ سکتے تھے، ڈھونڈ کر ہار گئے۔ قصبے میں منادی بھی کرائی۔ محلے کے گھر گھر جا کر دیکھا۔ جس قدر تفتیش کر سکتے تھے کی۔ آخر تھک ہار کر میرے پاس آ گئے۔

اُس وقت بچے کو لاپتہ ہوئے کم و بیش بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ وقت اس واردات کا سب سے زیادہ خطرناک عنصر تھا۔ بارہ گھنٹے ضائع کر چکا تھا۔ واردات کے بعد سے شروع ہونے والے وقت کا ایک ایک منٹ بے حد قیمتی ہوتا ہے۔ واردات پر پردے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ملزم دُور نکل جاتے یا زیرِ زمین ہو جاتے ہیں اور کُھرے کھوج مٹی کی تہوں میں دب جاتے ہیں۔

دوسری بیوی نوجوان تھی

اگر یہ بچہ قتل ہو جاتا تو میں اتنا پریشان نہ ہوتا۔ میں سراغ لگا ہی لیتا مگر بچہ اغوا ہو گیا تھا۔ بارہ گھنٹوں میں وہ اس سُست رفتار زمانے میں ایک سو میل دُور نہیں تو پچاس میل دُور تو ضرور پہنچ چکا ہو گا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ بچہ گُم نہیں ہُوا یعنی گھر کا راستہ نہیں بھُولا، اغوا ہُوا ہے۔ وہ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ بھولا بھٹکا بچہ کوئی نہ کوئی گھر پہنچا دیتا۔ اس کے علاوہ بچے کی عمر پانچ سال تھی۔ اس قسم کے شک کا سوال ہی نہیں تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گیا ہو گا۔ ڈر یہ تھا کہ بچہ قتل نہ ہو چکا ہو۔ قتل کا باعث خاندانی عداوت یا کسی اور قسم کی عداوت ہو سکتا تھا جس کا شکار بچہ ہُوا ورنہ بچے کے ساتھ کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے بچے کے باپ سے پہلا سوال یہی کیا کہ اُس کی کس کے ساتھ دُشمنی ہے اور اُسے

کس پر شک ہے؟

اُس نے بڑے پختہ لہجے میں جواب دیا کہ اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں اور اُسے کسی پر شک نہیں۔ میں نے اپنے ڈھنگ اور طریقوں سے اس پر سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا مگر نتیجہ یہی نکلا کہ بچہ کسی دشمنی کا شکار نہیں ہُوا۔

میں نے جب اس کے گھریلو حالات معلوم کیے تو میرا ذہن اس کے گھر میں ہی اٹک گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی دو بیویاں ہیں۔ پہلی بیوی سے تین لڑکیاں ہیں جن میں سب سے بڑی گیارہ سال اور سب سے چھوٹی چھ سال کی ہے۔ اس آخری بچی کی پیدائش سے چھ ماہ بعد اس شخص نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی۔ گمشدہ بچہ اس دوسری بیوی کا واحد بچہ تھا۔ مجھے اچانک وہ واردات یاد آئی جس میں ایک آدمی کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہُوئی تو اُس آدمی نے دوسری شادی کر لی جس کے بطن سے ایک بچی پیدا ہُوئی۔ یہ بچی تین ماہ کی ہُوئی تو گھر سے غائب کر دی گئی۔ بچی کی ماں نے اپنی سَوت پر الزام عائد کیا کہ اس کی بچی کو اُس نے حسد کی وجہ سے اغوا کرایا ہے۔ میری تفتیش میں یہ راز کُھلا کہ بچی کو اپنی ماں نے خود اپنی نوکرانی اور اپنے آشنا کی مدد سے غائب کرایا اور اپنے خاوند کی پہلی بیوی پر اغوا کا الزام عائد کر کے اسے خاوند کی نظروں میں گرانے اور طلاق دلانے کی ایک ادھی کوشش کی تھی۔ (تفصیلی کہانی میری کتاب "کارشلوار اور دوپٹہ" میں بعنوان "پاپی کا پیار" پڑھیے)

اس گمشدہ بچے کے باپ نے بھی جب بتایا کہ اس کے گھر میں دو بیویاں ہیں اور دوسری شادی کی وجہ یہ تھی کہ پہلی بیوی صرف لڑکیوں کو جنم دیتی تھی، اُسے جائیداد کے وارث کی ضرورت تھی جس کے لیے لڑکا ہونا ضروری تھا، لہٰذا لڑکا پیدا کرنے کے لیے

اس نے دوسری شادی کی تھی۔ اس واردات میں بھی مجھے سوت یعنی پہلی بیوی کا حسد نظر آیا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ پہلی بیوی نے حسد کی آگ بجھانے کے لیے پانچ سال کیوں انتظار کیا؟ دونوں بیویاں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ پہلی بیوی بچے کو کسی طریقے سے قتل کرا سکتی تھی لیکن مجھے یہ خیال بھی آگیا کہ یہ عورت عادی مجرم نہیں ہے۔ وہ حسد اور انتقام کے جذبوں سے اندھی کی ہوئی عورت ہے۔ یہ دونوں جذبے ایسے ہیں جن کے زیرِ اثر انسان انتہائی سنگین جرم کر گزرتا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ عورت پانچ چھ سال حسد اور انتقام کی آگ کو دباتی رہی، آخر یہ آگ اس کے قابو سے نکل کر اچانک بھڑک اٹھی اور اس نے سوت کے بچے کو غائب کرا دیا۔ غائب کرا دینے کا مطلب قتل بھی ہو سکتا ہے۔ قتل کرانے کے لیے اس نے اپنے بھائیوں یا آشنا کو (اگر کوئی ہے) استعمال کیا ہوگا۔ مگر بچے کے باپ نے یہ کہہ کر کہ اس کی پہلی بیوی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی، میری سوچوں پر پانی پھیر دیا۔

”آپ کی دوسری بیوی آپ کی پہلی بیوی کو طلاق دلانے کی خاطر اپنے بچے کو عارضی طور پر غائب کرا سکتی ہے“— میں نے کہا —”آپ غیر جانبدار ہو کر سوچیں، ورنہ بچے کی برآمدگی ناممکن ہو جائے گی۔“

”نہیں“— اس نے جذباتی لہجے میں پورے اعتماد سے جواب دیا —”ایسی عجیب و غریب حرکت اس کی فطرت کے خلاف ہے۔“

”آپ کی اور آپ کی بیوی کی عمر میں کتنا فرق ہے؟“

”انیس بیس سال۔“

”کیا وہ آپ کو اتنا ہی پسند کرتی ہے جتنا اپنے ہم عمر یا اپنی طرح کے جوان خاوند

کو پسند کرتی؟“

”آپ شاید تسلیم نہ کریں“— اس نے کہا —”وہ مجھے ایک جوان خاوند کی نسبت زیادہ پسند کرتی ہے۔“

”تو پھر یہ معاملہ مشکوک ہے“— میں نے کہا —”مجھے شک ہے کہ وہ آپ کو بیوقوف بنا رہی ہے۔“

وہ سٹپٹایا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس قسم کے سوال بھی پوچھوں گا جو اس کے مردانہ وقار اور جذبات کو مجروح کر دیں گے۔ اس نے احتجاج کے لہجے میں کہا —

”میرا معصوم بچہ گم ہو گیا ہے اور آپ مجھ سے ایسی فضول باتیں پوچھ رہے ہیں جن کا بچے کی گمشدگی کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں۔“

میں نے اسے کہا کہ میں تفتیش شروع کرنے سے پہلے آپ کی اپنی چارپائی کے نیچے سوٹا پھیر رہا ہوں تاکہ وہ محاورہ سچ ثابت نہ ہو جائے کہ لڑکا بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ سوال جو میں نے پوچھے ہیں اور پوچھوں گا وہ بے حد ضروری ہیں اور اہم ہیں اور اسے میرے ہر سوال کا جواب جذبات سے نکل کر دینا ہوگا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں آج رات نہ سوؤں گا نہ اس کی بیویوں کو اور نہ اسے سونے دوں گا کیونکہ بچے کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں نے خود یا اس نے وقت ضائع کیا تو ہو سکتا ہے بچے کی بجائے اس معصوم کی لاش ملے۔

”خدا کے لیے ملک صاحب! ایسی بات نہ کہیں“— وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا —”یہ میرا ایک ہی بچہ ہے“— اور اس کے منہ سے جو دھاڑیں نکلیں انہوں نے میرا جگر چاک کر دیا۔

میں نے تو پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ تفتیش فوراً شروع کر دوں گا۔ حالانکہ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے مگر اس کی آہ و بکا نے میرے جذبات کو ایسا جھنجھوڑا کہ میں اٹھ کھڑا

ہُوا۔ اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو بلایا۔ اُسے کہا کہ شہر کے تمام رجسٹرڈ، سزا یافتہ اور دیگر مشتبہ افراد کو اکٹھا کر کے تفتیش کرے۔ میں نے اُسے بتایا کہ واردات کیسی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ان افراد میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو کبھی بردہ فروشی یا کسی بچے کے اغوا میں ملوث ہُوا ہو۔ یہ شک ضرور تھا کہ ان میں سے کسی کا باہر کے کسی بردہ فروش کے ساتھ پیشہ ورانہ تعلق ہو سکتا ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی کو میں نے مخبروں کو بھی بلانے کو کہا۔

نجومی نے بتایا تھا

میری کہانیوں سے آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ شہر کے مشتبہ افراد (سزا یافتہ اور بدمعاش وغیرہ) اور مخبر کون لوگ ہوتے ہیں اور تفتیش میں ان کی اہمیت کیا ہے۔ پولیس والے ان کا استعمال بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اے۔ ایس۔ آئی کو معلوم تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ ذرا الگ لے جا کر میں نے اُسے کہا کہ اس شخص کی دونوں بیویوں کے متعلق تمام معلومات حاصل کرنی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں ایک عورت کو استعمال کرنا تھا۔ وہ گھاگ عورت تھی۔ گھر گھر کے بھید جانتی تھی۔

میں ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر بچے کے باپ کے ساتھ اُس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں دانستہ آہستہ چل رہا تھا کیونکہ مجھے اُس سے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں۔ سب سے اہم مسئلہ جائیداد کا تھا۔ کیا اس شخص نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُس کی جائیداد کا وارث یہ بچہ اکیلا یا اُس کے بعد پیدا ہونے والے بھائی ہوں گے؟

"جائیداد کے وارث تو لڑکے ہی ہوتے ہیں"— اُس نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے پہلی بیوی کو کبھی بتایا ہے کہ آپ جائیداد لڑکوں کو دیں گے؟"

"میں نے جب دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا تو اُسے یہی وجہ بتائی تھی کہ مجھے جائیداد کا وارث چاہیے"— اُس نے جواب دیا— "جائیداد کے وارث داماد تو نہیں ہو سکتے۔"

"بیوی نے کیا کہا تھا؟"

"وہ رو پڑی تھی"— اُس نے جواب دیا— "اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ مایوس نہ ہوں۔ خدا نے تین لڑکیاں دی ہیں۔ اب وہ ضرور بیٹا دے گا۔"

"آپ اپنے فیصلے سے ہٹے نہیں؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا— "مجھے ایک نجومی نے بتایا تھا کہ اس عورت کے بطن سے مرد کبھی جنم نہیں لے گا۔ میں نے دوسری شادی کر لی"۔

"پہلی بیوی کے بھائیوں وغیرہ نے آپ کو کوئی دھمکی دی ہو گی یا کچھ کہا ہو گا؟"

"وہ شریف لوگ ہیں"— اُس نے جواب دیا— "اُنہوں نے برادری کے دو معزز آدمیوں کو میرے پاس بھیجا تھا کہ وہ مجھے دوسری شادی سے روکیں۔ لیکن میں نہیں مانا تو دونوں بھائی خود میرے پاس آئے تھے۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں نے انہیں ہر طرح اطمینان دلایا تھا کہ ان کی بہن کی حیثیت اور حقوق میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

"دوسرا رشتہ آپ کو آسانی سے مل گیا تھا؟"

"جائیداد کے لیے کون رشتہ دینے سے انکار کرتا ہے"— اُس نے جواب دیا— "میں نے انہیں صاف کہا تھا کہ دو مکان اور چار ایکڑ زمین ہے جو قصبے کے بالکل ساتھ ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس کی قیمت کئی گُنا بڑھ جائے گی کیونکہ قصبہ پھیلنے سے یہ زمین زرعی نہیں رہے گی، عمارتی بن جائے گی۔ میں نے اُنہیں کہا تھا کہ میں یہ جائیداد دامادوں کو نہیں دینا چاہتا۔ وہ فوراً رضامند ہو گئے تھے۔"

"آپ نے یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہو گی کہ بیس سال کی عمر کی کنواری لڑکی نے بھی آپ کو دل سے قبول کیا ہے یا نہیں؟"

"ملک صاحب!" اُس نے کہا — "آپ مسلمان ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا آپ عورت ذات کو اتنا سر چڑھانا چاہتے ہیں کہ مَیں یا لڑکی کے والدین لڑکی سے پوچھتے کہ اسے یہ رشتہ منظور ہے یا نہیں؟"

"ہاں شیخ صاحب!" — مَیں نے کہا — "مَیں عورت ذات کو سر چڑھانے کا قائل تو نہیں لیکن مَیں پولیس آفیسر ہوں۔ بڑے ڈرامے دیکھے ہیں۔ بیس سال کی کنواری دلہن جب چالیس سال کے خاوند کے سر چڑھتی ہے تو وہ اُس کے دماغ کا وہی حال کر دیتی ہے جو آپ کا ہو رہا ہے۔"

یہ چند ایک اہم اور قابلِ ذکر سوال اور جواب ہیں۔ مَیں نے اُس سے بےشمار سوال پوچھے تھے۔ اُسے دونوں بیویوں پر پُورا پُورا بھروسہ تھا اور وہ اپنے آپ کو دونوں کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ مَیں آج بھی حیران ہوں کہ لوگ بیٹی کو جائیداد کا وارث بنانے سے گریز کرتے ہیں اور اُسے جائیداد کے لالچ میں باپ کی عمر کے آدمی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میری جوانی کے وقت بھی یہی ہوتا تھا۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

اس شخص کو بچے کی گمشدگی پر روتا اور دھاڑیں مارتا دیکھ کر مَیں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ خدا اسے اسی گناہ کی سزا دے رہا ہے کہ یہ اپنی تین بچیوں کو جائیداد سے محروم رکھنا چاہتا ہے اور اس نے ایک عورت کے سہاگ میں دوسری شادی کا زہر گھول دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنی پہلی بیوی سے یہ بھی کہا ہو کہ دیکھ لیا تم نے، مَیں نے جائیداد کا وارث پیدا کر لیا ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے اور یہ کسی کو بھی نظر نہیں آتی۔ مَیں

اُس سے باتیں پوچھتا رہا اور وہ جواب دیتا رہا۔

اُس نے جُوں ہی مجھے بیٹھک میں بٹھایا تو ایک جوان عورت دوڑتی ہُوئی بیٹھک میں داخل ہُوئی۔ وہ پاگل لگتی تھی۔ اُس نے بے تابی سے پوچھا — "میرے مُنّے کو لے آئے؟ کہاں ہے وہ؟"

یہ بچے کی ماں تھی۔ اُس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر اتنی آہ و زاری کی کہ میرے آنسو نکال دیئے۔ اس کی آواز بیٹھی بیٹھی لگتی تھی۔ ایک ہی رٹ لگاتے جا رہی تھی — "میرا مُنّا۔ میرا بچہ۔"

مَیں نے اُسے تسلی دی۔ خاوند نے اُسے اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ خاوند خود بُری حالت میں تھا۔ بولتے بولتے اُس کی سسکیاں نکل جاتی تھیں۔ مَیں ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ باپ بیٹی لگتے تھے۔

بیٹھک کے اندرونی دروازے میں ایک اور عورت آن کھڑی ہوئی۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ وہ پہلی بیوی تھی۔ اُس نے دبی سی آواز میں پُوچھا — "مُنّے کی کیا خبر ہے؟"

"اللہ کرے گا مِل جائے گا۔" مَیں نے جواب دیا اور خاوند سے کہا کہ دوسری بیوی کو میرے پاس چھوڑ کر وہ باہر چلا جائے۔

وہ میرے پاس اکیلی رہ گئی۔ بڑی مشکل سے اسے بہلایا اور تفتیش کے لیے تیار کیا۔ مَیں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ خاوند کو وہ کس حد تک پسند کرتی ہے۔ پولیس والے ایسی باتیں معلوم کرنے کے لیے کوئی بھی سوال سیدھا یا صاف نہیں کرتے۔ ایک ڈھنگ اور ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ بڑی دُور کا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ مشتبہ کے چہرے کے آتے جاتے رنگ اور جواب دینے کے مختلف انداز اور لہجے دیکھنے پڑتے ہیں۔ بعض اوقات ایک واضح جواب اتنا واضح نہیں

ہوتا جتنا چہرے کا تاثر۔ مشتبہ فرد سوالوں کے چکر میں ایسا اُلجھتا ہے کہ وہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ ایک ایک سوال کئی کئی بار پوچھا جا رہا ہے۔ وہ ہر سوال کو نیا سمجھتا ہے، اور اپنے آپ کو ہوشیار اور چالاک سمجھ کر یہ دیکھے بغیر جواب دیتا چلا جاتا ہے کہ اسی سوال کے وہ دو تین جواب دے چکا ہے اور ہر بار اُس نے مختلف جواب دیا ہے۔ اگر ملزم ذہین ہو تو وہ تشدد کے بغیر اقبالِ جرم کر سکتا ہے۔

پہلی بیوی — جرم نہ شرارت

اس جوان سال عورت کے گرد میں نے سوالوں اور سوال در سوال کا جال پھیلانا شروع کر دیا اور ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ اسے تسلی دلانے کی ضرورت تھی جو میں پوری کرتا رہا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنے بچے کی گمشدگی میں اس کا اپنا ہاتھ نہیں اور یہ بھی کہ اپنی سوت پر ذرہ بھر شبہ نہیں۔ میں نے اُس کے منہ میں یہ شبہ ڈالنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس نے قبول نہیں کیا۔ میں یہ سُن کر حیران بھی ہُوا کہ اسے اپنی سوت کے خلاف کوئی شکایت نہیں اور وہ دونوں اتفاق سے رہتی ہیں۔

اس دوسری بیوی کا انداز اور لب ولہجہ بتا رہا تھا کہ اسے کسی پر شک نہیں۔ اپنے خاوند کے متعلق اس نے بتایا کہ اچھا آدمی ہے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہلوا لیا کہ اسے اپنے خاوند کے ساتھ ایسی محبت نہیں جیسی اسے اپنی عمر کے خاوند کے ساتھ ہوتی۔ پھر بھی مجھے اس سے کوئی ایسا اشارہ نہ ملا جس سے کسی شرارت یا سازش کا شک ہوتا۔ وہ بے قابو ہو کر روتی تھی۔ بار بار میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر یا میری ٹھوڑی پکڑ کر منتیں کرتی تھی کہ اس کا بچہ واپس لا دوں۔

اسے باہر بھیج کر پہلی بیوی کو بلایا۔ اسے بھی تفتیش کے چکر میں ڈالا مگر یہ بھی دُھلی ہوئی تختی نظر آتی تھی۔ میں نے اس کے جذبات کو اس کے خاوند کے خلاف اور دوسری بیوی کے خلاف بھڑکانے کی بھی کوشش کی۔ اس کے ذہن میں جائیداد بھی ڈالی لیکن یہ عورت یا تو جذباتی لحاظ سے مُردہ ہو چکی تھی یا گھر کی چار دیواری میں ہی تارک الدُنیا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے خاوند اور سوت کے خلاف کوئی شکایت نہ کی۔ اگر وہ خاموش رہتی اور میرے سوالوں کے جواب ادھورے ادھورے اور گول گول دیتی تو میں شک میں پڑ جاتا۔ اس کا ہر جواب صاف اور واضح تھا۔

اگر مجھ میں انسان شناسی کی کچھ مہارت تھی تو بچے کی گمشدگی میں اس عورت کا ہاتھ نہیں تھا۔ جائیداد کے متعلق اس نے کہا کہ مجھے جائیداد کی کیا ضرورت ہے۔ بچیاں چھوٹی ہیں۔ پھر بھی باپ نے ابھی سے مجھے اس مقصد کے لیے الگ پیسے دینے شروع کر دیئے ہیں کہ ان کا جہیز بنانا شروع کر دو۔ بچیاں اپنے گھروں میں چلی جائیں گی۔ میں اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔ خاوند ہے تو سب کچھ ہے۔ میں ابھی بوڑھی نہیں ہُوئی۔ اللہ مجھے بھی لڑکا دے گا۔

”تمہاری سوت کے والدین جائیداد کے لالچی معلوم ہوتے ہیں“— میں نے کہا— ”اسی لالچ میں انہوں نے جوان بچی اتنی بڑی عمر کے آدمی کے حوالے کر دی ہے جس کے پہلے بیوی بچے بھی ہیں“

”نہیں۔ ایسا نہیں“— اس نے کہا— ”انہوں نے کسی لالچ میں آکر لڑکی نہیں دی۔ میں انہیں جانتی ہوں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو کہا کرتے ہیں کہ لڑکی وہاں دیں گے جہاں وہ بادشاہی کرے گی۔ وہ اپنی لڑکی کو جائیداد دلانا چاہتے تھے مگر میرا خاوند اپنے لڑکے کو جائیداد دینا چاہتا ہے۔ ویسے وہ لوگ اچھے ہیں“

اس طرح اُس نے جو بات بھی کی اس میں مجھے جُرم اور شرارت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی خیال آتا تھا جیسے اس نے اپنے آپ کو اپنے اللہ اور رسولؐ کے حوالے کر دیا ہے۔ مختصر یہ کہ میرے تجربے کے مطابق اس واردات میں یہ عورت ملوث نہیں تھی۔

مَیں نے اس کے خاندان اور سَوت کو بھی اندر بلا لیا۔ سَوت یعنی گمشدہ بچّے کی ماں کے والدین بھی وہیں آ گئے تھے۔ انہیں بھی بلا لیا۔ بچّے کی عادتوں وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ مجھے بچّے کا فوٹو دکھایا گیا جو ایک سال پہلے کا تھا۔ پیارا بچہ تھا۔ اُس کی آنکھیں بہت دل کش تھیں۔ مجھے اس کا رنگ گورا بتایا گیا۔ اُس کا رنگ ماں پر گیا تھا۔ اس کی گردن لمبی تھی۔ اگر تصویر میں اس کے بال چھوٹے نہ ہوتے، تو مَیں اسے لڑکی سمجھتا۔ اس کی عادتوں کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ اس میں بچّوں والی جھجک نہیں ہے۔ اجنبیوں کے ساتھ بھی فوراً بے تکلف ہو جاتا ہے۔ اس کا معمول یہ تھا کہ دس گیارہ بجے کے درمیان باہر نکل جاتا تھا۔ گلی جہاں ختم ہوتی تھی وہاں کچھ جگہ خالی تھی جہاں یہ بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اِن تمام بچوں سے اس کے متعلق پوچھا جا چکا تھا۔ کسی ایک بچے نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ یعنی وہ کھیلنے کے لیے بچوں تک پہنچا ہی نہیں تھا۔

"کبھی ایسا ہُوا ہے کہ بچّہ کہیں دُور نکل گیا ہو اور آپ لوگ اسے ڈھونڈ کر لائے ہوں؟"

"کبھی نہیں"۔ اُس کی ماں نے جواب دیا ـــ "خود ہی جاتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کر واپس آ جاتا ہے۔"

"گھر میں کسی ایسی عورت کا آنا جانا تو نہیں جو مشکوک چال چلن کی ہو؟"

"نہیں" ـــ سب نے تائید کی کہ اس گھر میں محلے برادری کی عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں آتا۔

پھر بچہ کہاں جا سکتا تھا؟ جیسا کہ مَیں کہہ چکا ہُوں کہ وہ زمانہ خرکاروں کا نہیں تھا اور بچوں کو معذور کرنے کا پیشہ بھی موجُود نہیں تھا۔ اگر بچہ لڑکی ہوتی تو گمشدگی قابلِ فہم ہو سکتی تھی۔ اُس کی خوبصورتی غیر معمولی تھی۔ یہ شک بھی پیدا ہُوا کہ ہندوؤں کے اُس قبیلے کا کوئی آدمی اُسے نہ اٹھا لے گیا ہو جو بچوں کی قربانی دیا کرتے ہیں۔ چند سال پہلے میرے تھانے سے پچاس میل دُور برہمنوں نے اچھوتوں کے ایک بچے کو ذبح کر دیا تھا۔ یہ قربانی چیچک کی دیوی کو دی گئی تھی۔ وہ لوگ پکڑے گئے تھے، غالباً انہیں سزا بھی ملی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی اور وجہ سمجھ نہیں آتی تھی۔

بچّہ بہرحال اغوا ہو گیا تھا اور مجھے بچّے کو برآمد کرنا تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ مَیں نے بچے کی ماں کو تسلیاں دیں اور اسے اور باقی سب کو روتا چھوڑ کر تھانے چلا گیا۔ وہاں ضروری عملہ جاگ رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ مَیں تفتیش کے معاملے میں کتنا بے آرام اور بے صبر ہُوں۔ بچے کی ماں کی فریادیں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ مَیں وردی نہ اتاروں اور میری آنکھ نہ لگ جائے۔

شہر کے جرائم پیشہ اور مشتبہ افراد آ چکے تھے۔ دو مخبر بھی موجُود تھے۔ مجھے یہ شک بھی ہُوا کہ گرد و نواح کے کسی پیشہ ور مجرم نے یہ واردات کی ہو گی۔ قصبے کے اِرد گرد دیہاتی علاقے میں دو پیشہ ور ڈکیت اور رہزن تھے۔ گو وہ بڑے پیمانے کی وارداتیں کرتے تھے لیکن اُن کے ریکارڈ میں اغوا اور بردہ فروشی کی ایک بھی واردات نہیں تھی۔ وہ کوئی ایسے نامی گرامی پیشہ ور بھی نہیں تھے کہ جرائم کی تاریخ میں ان کا ذکر آتا۔ ان کی بہادری یہ تھی کہ اس دیہاتی علاقے کے لوگ غریب اور بُزدل تھے۔ زیادہ تر گاؤں گھاس اور سرکنڈوں کے بنے ہُوئے جھونپڑوں کے تھے۔ یہ لوگ ان مجرموں سے اتنا ڈرتے کہ انہیں پناہ دے دیتے اور پولیس اگر چلی جائے تو پولیس کو گمراہ کر دیتے تھے۔ مجرم انہیں دھمکیاں تو دیتے ہی رہتے تھے لیکن روپے پیسے اور اجناس سے انہیں خوش بھی رکھتے تھے۔

ان دو پیشہ ور مجرموں کے ٹھکانوں پر چھاپہ مارنا یا انہیں تلاش کرنا اس لیے بیکار تھا کہ وہ اچانک یعنی بے خبری میں ہاتھ نہ آتے تو ہوشیار ہو جائیں گے جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بچے کو کہیں دور بھیج دیں گے، یا قتل کر کے کہیں دفن کر دیں گے۔

ماں پر غشی کے دورے

شہر کے پیشہ ور مشتبہ افراد میں تین ایسے تھے جو ذرا دلیرانہ واردات کر سکتے تھے۔ باقی سب اکیلے دکیلے، چھوٹا موٹا جرم کرنے کے عادی تھے یا خفیہ اڈوں پر چرس اور جوئے کا کاروبار کرتے تھے۔ اگر باہر کے کسی پیشہ ور نے بچہ اغوا کیا ہے تو یہ بچہ کوئی بے جان چیز تو نہیں تھا کہ کوئی آیا اور اٹھا کر چل دیا۔ میں نے ان افراد کو اپنے مخصوص طریقے سے گھیرا۔ وہ پولیس کی کمزوریوں سے واقف تھے اور میں ان کی کمزوریوں کو جانتا تھا۔ انہی میں میرے مخبر بھی تھے۔

میں نے ان کے ساتھ جھک جھک کرتے رات کا باقی حصہ گزار دیا اور حاصل صرف یہ ہوا کہ باہر کا ایک جرائم پیشہ گزشتہ پندرہ دنوں میں دو بار قصبے میں دیکھا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس روز یعنی واردات کے دن بھی اسے دیکھا گیا تھا۔ اس کا لباس پاجامہ کرتہ اور سر پر چادر بتایا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، وہ موسم ایسا نہیں تھا کہ دن کے وقت سر پر چادر لی جاتی۔ چادر لینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا چہرہ چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔ چادر سلیٹی رنگ کی بتائی گئی تھی۔ باہر کے بڑے جرائم پیشہ جب شہر میں آتے تھے تو رہنے یا چھپنے کے لیے انہیں ٹھکانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ ٹھکانہ شہر کا کوئی جرائم پیشہ مہیا کرتا تھا۔ مجھے ایسا کوئی سراغ نہ ملا کہ وہ کسی کے پاس ٹھہرا ہو، اور مجھے ایسا بھی کوئی اشارہ نہ ملا جو مجھے اس شک میں ڈالتا کہ بچے کے اغوا کا مجرم یہی شخص ہے۔ اس کا نام بدر دین عرف بودا تھا۔ یہ ان دو پیشہ وروں میں سے تھا جن کا میں نے

پہلے ذکر کیا ہے۔ میں نے اسی وقت ایک مخبر اس کی سُن گن لینے کے لیے بھیج دیا۔

رات گزر گئی۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ اڑھائی تین گھنٹے آرام کیا اور جب تھانے میں آیا تو بچے کا باپ اور دو ماموں وہاں بیٹھے تھے۔ وہ میرے لیے کوئی نئی خبر یا کوئی نیا سراغ نہیں لائے تھے۔ وہ سراپا سوال بن کر آئے تھے۔ ان کی آنکھیں اور چہرے بتا رہے تھے کہ رات بھر سوئے نہیں۔ انہوں نے یہی ایک خبر سنائی کہ بچے کی ماں پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں اور صبح ڈاکٹر کو گھر لے گئے تھے جس نے اسے دوائیاں دے کر سلا دیا ہے۔ میں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کوئی واضح راستہ نہیں ملتا تھا۔

بہت سوچ وبچار کے بعد میں بچے کے باپ کے ساتھ تھانے سے نکل گیا۔ میں نے شہر کے مشتبہ افراد کو تھانے میں پابند رکھا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ انہیں آزاد کر دیا تو ان میں سے جس کسی کو مجرم کا علم ہے وہ اسے بتا دے گا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ پیشہ ور مجرموں کے بھی مخبر ہوا کرتے تھے۔ اے۔ ایس۔ آئی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اپنے مخبروں کو اور تین چار بغیر وردی کانسٹیبلوں کو قصبے میں گھومنے پھرنے کے لیے اس ہدایت کے ساتھ بھیج دے کہ باہر کا کوئی جرائم پیشہ نظر آئے تو فوراً اطلاع دیں۔

میں یہ انتظامات کر تو رہا تھا لیکن بالکل ہی غیر یقینی حالت میں۔ یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بچوں کے اغوا کی وارداتوں کی تفتیش اور سراغرسانی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بعض اوقات محسوس ہوتا تھا جیسے میں احمقانہ حرکتیں کر رہا ہوں۔ البتہ پولیس کا دیگر تجربہ اور اپنی عقل کچھ ساتھ دے رہی تھی۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ بچہ گھریلو چپقلش کا شکار نہیں ہوا۔ مخبروں نے بھی صبح سویرے آکر تصدیق کر دی تھی کہ بچے کے باپ کی دونوں بیویاں شریف اور دونوں کے خاندان باعزت ہیں۔ ان گھرانوں میں کوئی سازش نہیں ہو سکتی۔

میں بچے کے باپ اور دو ہمراہوں کے ساتھ اُن کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں جاکر وہ جگہ دیکھی جہاں بچہ جاکر کھیلا کرتا تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے بچے کھیل رہے تھے۔ اِن سے کچھ باتیں پوچھیں جن میں اہم یہ تھی کہ انہوں نے کسی آدمی کو گمشدہ بچے کے ساتھ باتیں یا پیار کرتے دیکھا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ بچے کو صبح سے دیکھا ہی نہیں۔

اس جگہ کے قریب چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ دکانداروں سے یہی سوال پوچھا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ انہوں نے بچے کو نہیں دیکھا۔ میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ بچے کو گلی میں سے ہی اُٹھا لیا گیا ہے۔ اس کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا کہ اُسے کوئی لالچ دے کر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے کوئی دن دہاڑے کمبل میں لپیٹ کر یا بوری میں ڈال کر لے گیا ہو۔ لالچ دے کر اپنے پیچھے پیچھے لے جانے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کیا گیا ہوگا جس پر آمدورفت کم ہوگی۔ اُس زمانے میں آبادی آج کی نسبت بہت کم تھی۔ لوگ بہت کم تھے۔ مکان بھی کم تھے۔

بچے کے ہاتھ میں گھوڑا

میں نے وہاں کھڑے کھڑے یہ فرض کر لیا کہ میں ایک بچے کو اغوا کرنا چاہتا ہوں۔ اُسے مٹھائی دکھاتا ہوں۔ پانچ سال کی عمر کا نادان بچہ میرے پیچھے چل پڑتا ہے۔ میں یقیناً کوئی ویران راستہ اختیار کروں گا۔ بچہ میرے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ ذرا آگے جاکر اس کے ہاتھ میں تھوڑی سی مٹھائی دے دیتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ یا پیچھے چلا آ رہا ہے۔ میں کون سا راستہ اختیار کروں گا؟

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے ایک فراخ گلی نظر آئی جس کے دائیں بائیں تھوڑے

سے مکان تھے۔ کچھ جگہ خالی بھی تھی۔ یہ گلی کھیتوں سے جا ملتی تھی۔ آگے سڑک تھی۔ سڑک پر چڑھ جاؤ تو قصبہ پیچھے رہ جاتا تھا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا اس گلی میں چلا گیا۔ محفوظ راستہ قصبے سے نکلنے کے لیے یہی تھا۔ میں گلی کے وسط میں جا کھڑا ہُوا۔ زیادہ تر مکان ہندوؤں کے تھے۔ میرے ساتھ بچوں اور بڑی عمر کے آدمیوں کا جلوس تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ یہ جلوس میرے ساتھ رہے بلکہ بڑھ جائے۔ اِس سے مجھے سراغ ملنے کی توقع تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس گلی کے مکانوں میں سے چند ایک آدمی نکل آئے۔ عورتیں دروازوں میں کھڑی رہیں۔

میں نے ان سب سے بلند آواز میں جوشیلی تقریر کرنے کے لہجے میں کہا کہ ایک بچہ تمہاری نظروں کے سامنے سے گزار کر کوئی لے گیا ہے۔ اگر مجرم پکڑا نہ گیا تو تمہارے بچے بھی اسی طرح اغوا ہوں گے۔ ذرا یاد کرنے کی کوشش کرو کہ پانچ چھ سال عمر کا ایک بچہ کسی آدمی کے ساتھ کل دوپہر کے وقت یہاں سے گزرا ہوگا۔

میرا یہ سوال بظاہر احمقانہ تھا۔ وہ گلی تھی۔ کئی بچے اپنے باپوں کے ساتھ یہاں سے گزرے ہوں گے۔ تمام لوگ خاموش رہے۔ میں نے کچھ اور باتیں کیں اور لوگوں کو کچھ اشارے بھی دیئے۔ میری نظر ایک بوڑھے ہندو پر پڑی جو ایک مکان کے سامنے چھوٹی سی چارپائی پر لیٹا ہُوا تھا۔ وہ اُٹھا اور لاٹھی کے سہارے میری طرف آیا۔ وہ مجھے ہاتھ اُوپر کر کے اشارے کر رہا تھا۔ میں اُس کی طرف بڑھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ صبح سے شام تک اس چارپائی پر لیٹا یا بیٹھا رہتا ہے۔ عمر کی زیادتی کے علاوہ کمر اور بائیں ٹانگ کا درد اسے اُٹھنے نہیں دیتا۔ وہ سارا دن آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہ راستہ چونکہ عام راستہ نہیں ہے کیونکہ آگے کھیت ہیں اِس لیے ادھر سے بہت کم لوگ گزرتے ہیں۔ یہ بوڑھا جہاندیدہ آدمی تھا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے ہنس کر

کہا کہ گلی میں کوئی داخل ہوتا ہے تو میں اُسے دیکھنا شروع کرتا ہوں۔ نظروں سے اوجھل ہونے تک میں اُسے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہی میرا شغل رہ گیا ہے۔ اسی سے دل بہلاتا ہوں۔

اُس نے گذشتہ روز کے مشاہدات سُنانے شروع کر دیئے۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ اس گلی سے کتنے لوگ گذرے تھے، اور وہ کس کس حُلیے کے تھے۔ آٹھ گدھے بھی گزرے تھے جن پر اینٹیں لدی ہوئی تھیں۔ اور دوپہر کے وقت پانچ چھ سال کی عمر کا ایک بچہ بھی گزرا تھا جسے اُس نے اس لیے زیادہ غور سے دیکھا کہ بہت خوبصورت بچہ تھا۔ بچے کے ساتھ ایک آدمی تھا جس نے پاجامہ کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس آدمی کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اُس نے سر پر چادر لے رکھی تھی۔ چادر کا باقی حصہ کندھوں تک تھا۔

میں نے چادر کا رنگ پوچھا تو بوڑھا سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے تین رنگ بتائے — "سلیٹی، ہلکا نیلا یا چادر بہت میلی تھی"۔ بوڑھے نے بتایا کہ بچے کے ہاتھ میں کاغذوں کا چھوٹا سا سیاہ گھوڑا تھا۔ ایسا ہی ایک گھوڑا اُس آدمی کے ہاتھ میں تھا۔

یہاں کاغذوں کے گھوڑے کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ کھلونا ہوتا ہے۔ کاغذوں اور سُبھوتے وغیرہ سے گھوڑا بنا کر اُوپر سیاہ کپڑا چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس پر رنگارنگ کاغذ چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ٹانگیں سرکنڈوں کی بنائی جاتی ہیں۔ اُس زمانے میں ایسے گھوڑے عام ہوتے تھے۔ آج کل کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ایسے گھوڑے کسی کارخانے میں نہیں بلکہ دیہات میں بنتے تھے۔ عموماً خانہ بدوش قسم کی عورتیں بنا کر شہروں میں لایا کرتیں اور گلی گلی بیچا کرتی تھیں۔ بچوں کے لیے یہ بڑا دلکش کھلونا ہُوا کرتا تھا۔

بوڑھے ہندو نے بتایا کہ وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے لیٹے لیٹے بچے اور اس آدمی کو دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اسے ایسا کوئی شک نہیں تھا کہ بچہ اغوا کیا جا رہا ہے۔ اسے بچہ

پیارا لگا۔ وہ جب اس کے قریب سے گزرا تو بچے نے کہا "میں اپنے گھر جا رہا ہوں" — آدمی نے کہا — "ادھر سے نزدیک ہے۔ گھر ہی جا رہے ہیں۔ دوسرا گھوڑا گھر چل کر ملے گا" — بچہ اُس کے ساتھ چلتا گیا۔ وہ دونوں چلے گئے تو آگے یعنی جدھر وہ گئے تھے ایک بوڑھی عورت آ رہی تھی۔ وہ مسلمان تھی۔ ہندو نے اس کا نام بھی بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ اسی گلی کے قریب رہتی تھی۔ ہندو اور یہ مسلمان عورت ہم عمر تھے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ پرانے وقتوں کے لوگ تھے۔ بُڑھیا اس کے پاس رک گئی اور وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں اس بچے کا ذکر آ گیا۔ ہندو دراصل بچے کی خوبصورتی کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔ بڑھیا نے اُسے بتایا کہ یہ دوسری بیوی کا بچہ ہے، پہلی بے چاری کی صرف لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بوڑھوں کی عادت ہوتی ہے کہ بے معنی سا موضوع لے کر کتنی ہی دیر اسی میں اُلجھے رہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنے ہی اہم موضوع پر باتیں کر رہے ہیں۔

میں نے اس مسلمان بڑھیا کو بلوا لیا اور ہندو سے پوچھا کہ اُس نے کل ایک بچے کی گمشدگی کی منادی سُنی تھی؟ اُس نے منادی سُنی تھی لیکن اسے بالکل شک نہیں تھا کہ یہ وہی بچہ ہے جس کی گمشدگی کی منادی کرائی جا رہی ہے۔ بڑھیا آئی تو اُس نے بتایا کہ اس نے منادی سُنی ہی نہیں۔ اُس نے تصدیق کی کہ اُس نے گمشدہ بچہ ایک آدمی کے ساتھ جاتا دیکھا تھا لیکن اس نے اس آدمی کا حُلیہ اور لباس غور سے نہیں دیکھا۔ کاغذوں کا ایک گھوڑا بچے کے ہاتھ میں اور ایک اس آدمی کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔

اس قیمتی سراغ سے یہ ثابت ہو گیا کہ بچہ اغوا ہو گیا ہے اور اس راستے سے گیا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ یہاں سے آگے بچہ کہاں اور کس طرح لے جایا گیا۔ آگے تانگہ انتظار میں تھا یا گھوڑا یا کوئی اور انتظام تھا۔ اس سے پہلے ایک مخبر بتا چکا تھا کہ بودا کو شہر میں دیکھا گیا تھا۔

اُس کے سر پر سلیٹی رنگ کی چادر تھی۔

عصمت فروشی بھی کرتی تھی

گمشدہ بچے کا باپ میرے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا ــــ "میرا بچہ کاغذوں کے گھوڑوں کا عاشق ہے۔ تین گھوڑے پھاڑ چکا ہے۔ اسے گھوڑے کے لالچ میں ہی اغوا کیا گیا ہے"۔

یہ سُن کر میری ایک اور حس بیدار ہو گئی۔ یہ الفاظ میرے لیے بڑے اہم تھے ــــ "بچہ کاغذوں کے گھوڑوں کا عاشق تھا" ــــ اس کا مطلب یہ تھا کہ اغوا کرنے والے کو معلوم تھا کہ بچہ گھوڑے کے لالچ میں پھنسے گا۔ مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ اغوا کرنے والا ان کے اپنے ہی خاندان کا کوئی آدمی ہوگا جو بچے کی عادتوں سے واقف ہوگا لیکن مَیں یقین کر چکا تھا کہ اس خاندان میں ایسا جرم کرنے والا کوئی آدمی نہیں۔ سب عزت دار لوگ تھے۔ یہاں میری عقل کا امتحان تھا۔

مَیں وہاں سے چل پڑا اور بچے کے گھر جا بیٹھا۔ باپ سے پوچھا کہ اس کے بچے نے جو تین گھوڑے پھاڑے ہیں وہ کہاں سے خریدے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک دیہاتی عورت کچھ عرصے سے گھوڑے بیچنے آتی ہے۔ اُسے چونکہ معلوم ہے کہ بچہ گھوڑے پسند کرتا ہے، اس لیے ان کے دروازے پر آکر ضرور آواز دیتی ہے۔ میرے پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ وہ پندرہ بیس روز بعد آتی ہے۔ واردات کے روز یعنی ایک روز پہلے وہ نہیں آئی تھی۔

مَیں نے ایک آدمی کو یہ کہہ کر باہر بھیجا کہ بچوں سے یا دونوں دکانداروں سے معلوم کرے کہ کیا یہ عورت کل گھوڑے بیچنے آئی تھی؟ مَیں نے اس دوران بچے کی ماں سے کچھ باتیں کاغذوں کے گھوڑوں کے متعلق پوچھیں۔ ان سے یہی تصدیق ہوئی کہ بچہ ان گھوڑوں کا بے حد شوقین تھا۔ نیا انکشاف یہ ہُوا کہ یہ عورت اندر آجاتی تھی اور بچے کے ساتھ پیار کرتی تھی۔ میرے کریدنے پر

یہ بھی معلوم ہُوا کہ یہ عورت بچے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ ماں نے ایک بار بچے کے ماتھے پر سُرمے کی لکیر ڈال دی تھی کہ بچے کو نظرِ بد نہ لگ جائے۔

یہاں میں اپنے قارئین کو تفتیش کے معاملے میں یہ بات بتانا ضروری سمجھتا ہُوں کہ یہ تفتیش کرنے والے پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس بات کو اہم سمجھتا ہے اور کس بات کو معمولی سمجھ کر ٹال جاتا ہے۔ اس کے لیے تجربے اور عقل کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ خلوص اور فرض کی لگن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تفتیش کی کامیابی کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے مثلاً کاغذوں کا گھوڑا اور گھوڑے بیچنے والی عورت میرے ذہن میں اٹک گئی، لہٰذا میں نے جرح اور پوچھ گچھ اسی پر مرکوز کر دی۔ اس پر توجہ مرکوز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ عورتیں جو گھوڑے اور مٹی کے کھلونے بنا کر شہر بیچنے آیا کرتی تھیں، اچھے چلن کی عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ ان کی ذہنیت مجرمانہ تھی۔ عصمت فروشی تک کرتی تھیں۔ اس عورت کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اغوا کے جرم میں شامل ہے غلط نہیں ہو سکتا تھا۔

اتنے میں باہر سے وہ آدمی یہ اطلاع لایا کہ کل یہ عورت گھوڑے بیچنے آئی تھی اور اسے گلی کے سرے پر کھڑے دیکھا گیا تھا۔ اب ایک آدمی ایسا بھی مِل گیا جس نے بتایا کہ سر پر چادر لیے ہُوئے ایک آدمی گلی کے سرے پر کھڑا دیکھا گیا تھا۔ یہ خبر دینے والے کو بھی مَیں نے بلا لیا۔ اللہ میری مدد کر رہا تھا۔ یہ آدمی اتفاقیہ سامنے آگیا تھا مگر بچے کو اس آدمی کے ساتھ باتیں کرتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال میرے لیے اہم مسئلہ یہ تھا کہ گھوڑے بیچنے والی عورت آئی تھی اور وہ اس بچے کے گھر نہیں آئی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہاں ایک بچہ اس کا مستقل گاہک ہے۔

میں تھانے چلا گیا۔ مشتبہ افراد تھانے میں موجود تھے۔ ان سے گھوڑے بیچنے والی

عورت کے متعلق پوچھا کہ ان میں سے اسے کوئی جانتا ہے یا نہیں۔ تین چار نے بتایا کہ وہ اسے صرف جانتے ہی نہیں بلکہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ انہوں نے اس کا نام بھی بتایا جو آج مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔ عجیب سا نام تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پچیس چھبیس سال عمر کی ہے۔ خوبصورت ہے لیکن اتنی خوبصورت نہیں جتنی چالاک اور مکار ہے۔

میرے لیے یہی کافی تھا کہ میرے تھانے کے جرائم پیشہ آدمی اُسے جانتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ گھوڑے بیچنا تو بہانہ ہے، وہ معلوم نہیں کیسے کیسے گل کھلاتی ہے۔ وہ صرف میرے ہی قصبے میں نہیں آتی تھی، دوسرے قصبوں اور شہروں تک بھی پہنچتی تھی۔ یہ ایک قبیلہ تھا جس کا پیشہ بظاہر کچھ اور، در پردہ کچھ اور تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اس عورت کو پکڑ کر شاملِ تفتیش کیا جائے۔ کاغذوں کے گھوڑے اسی سے خریدے گئے ہوں گے اور اسی سے پتہ چل سکتا ہے کہ اس سے دو گھوڑے کس نے خریدے تھے اور اگر بودا نے خریدے تھے تو کیا وہ اسے جانتی پہچانتی تھی؟

مجھے اس کا ٹھکانہ بتایا گیا وہ قصبے سے ایک میل سے کچھ زیادہ دُور تھا۔ وہ گھاس اور سرکنڈوں کی بنی ہوئی سات آٹھ جھگیوں کی ایک بستی تھی جس میں اسی عورت کا قبیلہ رہتا تھا۔ میں نے دو کانسٹیبل اس عورت کو ساتھ لانے کے لیے بھیج دیئے۔ یہ کانسٹیبل روانہ ہوئے تو میرا وہ مخبر واپس آگیا جسے میں نے بودا کے گاؤں بھیجا تھا۔ وہ صرف یہ خبر لایا کہ بودا گاؤں میں ہے لیکن بچے کے متعلق کسی کو خبر نہیں تھی۔

میں ہندوستان کے جس علاقے کی واردات سُنا رہا ہُوں وہ کچھ چٹانی سا، کچھ جنگلاتی سا اور کچھ میدانی بھی تھا۔ وہاں رہزنی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس لیے بعض جگہوں پر پولیس چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ ایسی پانچ چوکیاں میرے تھانے کے ماتحت تھیں۔ میں نے

اس چوکی کے اے۔ ایس۔ آئی کو جس میں بودا کا گاؤں آتا تھا یہ اطلاع بھجوائی کہ بودا کو پتہ لگے بغیر اُسے نظر میں رکھو اور تمام رات اس کے گھر کے ارد گرد مُخبر موجُود رہے۔ میں نے مختصراً یہ کیس بھی اسے بتا دیا۔ میرا ایک کانسٹیبل اُسی وقت روانہ ہو گیا۔ وہاں شمس الحق نام کا ایک اے۔ ایس۔ آئی تھا جو ذہین اور پھرتیلا تھا۔ بودا ہمارے ریکارڈ میں تھا۔ شمس الحق اسے اچھی طرح جانتا تھا۔

عورت شوخ، خاوند مرجھایا ہُوا

گھوڑے بیچنے والی آگئی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ گھر مِل گئی ورنہ ان جنگلیوں کی عورتیں دن بھر غائب رہتیں اور رات کو گھر ملتی تھیں میں نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ شیطان عورت ہے۔ گھگھرا پہنے ہُوئے تھی۔ جسم نہایت اچھا اور چہرے میں کشش تھی۔ اس کی آنکھیں ہر طرف چوکس ہو کر پھرتی تھیں۔ مجھے توقع تھی کہ مجھ سے اور تھانے سے ڈر جائے گی، مگر اندر آتے ہی اُس نے افسروں کی طرح پوچھا۔۔۔ "مجھے کیوں بلایا ہے داروغہ جی!"

اس کے ساتھ دو مرد تھے۔ ایک ادھیڑ عمر اور ایک اس عورت سے کچھ بڑا لگتا تھا۔ ادھیڑ عمر تو اس کا ماموں یا چچا تھا، دوسرا اس کا خاوند تھا۔ خاوند اس عورت کے بالکل اُلٹ تھا۔ چہرہ مُرجھایا ہُوا، لاغر سا جسم اور وہ مریض لگتا تھا۔ دونوں مرد ڈرے ہُوئے تھے۔ میرے کمرے کے دروازے میں کھڑے رہے۔ مجھ سے اس عورت نے (جو دراصل عورت نہیں جوان لڑکی تھی) نڈر سا ہو کے پوچھا کہ میں نے اسے کیوں بلایا ہے۔

"کل تُم یہاں کاغذوں کے گھوڑے بیچنے آئی تھیں؟"۔۔۔ میں نے اس سے پُوچھا۔

"ہاں!"۔۔۔ اس نے تن کر جواب دیا۔۔۔ "آئی تھی۔"

"کتنے گھوڑے بیچے تھے؟"

"یاد نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "سوچ کر بتاتی ہوں۔"

"رہنے دو"۔ میں نے کہا۔ "بودے نے تم سے کتنے گھوڑے خریدے تھے؟"

"بودا کون؟"

اُس نے ایسے پُر رعب لہجے میں اور ایسی خود اعتمادی سے جواب دیا کہ میں چکرا گیا اور میں سمجھا کہ وہ واقعی بودے کو نہیں جانتی، مگر میں سنبھل گیا۔ مجھے اتنی جلدی تسلیم نہیں کرنا چاہیے تھا کہ وہ اغوا میں ملوث نہیں۔ میں نے اسے بٹھا لیا اور اپنے مخصوص انداز سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ یہ سوالوں کا ایک طویل اور پیچیدہ سلسلہ تھا لیکن اس کمبخت عورت نے مجھے پریشان کر دیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ نہ آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں جنگلی لڑکی تھی۔ وہ بے شک میرے ہاتھ نہیں آ رہی تھی لیکن وہ مجھ سے یہ نہ چھپا سکی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے اور بودا کے ساتھ اگر اس کا اور کوئی تعلق نہیں تو کل اس نے بودے کو دو گھوڑے ضرور دیئے تھے۔

گمشدہ بچے کا باپ تھانے میں ہی تھا۔ میں نے اُسے بلایا اور پُوچھا کہ کیا اس کے گھر یہی عورت گھوڑے لے کے آیا کرتی تھی؟ اُس نے اس عورت کو پہچان لیا۔ میں نے اس سے پُوچھا کہ وہ جب بھی یہاں آتی، ان کے گھر ضرور جایا کرتی تھی، کل کیوں نہیں گئی؟

"میری مرضی"۔ اُس نے جواب دیا۔

"تم ان کی گلی تک تو گئی تھیں"۔ میں نے کہا۔ "چند قدم آگے کیوں نہ گئیں؟ وہاں تمہارا گاہک تھا۔"

"میں ان کی گلی تک بھی نہیں گئی۔"

میں نے وہ آدمی بھی ساتھ رکھا تھا جس نے اس عورت کو گلی کے سرے پر دیکھا تھا۔

اُسے اندر بلایا تو اُس نے عورت کو پہچان لیا اور کہا کہ یہ اس گلی کے سرے پر کھڑی تھی اور اس کے پاس ایک آدمی سر پر چادر لیے کھڑا تھا۔

"وہ آدمی کون تھا؟" میں نے گھوڑے بیچنے والی سے پوچھا۔

"میں کیا جانوں؟"۔ اس نے جواب دیا۔ "کھلونے بیچنے آتی ہوں۔ سو آدمی میرے پاس رُک کر دیکھتے ہیں۔"

میں نے آگے کو جُھک کر اسے کہا۔ "تم نے اتنے زیادہ جُھوٹ بولے ہیں کہ تم اپنے آپ میرے جال میں آگئی ہو۔ اب بھی وقت ہے۔ اگر بچہ واپس کر دو تو وعدہ کرتا ہوں کہ صاف چھوڑ دوں گا۔ اگر اسی طرح مکاری کرتی رہو گی تو بچہ بھی برآمد کر لوں گا اور تمہیں ساری عمر جیل سے نہیں نکلنے دُوں گا۔"

"میرے پاس کوئی بچہ نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "اگر تم کہتے ہو کہ ہے تو چلو میرے گھر سے برآمد کر لو۔"

مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ جو دو آدمی آئے ہیں ان میں ایک اس کا خاوند ہے۔ میں نے خاوند کو اندر بلایا اور اس چڑیل کو برآمدے میں بھیج دیا۔

"تمہاری بیوی نے ایک بچہ اغوا کرایا ہے"۔ میں نے خاوند سے کہا۔ "تم بھی اس جرم میں شامل ہو گے۔ میں اب تمہیں واپس نہیں جانے دوں گا۔"

اُس نے میرے پاؤں میں بیٹھ کر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے، پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں کسی بھی جُرم میں شامل نہیں۔ میرے گھر میں اغوا کیا ہُوا کوئی بچہ نہیں ہے۔ میں اپنی بیوی کے لیے قسم نہیں کھا سکتا۔ یہ بڑی ظالم عورت ہے۔"

"کیا تم اس کے خاوند نہیں ہو؟"

"نام کا خاوند ہوں" — اُس نے جواب دیا — "ہمارے قبیلے کا رواج ہے کہ شادی پنڈت کراتا ہے۔ رشتے وہی جوڑتا ہے۔ حساب ایسا بیٹھتا تھا کہ میری شادی اسی کے ساتھ ہونی تھی سو ہو گئی مگر یہ عورت ایسی [illegible] ہے کہ مجھے نوکر سمجھتی ہے۔"

"تم بدردین عورت بودے کو جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں سرکار!" — اُس نے جواب دیا — "اِس ملیچھ کو نہ بتانا ورنہ مجھے جان سے مار ڈالے گی۔ اُس کا خاوند بودا ہے، مَیں نہیں ہوں۔ ہم دونوں تو یوں کہو کہ ایک جھونپڑے میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی بودا ہمارے گھر آتا ہے تو بیوی مجھے کسی کام سے شہر بھیج دیتی ہے۔ ہمارے باقی لوگ بودے سے ڈرتے ہیں۔ بودا سب کی ٹہل سیوا بھی کرتا ہے۔"

"کل صبح بودا تمہارے گھر آیا تھا؟"

"رات ساری ہمارے گھر ٹھہرا تھا" — اُس نے جواب دیا — "صبح سویرے پہلے بودا نکلا اور شہر کی طرف چلا گیا، پھر میری بیوی بانس کے ساتھ گھوڑے لٹکا کر شہر چلی گئی۔"

"بودا واپس آیا تھا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی — "اس ڈائن کو نہ بتانا سرکار کہ مَیں نے یہ ساری باتیں آپ کو بتائی ہیں ورنہ یہ مجھے جینے نہیں دے گی اور یہ مجھے بودے سے مروا دے گی۔ مَیں تو کہتا ہوں سرکار! اسے قید کر لو اور اسے ساری عمر نہ چھوڑو۔ ملیچھ مر جائے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

اپنے خاوند کو لاٹھیاں ماریں

یہ مریل سا جنگلی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ مَیں اُس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا

تھا۔ مَیں نے اس سے کچھ اور کام کی باتیں پوچھ کر باہر برآمدے میں بیٹھنے کو کہا اور اس کی بیوی کو اندر بلایا۔ مَیں اپنی کامیابی پر اتنا زیادہ خوش تھا کہ مَیں جلد بازی کر گیا۔ مَیں نے اسے کہہ دیا — "اب جھوٹ نہ بولنا۔ بودا کو ساری رات اپنے گھر رکھ کر تم کس کس سے چھپاؤ گی۔"

وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یہ غصّے کا رنگ تھا۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل لاٹھی اٹھائے میرے دروازے میں داخل ہُوا۔ مجھے یاد نہیں وہ میرے پاس کیوں آیا تھا اور اُس نے لاٹھی کیوں اٹھا رکھی تھی۔ مَیں نے اُس کی طرف دیکھا تو گھوڑے بیچنے والی نے بھی اُس کی طرف دیکھا۔ کانسٹیبل اس کے قریب آ چکا تھا۔ پھر ایسے ہُوا جیسے بجلی چمکی ہو۔ اس جوان عورت نے حیران کر دینے والی پھرتی سے کانسٹیبل کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ کانسٹیبل نے لاٹھی ڈھیلی سی گرفت میں لے رکھی تھی۔ برآمدے میں سے مجھے لاٹھی کی ضربوں کی اور کسی کی آہ و بکا کی آوازیں سنائی دیں۔

کانسٹیبل کے پیچھے پیچھے مَیں باہر کو دوڑا۔ وہ عورت لاٹھی سے اپنے خاوند کو اوندھا کر چکی تھی اور پھنکارتے ہوئے کہہ رہی تھی — "اُٹھ، دے بیان داروغہ کو۔"

لڑکی کو کانسٹیبلوں نے پکڑ لیا تھا اور اُس سے لاٹھی لے لی تھی۔ اس کا خاوند برآمدے میں اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ عورت کو مَیں نے حوالات میں بند کرا دیا۔ اس کے خاوند کے زخم دیکھے۔ سر پر دو ضربیں تھیں جو اتنی زور سے لگی تھیں کہ خون بہہ رہا تھا اور دو ضربیں پیٹھ پر تھیں۔ یہ پولیس کی لاٹھی کی ضربیں تھیں۔ اس لاٹھی کے نیچے والے سرے پر تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا لوہے کا خول چڑھا ہُوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس عورت کے جسم میں جوانی کی طاقت اور اس طاقت میں قہر پیدا کرنے کے لیے دِل میں خاوند کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ تھا۔ خاوند کے جسم میں اتنی جان ہی نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں

نے اُسے چارپائی پر ڈلوا کر ہسپتال بھیج دیا اور اس کی بیوی کے خلاف کیس رجسٹر کر لیا۔

اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ شام ہو چلی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلی کارروائی آج ہی رات کروں گا۔ میں نے اُسی وقت ایک گھوڑا منگوا کر شمس الحق کی پولیس چوکی کو ایک کانسٹیبل سوار کرا کے اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیا کہ بودے کے گھر کو خفیہ گھیرے میں لے لو۔ میں چھاپہ مارنے آ رہا ہوں۔ مجھے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ بچہ بودے کے گھر میں ہوگا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ بچے کو کس مقصد کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔

میں نے بچے کے باپ سے کہا کہ وہ گھر جا کر کھانا کھا لے اور ساڑھے تین میل پیدل جانے اور آنے کے لیے تیار ہو کر آ جائے۔ اُسے یہ بھی کہا کہ اُسے کوئی ٹٹو یا گھوڑا اپنی سواری کے لیے مل جائے تو لے آئے اور ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہ لگائے۔ اُسے ایک دو آدمی اپنے ساتھ لانے کی بھی اجازت دے دی۔ چھاپہ مارنے کے لیے آٹھ کانسٹیبل تیار کیے اور انہیں کہا کہ وہ کھانا کھا کر رائفلوں سے مسلح ہو جائیں۔ میں بھی کھانا کھانے چلا گیا۔ اپنے لیے اور اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے لیے میں نے دو گھوڑوں کا انتظام کر لیا۔

کھانا وغیرہ کھا کر میں واپس آیا تو ہر کوئی تیار تھا۔ بچے کا باپ بچے کے دو ماموؤں کو ساتھ لے آیا تھا لیکن ان کی سواری کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ سورج ڈوبے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ مجھے اندھیرے کی ہی ضرورت تھی۔ کانسٹیبلوں کو پیدل جانا تھا۔ میں نے بچے کے باپ اور اُس کے ساتھیوں کو کانسٹیبلوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ بچے کی برآمدگی کی صورت میں مجھے شناخت کے لیے اُس کے باپ کی ضرورت تھی۔ کانسٹیبلوں کو میں نے ضروری ہدایات دے دیں اور بتا دیا تھا کہ میں انہیں کہاں ملوں گا۔ ہمارے سامنے ساڑھے تین میل کا سفر تھا۔ بودے کے گاؤں کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ میرا گھوڑ سوار قاصد اے۔ ایس۔ آئی شمس الحق کو پیغام دینے

کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے روانہ ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کا پہنچ چکا ہوگا۔ میں نے اسے گھوڑا دوڑا کر لے جانے کو کہا تھا۔ ہم بھی روانہ ہو گئے۔ کانسٹیبل پیدل تھے اس لیے مجھے گھوڑے کی رفتار ان کے مطابق رکھنی تھی۔ مجھے سب سے پہلے چوکی جانا تھا۔

میں اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ چوکی پہنچا۔ مجھے اطلاع ملی کہ میرے کانسٹیبلوں کی پارٹی مقررہ جگہ پہنچ گئی ہے۔ بودے کا گاؤں چوکی سے ایک میل سے ذرا کم تھا۔ شمس الحق مجھ سے بغل گیر ہو کے ملا اور بڑی مسرت سے یہ خوشخبری سنائی — "آپ کا ملزم حاضر ہے۔"

"اور بچہ؟" — میں نے پوچھا۔

"بچے کا تو مجھے کچھ پتہ نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے بودے کے گھر تلاشی نہیں لی۔ آپ نے پیغام بھیجا تھا کہ اسے گھیر لو۔ میں نے اس کے گاؤں کانسٹیبل بھیج کر اسے بلا لیا اور یہاں پابند کر لیا۔"

میں نے گھوڑ سوار کانسٹیبل سے پوچھا کہ اس نے کیا پیغام دیا تھا۔ اس نے بتایا تو میں سٹپٹایا۔ اس نے میرا پیغام غلط دیا تھا۔ میں نے پیغام میں یہ بھی کہا تھا کہ میں چھاپہ مارنے آ رہا ہوں اور پہلے چوکی میں آؤں گا۔ کانسٹیبل نے چھاپے کا نام تک نہ لیا اور کہا کہ میں چوکی تک آ رہا ہوں۔ شمس الحق نے اپنی عقل استعمال کر کے بودے کو گھر سے بلا کر تھانے بٹھا لیا۔ مجھے نقصان یہ نظر آ رہا تھا اگر بچہ بودے کے قبضے میں ہے تو اس کی غیر حاضری میں اس کا کوئی ساتھی بچے کو غائب کر دے گا۔

بودے کو تھانے میں آئے نصف گھنٹہ گزرا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بلوایا۔ وہ تیس سال سے کچھ زیادہ عمر کا خوبرو جوان تھا۔ میں نے اسے دوستانہ لہجے میں کہا — "بودے! اپنا کسب جاری رکھنا چاہتے ہو تو بچہ میرے حوالے کر دو۔"

اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ جس کے جھونپڑے میں اس نے رات گزاری ہے وہ میری حوالات میں بند ہے۔ میں نے اس عورت کا نام اسے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اس کا خاوند میرے مطلب کے بیان دے چکا ہے۔ میں نے یہ جھوٹ بھی بولا کہ اس عورت نے سب کچھ اُگل دیا ہے، اور جس محلے سے بچہ اغوا کیا گیا ہے اس کے تین آدمیوں نے اسے سر پہ چادر ڈالے بچے کے ساتھ جاتے دیکھا ہے مگر بودا گھاگ تھا۔ اس نے اعتراف نہ کیا۔ اس نے جب کہا کہ میں اس کے گھر کی تلاشی لے لوں تو میں سمجھ گیا کہ بچہ وہاں نہیں ہے۔

مجھے اپنے قاصد اور شمس الحق پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ اس بگڑی ہوئی صورتِ حال میں میں نے بودے کے گھر کی تلاشی کا فیصلہ کیا۔ اُسی وقت اسے ساتھ لیا اور راستے میں میری جو پارٹی انتظار کر رہی تھی اسے بھی ساتھ لیا اور بودے کے گھر پہنچا۔

بودے کی بیوی

اس کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہُوا تو وہاں دو عورتیں تھیں۔ دونوں اس کی بیویاں تھیں۔ مکان کچا تھا اور اس کے دو کمرے تھے۔ میں نے بڑی سختی سے تلاشی لی۔ بچے کا تو کہیں نام و نشان نہ تھا البتہ کاغذوں کے دو گھوڑے مِل گئے۔ سلیٹی رنگ کی چادر مِل گئی اور اس چادر کے ساتھ مصنوعی موچھیں ملیں۔ یہ بڑی بڑی تھیں۔ اُس زمانے میں لوگ بڑی بڑی مونچھوں کو مردانگی کی نشانی سمجھا کرتے تھے۔ بودے کی اپنی مونچھیں چھوٹی تھیں۔ اتنی سخت تلاشی سے مجھے بچے کا سراغ نہ مِلا تو میں نے بودے کو کاغذوں

کے گھوڑے دکھا کر کہا کہ شہر میں اسے دیکھنے والے گواہوں کی شہادت کو ان گھوڑوں نے پکا کر دیا ہے اور اصل ثبوت میری حوالات میں بند ہے۔

گاؤں کے مُکھیا کو میں نے بلا لیا تھا۔ میں اس سے بات کر رہا تھا کہ میری نظر اچانک بودے کی بیویوں پر پڑی۔ ایک بیوی بودے کی طرف دیکھ رہی تھی اور بودا اسے دیکھ رہا تھا۔ بیوی نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ یہ اشارہ میرے لیے بہت اہم شہادت تھا۔ میں بودے کو سب سے الگ لے گیا اور اسے کہا — "بچہ دیتے ہو یا نہیں۔ ہاں یا نہ میں جواب دو۔"

اُس نے ٹال مٹول اور باتوں کی استادی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے کانسٹیبلوں سے کہا۔ "اسے اور ان دونوں عورتوں کو گرفتار کر لو۔ تینوں کو چوکی لے چلو۔"

بچے کا باپ میرے ساتھ تھا۔ میں چوکی کو چل دیا۔ بودے کے مکان پر پہرے کا انتظام کر دیا۔ راستے میں میں نے بودے سے کوئی بات نہ کی۔ بچے کا باپ رو رہا تھا اور بار بار کہتا تھا — "ملک صاحب! اس سے پوچھو کتنے پیسے مانگتا ہے میں دے دوں گا، یہ بچہ واپس کر دے۔"

میں اسے بہلا رہا تھا۔

ہم چوکی پہنچے۔ میرا دل اس خیال سے بوجھل ہو گیا تھا کہ میں نے مجرم کو تو پکڑ لیا تھا مگر بچہ برآمد نہیں ہُوا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ بچہ قتل ہو چکا ہو گا۔ شمس الحق کے کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ تھا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے وقت بچے کا باپ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ اُس نے اچانک بڑی زور سے کہا — "میرا مُنّا!" — اور وہ آگے کو دوڑا۔

وہاں ایک آدمی بیٹھا تھا جس کی گود میں پانچ چھ سال عمر کا ایک بچہ تھا۔ باپ نے اس بچے کو اُٹھا کر گلے لگا لیا اور پاگلوں کی طرح اس کا منہ چومنے لگا۔ میں پریشان ہو گیا۔

یہ معاملہ فلمی کہانیوں والا معلوم ہوتا تھا۔ فلموں میں جو کچھ بھی ہوتا رہے، آخر میں شادی ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی بچہ گم ہے تو وہ اپنی بغل سے ہی مل جاتا ہے۔

بچہ رو رہا تھا اور اونگھ بھی رہا تھا۔ میرے ساتھ بودا اور اُس کی دونوں بیویاں تھیں جو کمرے میں لالٹین کی روشنی میں آگئی تھیں۔ مَیں نے بچے سے پیار کر کے پوچھا ـــ "مُنّے! تم کہاں تھے؟"

اس نے بودے کی ایک بیوی کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا ـــ "شام کو یہ مجھے اپنے گھر سے اُٹھا کر بہت دُور چھوڑ آئی تھی۔ مَیں ڈرتا رہا اور روتا رہا۔ پھر یہ آدمی (اجنبی) گھوڑے پر آیا اور مجھے اُٹھا کر یہاں لے آیا۔"

مَیں نے بودے اور اس کی بیویوں کو باہر بھیج دیا۔ تینوں اب حراست میں تھے۔ مَیں نے وہیں محفل جمالی۔ میرے کہنے پر شمس الحق نے بچے کے لیے دودھ منگوایا جو بچہ پی کر اپنے باپ کی گود میں سو گیا۔ مَیں نے اس اجنبی آدمی سے کہا کہ وہ پورا بیان دے کہ اسے بچہ کس طرح اور کہاں سے ملا ہے۔ اُس نے بتایا کہ شام گہری ہو جانے کے بعد وہ کسی گاؤں سے اپنے گاؤں کو گھوڑی پر جا رہا تھا۔ بودے کے گاؤں سے پانچ چھ فرلانگ دُور کھڈ نالوں کا ویران اور ڈراؤنا سا علاقہ ہے۔ یہ آدمی اس علاقے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اندھیرا گہرا تھا۔ اسے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ سوار ڈر گیا۔ وہ اسے کسی بدروح اور شرار کی آواز سمجھ رہا تھا۔ اُس نے کسی آیت کا وِرد شروع کر دیا اور وہاں سے جلدی نکل جانے کی سوچی۔ بچے نے روتے ہوئے کہا ـــ "امی جان ---- امی --- ابو۔ آؤ۔" اور ایسی ہی کچھ آوازیں تھیں جن سے گھوڑ سوار کو شک ہوا کہ یہ انسان کا بچہ ہے۔ وہ چونکہ خود بچوں والا تھا اس لیے اس کے دل میں رحم پیدا ہو گیا۔ بچے کی خوش نصیبی تھی کہ یہ شخص مسلمان تھا اس

لیے اس میں دلیری تھی۔ اگر ہندو ہوتا تو اس ویرانے میں بچے کے رونے کی آواز پر سرپٹ بھاگ اُٹھتا یا خوف کے مارے بے ہوش ہو جاتا۔ اس گھوڑ سوار نے ذرا رُک کر دیکھ لینا مناسب سمجھا۔

بچہ روتے روتے قریب آگیا۔ سوار نے پوچھا۔ کون ہے تُو؟ بچے نے ڈر کر چیخ ماری۔ سوار گھوڑے سے اُترا۔ اس کے پاس لمبا سا چاقو تھا جسے کھول کر وہ آگے گیا۔ بچہ اس کے قریب آگیا۔ اس آدمی نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اسے یہاں کون لایا ہے۔ بچے نے اُسے بتایا کہ پہلے ایک آدمی اسے شہر سے اپنے گھر ایک گاؤں میں لے آیا تھا۔ وہاں اسے چھپائے رکھا۔ اسے ڈراتا رہا۔ آج شام کے بعد اس کے گھر کی ایک عورت اسے یہاں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

یہ آدمی عقل اور دل گُردے والا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بچے کو گھوڑے پر بٹھایا اور پولیس چوکی لے آیا۔ پولیس چوکی تک وہ ڈرتا رہا کہ بچہ ابھی غائب ہو جائے گا یا کسی جانور کا روپ دھار لے گا۔ وہ خدا کے کلام کا وِرد کرتا رہا۔ چوکی میں آکر اسے پتہ چلا کہ اُس نے کتنی بڑی نیکی کی ہے اور خُدا نے اسے فرشتے کی طرح اس ویرانے میں بھیجا تھا۔ اگر وہ اُدھر سے نہ گزرتا تو بچہ خوف سے ہی مر جاتا یا بھیڑیوں کا شکار ہو جاتا جن کی وہاں کمی نہیں تھی۔

مَیں نے بودے کی اس بیوی کو بلایا جس کے متعلق بچے نے کہا کہ یہ اُسے اس ویرانے میں چھوڑ آئی تھی۔ اسے مَیں نے بڑے تحمل سے کہا کہ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ بچے کے اغوا کا ثبوت بودے کے خلاف شہر سے مل گیا ہے۔ اب بہتر یہ ہے کہ اپنی زبان سے بیان دے دو۔ وہ کسی غریب باپ کی خوبصورت بیٹی تھی جسے بودے نے دھونس اور تھوڑی سی رقم کے عوض حاصل کیا تھا۔ ابھی وہ جوانی کی عمر میں تھی۔ سیدھی سادی بھی نہیں تھی۔ اُس نے مجھے

جکڑ دینے کی کوشش کی۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ بچہ اُسے شناخت کر چکا ہے۔ مَیں نے اسے بڑی ہی گندی دھمکی دی اور یہ بھی کہا کہ مَیں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے وہیں پھینک آؤں گا جہاں وہ بچے کو چھوڑ آئی تھی۔ صبح تک بھیڑیئے اور گیدڑ اس کی ہڈیاں بھی کھا چکے ہوں گے۔ مَیں نے کہا ۔۔۔" مَیں تمہیں عدالت میں پیش نہیں کروں گا تاکہ تمہیں کوئی وکیل چھڑا نہ سکے۔ مَیں تمہیں یہی سزا دوں گا جو بتا رہا ہوں۔ مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں۔"

کاغذ کے گھوڑوں کے سوار

پولیس کا رعب کام کر گیا۔ وہ بولنے پر آمادہ ہو گئی۔ میرے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ مَیں نے ایک دن اور رات میں بچہ برآمد کر لیا تھا اور یہ ایسی واردات تھی جس کی تفتیش کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مَیں دراصل کاغذوں کے گھوڑے پر سوار تھا، کاغذوں کے گھوڑے ہی مجھے منزل پر لے گئے۔ اس عورت نے پہلے تو اپنی مظلومیت کی تفصیل سنائی جس سے یہ فائدہ ہُوا کہ مَیں نے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے اس کے دل پر قبضہ کر لیا۔ بار بار کی ہمدردی سے وہ پوری طرح آزادی اور بے تکلفی سے بولنے لگی۔ وہ واقعی مظلوم تھی۔ اُسے ایک جرائم پیشہ آدمی کے ہاتھ بیچا گیا تھا۔

بچے کے متعلق اُس نے بتایا کہ ایک روز پہلے بودا اس بچے کو اپنی گھوڑی پر لایا۔ بچے کے ہاتھ میں کاغذوں کے دو گھوڑے تھے۔ بچہ رو رہا تھا اور گھر جانے کی ضد کرتا تھا۔ بودے نے بچے کو بہلانے کی بہت کوشش کی مگر بچہ روتا رہا۔ بودے نے اسے چاقو دکھا کر اور طرح طرح کے طریقوں سے ڈرانا شروع کر دیا۔ اس سے بچہ اور زیادہ چیختا تھا۔ بودے نے اپنی بیویوں کو اتنا ہی بتایا کہ کسی کو اس بچے کا علم نہ ہو۔ یہ تو بیویوں کو معلوم تھا کہ بودے کی

زندگی ایک بھید ہے جسے چھپائے رکھنا بیویوں کا فرض ہے۔ رات کو بچہ سو گیا لیکن صبح سویرے جاگ کر پھر رونے لگا۔ ایک بیوی نے بودے سے کہا کہ اسے لائے ہو تو چلتا کرو۔ اس طرح یہ پکڑوا دے گا۔

بودا باہر نکلا لیکن واپس گھر چلا گیا۔ اُس نے بیویوں سے کہا کہ گاؤں میں مشکوک سا ایک آدمی موجود ہے۔ یہ دراصل میرا بھیجا ہُوا مخبر تھا۔ سارا گاؤں (جو اتنا بڑا نہیں تھا) بودے سے ڈرتا تھا۔ مخبر کو بچے کی کوئی خبر نہیں مل سکی تھی۔ اس کا یہ فائدہ ہُوا کہ بودا گھر سے نہ نکل سکا۔ بودا سارا دن گھر رہا اور بچے کو ڈراتا رہا۔ اس نے بیویوں سے پوچھا کہ گھر میں افیم ہے؟ بودا چرس اور شراب پیتا تھا۔ گھر میں افیم نہیں تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ گاؤں سے بھی افیم نہ ملی۔ اس لیے وہ بچے کو بے ہوش نہ کر سکا۔

مجھے بعد میں معلوم ہُوا کہ جس طرح میں بچے کے اغوا کی تفتیش میں ناتجربہ کار تھا اسی طرح بودا بچوں کے اغوا میں اناڑی تھا۔ اس نے اپنی مجرمانہ زندگی میں پہلا بچہ اغوا کیا تھا ورنہ وہ بچے کو بے ہوش کرنے اور بوری میں ڈال کر لے جانے کا انتظام پہلے سے کر لیتا۔ اس کی بیوی نے بیان میں کہا کہ شام سے کچھ دیر پہلے بودے نے بتایا کہ گاؤں کے اردگرد مشکوک آدمی نظر آتے ہیں۔ یہ شمس الحق کا انتظام تھا جس سے بودا گھر میں قید ہو گیا۔

شام کے بعد شمس الحق نے میرا پیغام غلط سُن کر یا غلط سمجھ کر بودے کو چوکی بلا لیا اور مخبروں کا گھیرا اُٹھوا دیا۔ بودا سمجھ گیا کہ معاملہ اُلٹ ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنی بیویوں سے کہا کہ اس کے جانے کے بعد بچے کو اُٹھا کر ویرانے میں لے جانا اور اس کی شہ رگ چاقو سے کاٹ دینا۔ صبح تک درندے لاش کھا لیں گے۔ ایک بیوی نے یہ بھیانک کام کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری بیوی جو مجھے بیان دے رہی تھی، مان گئی۔ اُس نے چاقو لیا اور بچے کو یہ

کر کر اٹھا لیا کہ اسے اس کے گھر لے جا رہی ہے۔ بچہ خاموشی سے اپنے انجام کی سمت چلا گیا، لیکن اُس ویرانے میں جا کر اس عورت کے دل میں وہ ماں جاگ اُٹھی جس کا دو سال کی عمر کا ایک بچہ مر گیا تھا۔ وہ اتنی خ[illegible]ورت بچے کی شہ رگ کاٹنے سے گھبرا گئی۔ اُس نے بچے کو ویرانے کے اندر ایک کھنڈر میں چھوڑا اور وہاں سے بھاگ آئی۔ گھر آئی تو تھوڑی دیر بعد میں وہاں پہنچ گیا اور ان کے راستے بند ہو گئے۔

بودے کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اُس نے اپنی استادی دکھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ان حا[illegible]ت میں اور میرے طریقۂ تفتیش کے سامنے اس کی استادی جلد ہی ختم ہو گئی۔ اُس نے طویل بیان دیا جس میں آپ کے مطلب کی کہانی یہ ہے کہ بچوں کا اغوا اس کے پیشے میں شامل نہیں تھا۔ کچھ عرصے سے اس کا ایک دوست جو دُور کے ایک علاقے میں بردہ فروشی اور رہزنی کرتا تھا یہ کہ رہا تھا کہ کسی مہاراجے کو گورے چٹے کمسن لڑکوں کی ضرورت ہے جنہیں وہ ایک خاص ناچ کے لیے تیار کرنا چاہتا ہے۔ اگر بودا ایک دو بچے اغوا کر لائے تو اسے دو ہزار روپیہ فی بچہ ملے گا۔ اُس زمانے کا دو ہزار روپیہ آج کے بیس ہزار کے برابر تھا۔ بودا اس کام کے لیے تیار ہو گیا۔ دوست نے اُسے کہا تھا کہ وہ جب کبھی بچہ اغوا کرے اسے اطلاع دے دے۔

بودے کا بیان سنانے سے پہلے میں یہ بتانا موزوں سمجھتا ہوں کہ کسی مہاراجے کو کمسن لڑکوں کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے ہندوستان کی بے شمار ریاستوں کے مہاراجے اور نواب سُنے ہوں گے۔ یہ انگریزوں کے غلام تھے اور اپنی ریاستوں کے بے حس اور ظالم بادشاہ۔ اُن کی رعایا کی فاقہ مستی اور غربت کی روئیداد بڑی دردناک ہے اور مہاراجوں کی عیاشیوں کی تفصیل حیران کُن۔ ان میں بعض بڑے بڑے مہاراجے جن میں مہاراجہ پٹیالہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، ناچ گانے

کے شوقین تو تھے ہی جیسے سب تھے لیکن وہ اپنے اعلیٰ قسم کے مہمانوں کے لیے جو رقص پیش کرتے تھے وہ غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکے ناچا کرتے تھے۔ اسے BELLY DANCE کہتے تھے۔ لڑکے نیم برہنہ ہوتے تھے۔ اس خصوصی رقص میں رنگا رنگ روشنی کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ عام دعوتوں میں یہ رقص نہیں دکھایا جاتا تھا۔ یہ غالباً الف لیلہ کی خیالی داستانوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ مراکش اور مصر میں اب بھی "بیلی ڈانس" ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بعض مہاراجوں نے اسے اپنے ہاں رائج کیا اور غیر ملکی مہمانوں کا دل بہلاتے رہے۔ یہ ناچ ناچنے والے لڑکوں کو حرم کی عورتوں کی طرح پردے میں رکھا جاتا تھا۔ داڑھی مونچھ نکلنے تک یہ لڑکے مہاراجوں کے قیدی رہتے تھے۔ اِن کے لیے خوبصورت بچے حاصل کر کے (خرید کر یا اغوا کر کے) تیار کیے جاتے تھے۔

خاوند بُزدل تھا، خاموش رہا

بودے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کون سے مہاراجے کو بچوں کی ضرورت ہے۔ اسے صرف ضرورت اور اس کی قیمت بتائی گئی تھی۔ اس کا دوستانہ کاغذوں کے گھوڑے بیچنے والی جانگلی لڑکی کے ساتھ تھا۔ اُس نے اس لڑکی کے خاوند اور اس کے چند ایک کُنبوں کے قبیلے کو اپنے رعب، خوف اور کرم نوازیوں تلے دبا رکھا تھا۔ خاوند اتنا بزدل تھا کہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی خاموش تھا۔ یہ قبیلے کے رسم و رواج کی پابندیوں کا نتیجہ تھا کہ اسے اسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنی اور اسی کے ساتھ عُمر گزارنی تھی۔ یہ لڑکی پاگل پن کی حد تک دلیر تھی۔ میں آپ کو اس کی دلیری کی جھلک دکھا چکا ہوں۔ بودے کو معلوم تھا کہ یہ لڑکی شہروں میں جا کر کاغذوں کے گھوڑے بیچتی ہے۔ گھوڑے اس کے قبیلے کی عورتیں بناتی تھیں۔

بودے نے اپنے بیان میں کہا کہ اس لڑکی کا تعلق شہر کے بچوں کے ساتھ تھا۔ اس لیے اس نے اس لڑکی سے کہا کہ اسے ایک بڑے ہی خوبصورت بچے کی ضرورت ہے جسے وہ اغوا کر کے بیچے گا اور اسے دو ہزار روپے ملیں گے۔ اس نے لڑکی کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اسے پانچ سو روپے دے گا۔ لڑکی اور روپوں کے ساتھ تو دلچسپی تھی ہی اس کی اصل دلچسپی بودے کے ساتھ تھی۔ بودے نے اسے بتایا کہ بچے کی عمر پانچ سال سے اوپر ہونی چاہئیے۔

کچھ روز بعد گھوڑے بیچنے والی نے اسے اس بچے کے متعلق بتایا جسے اغوا کیا گیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ بچہ کاغذوں کے گھوڑوں کا شوقین ہے۔ واردات سے پہلی رات بودا لڑکی کے جھونپڑے میں رہا۔ انہوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ لڑکی گلی میں گھوڑے بیچنے کی صدا لگانے گی۔ بچہ باہر آجائے گا۔ لڑکی اُسے مفت گھوڑے کا لالچ دے کر پرے لے جائے گی۔ موقع دیکھ کر بودا اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

بودے نے صبح قصبے میں جا کر اپنی گھوڑی کھیتوں میں باندھ دی اور اپنا منہ سر چادر میں ڈھک کر اس گلی کے سرے پر گیا جس میں بچے کا گھر تھا۔ لڑکی گھوڑے اٹھائے آچکی تھی۔ اتفاق سے بچہ کھیلنے کے لیے باہر آگیا۔ لڑکی ذرا ایک طرف ہو گئی۔ بچہ آیا تو بودے نے دو گھوڑے جو اُس نے چادر میں چھپا رکھے تھے بچے کو دکھائے اور گھوڑے بیچنے والی کو اشارہ کیا کہ وہ چلی جائے۔ وہ چلی گئی تو بودے نے بچے سے کہا کہ آؤ تمہیں گھوڑے دوں۔ بچہ اُس کے ساتھ چل پڑا۔ دوسری گلی میں جا کر اُس نے ایک گھوڑا بچے کو دے دیا اور کہا کہ آؤ دوسرا آگے چل کر دوں گا۔ وہ بچے کے ساتھ پیار بھی کرتا رہا۔

راستے میں بچے نے کہا کہ مَیں گھر جاؤں گا۔ بودے نے اُسے کہا کہ اس راستے

سے چلتے ہیں، دوسرا گھوڑا ابھی گھر لے جانا۔ بچہ اُس کے ساتھ چلا گیا۔ بودا اُسے اپنی گھوڑی تک لے گیا اور پیار پیار میں اسے گھوڑی پر بٹھا کر چلتا بنا۔ اس سے آگے اس نے وہی کچھ سنایا جو اس کی بیوی سُنا چکی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ مخبروں کی نظر میں آگیا ہے۔ وہ مخبروں کو پہچانتا تھا۔ اسے توقع تھی کہ مخبروں کے جال سے نکل جائے گا لیکن اسے موقع نہ ملا اور مَیں پہنچ گیا۔ مَیں رات کو ہی اسے اور اس کی بیویوں کو اپنے تھانے میں لے گیا۔ اس کے بعد مقدمہ قائم کرنے کا مرحلہ تھا۔ میں نے بودے اور اس کی اس بیوی کے بیان جو بچے کو ویرانے میں چھوڑ آئی تھی، مجسٹریٹ کے پاس ریکارڈ کروا کر دونوں کو جیل کی حوالات میں بھجوا دیا۔ گھوڑے بیچنے والی کے دو جُرم تھے۔ ایک اغوا میں اعانت اور دوسرے اپنے خاوند پر قاتلانہ حملہ۔ اس کا مَیں نے اپنی حوالات میں رکھنے کا ریمانڈ لے لیا۔ وہ اتنی ڈھیٹ نکلی کہ اس نے اقبالی بیان نہیں لکھوایا۔ اُس کا خاوند بچ گیا تھا۔

مقدمہ مجسٹریٹ سے ہو کر سیشن کورٹ میں چلا گیا جہاں بودا اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو گیا۔ اس کی بیوی یہ جرأت نہ کر سکی۔ اُس کی دوسری بیوی کو بری کر دیا گیا۔ اُس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ ایک بیوی کو سات سال سزائے قید دی گئی۔ بودے کو بھی سات سال اور کاغذوں کے گھوڑے بیچنے والی کو تین سال اور پانچ سال کی سزائے قید دی گئی۔

ماں کی خاطر

اس عورت نے میرے لیے بہت
جھوٹ بولے تھے۔ مخبری اور
سراغرسانی کے لیے بہت ایکٹنگ
کی تھی۔ اپنے اندھے خاوند کی
بہت خدمت کی تھی، مگر اب
وہ مجرم تھی۔ مَیں اس کے لیے
جھوٹ بولنے پر تیار ہوگیا۔

یہ قتل اور اغوا جیسے سنگین جُرم کی کہانی ہے جو سُنانے سے پہلے مَیں آپ سے گزارش کروں گا کہ اسے جُرم اور سراغرسانی کی ایک دلچسپ کہانی سمجھ کر نہ پڑھیں۔ کہانیاں تفریحِ طبع کے لیے پڑھی جاتی اور پھر ذہن سے اتار دی جاتی ہیں۔ میرا مقصد تفریح مہیا کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ آپ نے شاید محسوس کیا ہو گا کہ مَیں آپ کو اپنی تفتیش کے وہی کیس سُناتا ہوں جو آپ کے مستقل عنوان "چار دیواری کی دُنیا" کے تحت آتے ہیں۔ مَیں آپ سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ گھر، محلّے اور برادری میں دیکھیں کہ ایسے کردار اور ایسا ہی کوئی ڈرامہ وہاں بھی نہ ہو، اور جسے روکا نہ گیا تو بہت بڑا حادثہ ہو گا۔ مگر مَیں دیکھ رہا ہوں (اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں) کہ ان خرابیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا جس کے نتیجے میں حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں اخباروں والے اخباروں میں شائع کرتے اور لوگ انہیں دلچسپ خبریں سمجھ کر پڑھتے اور لُطف اُٹھاتے ہیں اور جب اگلی "دلچسپ" خبر آتی ہے تو پچھلی کو بھول جاتے ہیں۔

یہ لکھتے لکھتے مُجھے یاد آیا ہے کہ تین ساڑھے تین سال گزرے پاکستان کے ایک گاؤں نما قصبے میں ایک جوان بیوی ریوالور کی گولی سے ماری گئی۔ خاوند نے بیان دیا کہ یہ ریوالور ایک

دیوار کی کھدائی سے نکلا تھا۔ بیوی نے اُٹھا لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ نالی بیوی کے سینے کی طرف تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ ریوالور میں گولی ہے۔ گولی نکلی اور بیوی کے سینے سے پار ہو گئی۔ بیوی کو جلدی دفن کر دینے کی کوشش کی گئی لیکن بیوی کا باپ جو پولیس کا ریٹائرڈ سب انسپکٹر تھا، تھانے چلا گیا اور معاملہ پولیس کے آگے رکھ دیا۔ چونکہ وہ خود جُرم اور تفتیش کے چکر میں بوڑھا ہُوا تھا اس لیے اُس نے پولیس کی مدد کی اور انکشاف ہُوا کہ اس کی بیٹی کے گھر میں کوئی کھدائی نہیں ہُوئی تھی۔ دیوار کا ایک حصّہ بارش اور آندھی سے گرا تھا۔ ریوالور زمین سے یا ملبے سے برآمد نہیں ہُوا تھا بلکہ یہ بلا لائسنس خاوند کے پاس تھا۔ اس سے اس نے بیوی کو قتل کیا اور ایک جھوٹی کہانی گھڑ لی۔ اس قتل کے پس منظر میں برادری کے معمولی اور چھوٹے چھوٹے تنازعے تھے جو بڑی آسانی سے طے ہو سکتے تھے لیکن برادری میں ایک دو حضرات ایسے تھے (جو ہر برادری میں ہوتے ہیں) جو شر پسند تھے۔

یہ حادثہ تو ضمناً یاد آ گیا ہے۔ مَیں آپ کو ایک پُرانی واردات سُناتا ہوں۔ اس میں ایک آدمی نے پچاس سال کی عمر میں بائیس سال کی کنواری لڑکی کے ساتھ شادی اس مقصد کے لیے کی کہ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھی ایک گاؤں نما قصبے کی واردات ہے۔ مَیں یہاں کے تھانے کا انچارج تھا۔ مضافاتی دیہات بھی میرے تھانے میں آتے تھے۔ ایک صبح رپورٹ آئی کہ قصبے کے ایک گھر میں ایک آدمی رات کو مر گیا ہے۔ اس کی عمر پچاس سال بتائی گئی۔ رپورٹ دینے والوں نے دو طرح کی اطلاع دی۔ ایک یہ کہ اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی ہے۔ دوسری یہ کہ معاملہ مشکوک ہے۔

"مشکوک" ایسا لفظ ہے جسے کسی بھی تھانیدار کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ مَیں اسی لفظ پر اُن کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں اُن سے معلومات لیتا رہا۔ مرنے والا گھر میں اکیلا تھا۔

صحن میں سویا ہُوا تھا۔ آدھی رات سے ذرا پہلے بیوی گھر آئی تو اُس نے دیکھا کہ وہ مرا ہُوا ہے۔ بیوی نے واویلا بپا کیا تو محلے والے آ گئے۔ ایک آواز آئی کہ سوتے میں ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد مرنے والے کے رشتہ دار آ گئے۔ ان میں اُس کا ایک بھائی تھا۔ اُس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اُس نے سب کو للکار کر کہا کہ لاش جہاں ہے وہیں پڑی رہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔

اگر یہ لوگ اُس وقت تھانے دوڑتے تو مَیں آ کر دیکھ لیتا کہ لاش کس حالت میں پڑی تھی۔ لاش کی پوزیشن سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ مرنے والا سکون سے سوتے میں مر گیا ہے یا مرنے سے پہلے تڑپتا رہا ہے یا اُسے مار کر قتل کر کے لاش چارپائی پر پھینکی گئی ہے۔ اب مجھے اندھیرے میں سُوئی تلاش کرنی تھی۔ مَیں نے جب رپورٹ دینے والوں میں اختلاف دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ مَیں نے سب سے پہلے تو ذہن میں یہ بٹھا لیا کہ کون کیا کہتا ہے۔ سب اکٹھے ہی بول رہے تھے۔ مَیں نے انہیں روکا نہیں۔ کسی سے کوئی سوال نہ پوچھا تاکہ کوئی چوکس اور چوکنا نہ ہو جائے۔ انہیں بولنے کا موقع دیا اور مَیں ہر ایک چہرہ اور الفاظ ذہن میں بٹھاتا رہا۔ رات کو تھانے رپورٹ نہ کرنے کی وجہ یہی تھی کہ یہ لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے تھے۔

وہ تڑپ تڑپ کر مرا

مَیں نے لاش دیکھی۔ چارپائی پر برآمدے میں پڑی تھی۔ موت اسی چارپائی پر واقع ہوئی تھی۔ اُس وقت یعنی رات کے وقت چارپائی صحن میں تھی۔ خاوند کو مُردہ حالت میں سب سے پہلے اُس کی بیوی نے دیکھا تھا۔ مَیں نے سب کو وہاں سے ہٹا کر لاش کا چہرہ، بازو، ہاتھ اور پاؤں دیکھے۔ ناخن دیکھے اور مَیں نے مان لیا کہ حرکتِ قلب بند ہونے کا کیس نہیں۔ لاش کے ہونٹ اور ناخن نیلے ہو گئے تھے۔ ہاتھوں اور پاؤں پر بھی نیلاہٹ تھی۔ ہونٹوں سے تھوڑی سی

جھاگ بھی نکلی تھی۔ یہ سانس روک کر مارنے کی نشانیاں تھیں۔ لاش کی گردن دیکھی۔ انگلیوں یا رسّی وغیرہ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ گلا نہیں گھونٹا گیا تھا۔ قمیض ہٹا کر پیٹ دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ بعض اوقات جگر کے مقام پر زور سے گھونسا یا لاٹھی لگنے سے انسان مر جاتا ہے۔ وہاں بھی ضرب کا یا جمے ہُوئے خون کا کوئی نشان نہ تھا۔

مَیں نے سب سے پہلے بیوی سے پوچھ گچھ کی۔ اُس نے بتایا کہ وہ شام کھانے کے بعد ایک شادی والے گھر چلی گئی تھی۔ تیل وغیرہ جیسی کوئی رسم تھی۔ وہ آدھی رات سے ذرا پہلے گھر آئی۔ اس کی چارپائی خاوند کی چارپائی کے ساتھ تھی۔

اُس نے باہر والا دروازہ کھلا دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند ہونا چاہیئے تھا۔ بیوی کو دروازہ کھٹکھٹانا تھا اور خاوند نے اُٹھ کر دروازہ کھولنا تھا، مگر دروازہ کھلا ہُوا تھا جس سے بیوی کچھ حیران ہُوئی۔ اُسے کوئی شک نہ ہُوا۔ اُس نے سوچا کہ خاوند دروازہ بند کرنا بھول گیا ہو گا۔ اندر آ کر اُس نے خاوند کو بُلایا، بلایا، وہ نہ جاگا۔ اُس نے خاوند کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو ہاتھ غیر معمولی طور پر ٹھنڈا تھا۔ بیوی نے بتی جلا کر دیکھا تو اُسے پتہ چلا کہ وہ تو مر چکا ہے۔

"لاش کس حالت میں پڑی تھی؟" مَیں نے پوچھا۔

اُس نے بتایا کہ ایک ٹانگ دُہری تھی۔ دوسری چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھی۔ ایک ہاتھ پیٹ پر اور دُوسرا تکیے پر تھا۔ مَیں نے اور زیادہ گہرائی اور باریکی میں جانے کے لیے بہت سے سوال کیے۔ ان سے یہ انکشاف ہُوا کہ تکیہ سر کے نیچے نہیں بلکہ مرنے والے کے مُنہ پر پڑا تھا، اور یہ تکیہ بیوی کے بستر کا تھا۔ خاوند کا تکیہ اس کے سر کے نیچے تھا۔ اُس نے چادر اُوپر سے رکھی تھی جو لاش پر پوری نہیں تھی۔ آدھی پیٹ سے گھٹنوں تک اور باقی چارپائی سے نیچے تھی۔

میرے پوچھنے پر بیوی نے بتایا کہ خاوند کے نیچے جو چادر بچھی ہُوئی تھی وہ کئی جگہوں سے

اکٹھی ہوگئی تھی۔ یہ تمام نشانیاں بتا رہی تھیں کہ مرنے والا مرنے سے پہلے تڑپتا رہا ہے۔ دل کی حرکت بند ہونے سے جسم تڑپتا نہیں۔ انسان سکون سے مرجاتا ہے تکیہ منہ پر تھا۔ یہ ایک واضح ثبوت تھا کہ یہ شخص چت سویا ہوا تھا یا اسے سوتے میں پہلو سے چت کیا گیا اور ساتھ والی چارپائی سے تکیہ اٹھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا گیا اور اوپر سے دبا لیا گیا۔ ناک اور منہ بند ہوجانے سے سانس رک گیا اور موت واقع ہوئی۔

یہ بلاشک و شبہ قتل کی واردات تھی۔

"تم نے کہا تھا اس کا ہارٹ فیل ہوا ہے" ــــ میں نے اس کی بیوی سے کہا۔ "کیا اسے دل کی کوئی تکلیف تھی؟ کبھی دل کا دورہ پڑا تھا؟"

"کبھی نہیں" ــــ اس نے جواب دیا۔

"پھر تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا کہ اس کا ہارٹ فیل ہوا ہے؟"

"اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی" ــــ اس نے جواب دیا۔

"کیا تمہارا خاوند منہ پر تکیہ رکھنے کا عادی تھا؟" ــــ میں نے کہا۔ "بعض لوگ سوتے وقت تکیہ نیچے سے نکال کر ماتھے اور سر پر رکھ لیا کرتے ہیں"

"اس نے ایسے کبھی نہیں کیا تھا"

"گھر میں اور کوئی نہیں تھا؟"

"کوئی بھی نہیں"

"بچے کہاں ہیں؟"

"بچے ہیں ہی نہیں" ــــ اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اولاد نہیں ہوئی"

نوجوان بیوی، پُراسرار کردار

اس عورت کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی اور اس کے خاوند کی عمر پچاس سال سے ایک آدھ سال اُوپر یا کم۔ اس عورت نے یہ نیا انکشاف کیا کہ صرف ایک مہینہ پہلے اُس کے خاوند نے بائیس سال کی عمر کی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کی ہے۔

اس انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کا انتظام کرایا۔ اس عورت کو (جسے اب میں پہلی بیوی کہوں گا) کمرے میں بٹھائے رکھا۔ میں جب اپنے عملے کو پوسٹ مارٹم کے لیے لاش لے جانے کے لیے کہہ چکا تو پہلی بیوی نے کہا ــــ "یہ بھی ایک وجہ تھی کہ میں اس پر زور دے رہی تھی کہ اس کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔ اس کا (خاوند کا) بھائی شور مچا رہا تھا کہ وہ لاش تھانے لے جائے گا تو میں نے اسے کہا تھا کہ پولیس لاش کو ہسپتال بھیج دے گی اور ڈاکٹر اسے چیر پھاڑ دیں گے۔ میں نے خاوند کو زندگی میں کبھی آنچ نہیں آنے دی تھی۔ مرنے کے بعد اسے نہ چیرو۔ میرا دل پھٹ جائے گا" ــــ یہ کہہ کر وہ ایسی بلبلا کر رونے لگی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا اور اُس وقت تو میرے لیے اور زیادہ مشکل پیدا ہوگئی جب اس کے خاوند کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے گھر سے نکالی گئی۔ میں اگر دوڑ کر اس عورت کو دبوچ نہ لیتا اور دو عورتیں اس کے آگے نہ آجاتیں تو وہ چارپائی سے خاوند کی لاش کو گھسیٹ لیتی اور اگر میں اسے یہ بتا دیتا کہ اس کے خاوند کا دل اور پھیپھڑے یا پھیپھڑوں کا کچھ حصہ کاٹ کر ضلعے کے ہسپتال میں ماہرین کے پاس بھیجا جائے گا اور خاوند کے جسم کے یہ دونوں حصے اُسے نہیں ملیں گے تو وہ

پیدا نہ ہونے دیتی۔

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ خاوند کے قتل میں اس عورت کا ہاتھ نہیں؟" — یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہمارے معاشرے کا وہی کردار سامنے آگیا جو قتل اور خودکشی کا باعث بنتا چلا آیا ہے۔ اور بنتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے بوڑھا خاوند نوجوان بیوی۔ اور جب نوجوان بیوی بوڑھی بیوی کی سوکن بن کر آتی ہے۔ تو پُراسرار وارداتوں کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔ ان خاوندوں کی عقل پر حیرت ہوتی ہے۔ جو یہ دیکھے بغیر کہ خدا نے انہیں اولاد پیدا کرنے کا وصف عطا کیا ہے یا نہیں دوسری شادی کر لیتے ہیں۔

اور پھر بڑھاپے میں آکر دوسری شادی کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ پہلی بیوی کا دل توڑنا اور دوسری بیوی کی اُمنگیں تباہ کر دینا ایک ایسا گناہ ہے جو قدرت معاف نہیں کیا کرتی۔ خاوند اپنے لیے اذیت پیدا کر لیتا ہے۔ یا مارا جاتا ہے، جیسا اس واردات میں مجھے نظر آ رہا تھا۔ مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ خاوند کو قتل پہلی بیوی نے کروایا ہے یا دوسری نے۔ یہ امکان بھی تھا کہ دوسری بیوی کے کسی اُمیدوار نے یہ واردات کی ہو۔

پہلی بیوی کی جذباتی کیفیت اور اس کا یہ کہنا کہ وہ خاوند کی لاش کو چیر پھاڑ سے بچانا چاہتی تھی مجھے قائل کرنے کے لیے کافی نہیں تھا کہ قتل کرنے یا کرانے میں اس کا ہاتھ نہیں۔ میں نے اس سے دوسری بیوی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہے۔ اُس نے بتایا کہ دو روز سے میکے گئی ہوئی ہے۔ اُس کا میکہ اسی قصبے کا ہی ایک حصہ تھا جسے ایک برساتی نالے نے الگ کر رکھا تھا۔

"کیا وہ اس شادی پر خوش ہے یا رنجیدہ؟"

"چپ چپ رہتی ہے" — پہلی بیوی نے جواب دیا — "دو روز یہاں رہتی ہے دو

روز ماں باپ کے گھر گزارتی ہے۔"

"شوخی کرنے والی ہے؟" — میں نے پوچھا — "یا سیدھی سادی سی لڑکی ہے؟"

"ایسی شوخ بھی نہیں اور میں اُسے سیدھی سادی بھی نہیں کہہ سکتی۔"

"اُسے خاوند کی موت کی اطلاع مل چکی ہوگی؟" — میں نے کہا۔ "وہ آگئی ہوگی؟"

"اُس کے ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار صبح سویرے آگئے تھے" — پہلی بیوی نے جواب دیا — "وہ نہیں آئی۔ میں نے رات کو ہی اطلاع بھجوا دی تھی۔"

میں بہت حیران ہُوا کہ خاوند کی موت کی اطلاع پر نہیں آئی۔ میں نے پہلی بیوی سے کہا کہ اندر جا کر دیکھے۔ وہ ضرور آئی ہوگی۔ اُس نے واپس آکر بتایا کہ وہ نہیں آئی۔ میرا شک پختہ ہونے لگا۔ میں نے پہلی بیوی کو باہر بھیج کر دوسری بیوی کے باپ کو بلایا۔ اُس سے پوچھا کہ اس کی بیٹی کیوں نہیں آئی؟ اُس کے چہرے پر جو رنگ آتے اور گئے اور جس طرح وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ صرف بے ہوش نہیں ہُوا، باقی کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ طرح طرح کی باتیں کر کے میں نے اُسے سنبھالا دیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے بتایا کہ اُس کی بیٹی گزشتہ رات سے لاپتہ ہے۔ وہ اسے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ بے عزتی کے ڈر سے وہ ابھی پولیس کو اطلاع نہیں دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے خاوند کو بھی اطلاع نہ دی۔ اِس گھر میں آکر دیکھا بھی نہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے خاوند کے گھر نہیں گئی۔

میرے ذہن میں بات واضح ہوگئی۔ یہ نوجوان لڑکی اپنی عمر سے دُگنی سے بھی زیادہ عمر کے آدمی کے ساتھ شادی پر خوش نہیں تھی۔ اس پر یہ زیادتی بھی ہُوئی تھی کہ اُسے سوکن بنایا گیا تھا۔ پہلی بیوی کو بھی اس کے خاوند کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ بات نئی بیوی کے لیے اور

زیادہ ناگوار ہو سکتی تھی کہ اسے بچے پیدا کرنے کا فرض سونپا گیا تھا۔ اُس نے یقیناً کسی اور کو دل میں بٹھا رکھا ہو گا جس کے [illegible] وہ بھاگ گئی ہو گی۔ لیکن میں اپنے ذہن سے اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکا کہ خاوند کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر [illegible] تھی۔ اگر خاوند کے گھر سے بھاگتی تو قتل کی وجہ یہ بن سکتی تھی کہ خاوند نے مزاحمت کی اور لڑکی کے دوست نے اُسے قتل کر دیا مگر خاوند کا قتل تو کسی اور نوعیت کا تھا۔ میرے خیال میں اتفاقی شہادت کے مطابق اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اُسے قتل کیا گیا تھا۔ [illegible] یہ وجہ ہو سکتی تھی کہ لڑکی جس کے ساتھ بھاگی ہے اُس نے سوچا ہو گا کہ شادی شدہ لڑکی کی [illegible] ساتھ خاوند کی زندگی میں شادی جائز نہیں ہو گی۔ طلاق تو لی نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے قتل ضروری سمجھا گیا۔

مجھے اپنی یہ دلیل خاصی کمزور لگی۔ [illegible] سوال میرے ذہن میں تڑپنے لگا کہ لڑکی اپنے گھر سے بھاگی تو خاوند کو اس کے گھر میں قتل کرنا کیوں ضروری تھا؟ ایک سوال یہ بھی سامنے آیا کہ کیا لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے اور خاوند کو انتقاماً قتل کیا گیا ہے؟ اس صورت میں لڑکی کے رشتے کے اُمیدوار ایک یا ایک سے زیادہ ہوں گے۔ مجرم کوئی اِن میں سے ہو سکتا تھا۔ میں نے لڑکی کے باپ سے پوچھا کہ وہ گھر سے زیورات اور نقدی لے گئی ہو گی۔ باپ نے قسمیں کھا کر کہا کہ لڑکی [illegible] تھی۔ وہ کچھ بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ شام کھانا کھانے کے بعد [illegible] نے [illegible] کے گھر جا رہی ہے سہیلی کا گھر آبادی سے باہر کی طرف ہے [illegible] [illegible] تو ماں اُسے لینے گئی معلوم ہوا کہ [illegible] گھر تک گئی ہی نہیں [illegible] دوسری [illegible] سے پتہ کیا وہ وہاں بھی نہیں گئی تھی۔

سگریٹ کا ٹکڑا

مَیں نے اس لڑکی (دوسری بیوی) کی ماں کو بُلا لیا۔ باپ کو باہر بھیج دیا۔ کوئی باپ اپنی بیٹی کے چال چلن کو بُرا نہیں کہتا۔ بعض باپ اپنی بیٹیوں کی ذاتی سرگرمیوں اور میل ملاپ سے واقف بھی نہیں ہوتے۔ مائیں بیٹیوں کی رازدان ہوتی ہیں۔ مَیں نے ماں سے پوچھا کہ اس کی سہیلیوں میں سے کتنی اُس کی بہت گہری سہیلیاں تھیں جن کے گھروں میں وہ بہت زیادہ جاتی تھی۔ ماں نے ایک تو یہ بتائی جس کے گھر وہ کہہ گئی تھی کہ جا رہی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور تھی۔

مَیں نے پوچھا کہ ان میں سے کسی کے یا دونوں کے جوان بھائی ہیں؟ اُس نے بتایا کہ ایک سہیلی کے دو بھائی جوان ہیں۔ ایک شادی شدہ ہے اور دوسرا غیر شادی شدہ۔ دوسری کے بھائی چھوٹے ہیں۔

”تم جب رات اس سہیلی کے گھر اپنی بیٹی کے متعلق پوچھنے گئی تو اس کے دونوں بھائی گھر میں موجود تھے؟“ — مَیں نے پوچھا۔

”دونوں موجود تھے“ — اُس نے جواب دیا۔

”اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی تمہیں واپس مل جائے تو مجھے وہ سب کچھ بتا دو جو تمہارے دل میں ہے“ — مَیں نے اسے کہا — ”وہ کسے پسند کرتی تھی؟“

”مَیں کچھ بھی نہیں جانتی“ — اُس نے بڑے ہی اُداس لہجے میں جواب دیا — ”کبھی ایسا شک بھی نہیں ہُوا تھا کہ اُس کی کسی کے ساتھ خفیہ ملاقات ہے۔ وہ ایسی تھی بھی نہیں۔“

”اس کے ساتھ یہ زیادتی تم نے کی ہے یا تمہارے خاوند نے کہ اُسے سوکن بنا کر اُس کے

باپ کی عمر کے آدمی کے حوالے کر دیا؟"

"ہم نے سوچا تھا کہ وہ امیر کبیر آدمی ہے" — اُس نے جواب دیا — "اتنا بڑا امکان ہے۔ بیٹی سکھی رہے گی۔ اولاد ہونے کی صورت میں وہ گھر کی ملکہ بن سکتی تھی۔"

"مگر وہ کسی اور کے گھر کی ملکہ بننا چاہتی تھی" — مَیں نے کہا — "مجھے وہ آدمی بتاؤ؟"

اُس نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا — "آپ کا کیا خیال ہے کہ قتل میں میری بیٹی کا بھی نام آتا ہے؟"

"ضروری نہیں" — مَیں نے کہا اور اس کے دل سے خوف نکالنے کے لیے کہا — "تمہاری بیٹی اپنے گھر سے گئی ہے۔ خاوند کو قتل کرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری بیٹی کو کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اُس کے رشتے کے لیے تم لوگوں نے آنے والوں کو جواب دیا ہوگا۔ اُن میں کوئی اتنا دلیر ہے جس نے یہ انتقامی کارروائی کی ہو؟"

اُس نے ذہن پر زور دے کر جواب دیا — "اُن میں سے کوئی ایک بھی اتنا دلیر نہیں۔"

اس سے چند اور باتیں پوچھیں اور اسے فارغ کر دیا۔ یہ ابتدائی کارروائی تھی۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ اس ڈرامے میں کون کیا ہے۔ مَیں صحن میں گیا اور مکان کا جائزہ لیا۔ قاتل باہر سے آیا ہوگا۔ پہلی بیوی نے کہا تھا کہ وہ شادی والے گھر چلی گئی تھی۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند ہونا چاہیے تھا یقین کیا ہُوا تھا۔ مَیں نے فرض کیا کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس صورت میں قاتل کس طرف سے اندر آسکتا تھا؟ کوٹھے پر نظر جانے سے پہلے میری نظر صحن کی دیوار پر پڑی۔ اُس طرف باہر کشادہ گلی تھی۔ دیوار پر اندر کی طرف سے سفیدی کی گئی تھی۔ دیوار پر مجھے ایک صاف نشان نظر آیا۔ یہ ننگے پاؤں کی انگلیوں کی رگڑ ہو سکتی تھی اور یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے اب وہم اور افسانے میں سے حقیقت نکالنی تھی۔ یہ نشان غور سے دیکھا۔ تازہ معلوم ہوتا تھا۔ دیوار کی بلندی

سات فٹ کے لگ بھگ تھی۔ اُوپر سے گولائی میں نہیں بلکہ چپٹی تھی۔

میز منگوا کر مَیں اس پر کھڑا ہو گیا۔ اُوپر گرد کی موٹی تہہ تھی۔ ایک جگہ سے گرد صاف تھی۔ اس کے دائیں بائیں ایسے نشان بڑے صاف تھے جیسے باہر سے کوئی اُوپر آیا اور وہاں اُس نے ہاتھ رکھے۔ دیوار پر جا کر مَیں باہر کو کُود گیا۔ اُدھر بھی کچھ عرصہ پرانی سفیدی تھی اور وہاں اُوپر چڑھنے کے صاف نشان تھے۔ باہر ایک جگہ ہاتھ ڈالنے کی ذرا سی جگہ تھی۔ پاؤں کی رگڑ کے نشان واضح تھے۔ پاؤں ننگے معلوم ہوتے تھے۔ گلی کچی تھی۔ دیوار کے ساتھ ننگے پاؤں کے نشان تھے اور جُوتوں کے بھی۔

ایک نشان تو بہت ہی واضح تھا۔ دیوار کے ساتھ پاؤں کے نشانات کے قریب بُجھے ہوئے سگریٹ کا ٹکڑا پڑا تھا جس کے جلتے ہُوئے سرے کو رگڑ کر بجھایا گیا تھا۔ دیوار پر سیاہ نشان تھا جس کے متعلق کوئی شک نہیں تھا کہ یہاں سگریٹ بجھایا گیا ہے۔ مَیں اور ہر تھانیدار مجرموں کی عادات اور نفسیات سے واقف تھا۔ مَیں نے سگریٹ کا ٹکڑا اُٹھا کر سُونگھا۔ اس میں چرس ملی ہوئی تھی۔ اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو دیا۔ اُس نے بھی سُونگھ کر کہا کہ چرس ہے۔

چرس ثابت کرتی تھی کہ اگر یہی آدمی دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور قتل کی واردات کی ہے تو یہ کوئی عادی مجرم ہے۔ آج کل تو پتہ چلا ہے کہ کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی چرس پیتی ہیں۔ اُس زمانے میں چرس صرف جرائم پیشہ لوگ یا ملنگ وغیرہ یعنی بہت ہی گھٹیا درجے کے لوگ پیتے تھے۔ یہ سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ یہاں دیوار کے ساتھ اچھے خاندانوں کے لڑکے بیٹھ کر چرس پیتے رہے ہوں۔ مَیں نے سگریٹ اپنے پاس رکھ لیا۔

مجھے یہ یقین ہو گیا کہ قاتل کرائے کا ہے اور پیشہ ور ہے۔ سات فٹ کی دیوار پھلانگنا بھی پیشہ ور کا کام تھا۔ اُس نے اندر جا کر مقتول کے منہ پر تکیہ رکھا اور اسے مار کر دروازہ اندر سے کھولا

اور باہر نکل گیا۔ پہلی بیوی نے کہا تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہونا چاہیئے تھا لیکن کھلا ہوا تھا۔ یہ قاتل نے کھولا تھا۔ وہ جوتے پہننے کے لیے پھر دیوار کے اُس طرف گیا ہوگا جہاں سے اُوپر چڑھا تھا۔ مجرم، خصوصاً ڈاکے اور قتل جیسے بڑے جرم سے پہلے اکثر مجرم چرس یا شراب پیتے ہیں۔ اس مجرم نے چرس کے کش لگائے اور سگریٹ دیوار کے ساتھ بجھا کر اُوپر چلا گیا۔ دیوار کے اُوپر چڑھ کر اندر آہستہ سے اتر گیا۔

اغوا یا فرار؟

اگر قتل کرانے کا تھا تو یہ انتظام پہلی بیوی نے کیا ہوگا۔ یہ شک اس لیے ہوا کہ وہ پرانی عمر کی عورت تھی۔ تجربہ کار اور ہوشیار تھی۔ نئی عمر کی لڑکی کے لیے یہ کام آسان نہیں تھا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لڑکی کا گھرانہ متوسط درجے سے ذرا کم ہی تھا۔ مقتول کا معیار اُونچا تھا۔ اس کے مقابلے میں لڑکی کا خاندان غریب تھا۔ لڑکی کے متعلق ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ چال چلن کی کیسی تھی۔ یہ رائے میں نے ضرور قائم کر لی تھی کہ عورت ذات جب انتقامی کارروائی پہ اُتر آتی ہے تو کمرے میں بند کی ہوئی بلی کی طرح ایسا جوابی حملہ کرتی ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

بات ذرا کھلتی آ رہی تھی۔ میں نے اُن دو آدمیوں کو معلوم کر کے الگ کر لیا جو پہلی بیوی کے واویلے پر اس کے گھر میں آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آدھی رات سے ذرا پہلے انہیں پڑوس میں اس عورت کی چیخ و پکار سنائی دی۔ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آ گئے۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ پہلی بیوی اپنا سینہ پیٹ رہی تھی۔ لاش کے منہ پر تکیہ نہیں تھا جو پہلی بیوی نے اُٹھا کر دوسری چارپائی پر رکھ دیا ہوگا۔ لاش کی پوزیشن انہوں نے وہی بتائی جو پہلی بیوی بتا چکی تھی۔ بیوی

نے انہیں بتایا کہ وہ شادی کے گھر سے آئی تو خاوند کو اس حالت میں دیکھا۔

ان آدمیوں نے لاش کو اپنی عقل کے مطابق دیکھا۔ گردن بھی دیکھی۔ جسم بھی دیکھا۔ انہیں کہیں بھی ضرب یا زخم نظر نہ آیا۔ بیوی نے کہا کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہوگا۔ انہوں نے کوئی شک نہ کیا۔ لاش سیدھی کی اور چارپائی اٹھا کر برآمدے میں کر دی۔ پھر محلے کی عورتیں آنے لگیں۔ چند اور مرد آ گئے تھے جو عورتوں کو دیکھ کر باہر چلے گئے۔

اِن دو آدمیوں میں ایک مجھے خاصا سیانا لگا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کا تجربہ کیا کہتا ہے۔ یہ حرکتِ قلب بند ہونے کا کیس ہے یا قتل کا۔ اُس نے جواب دیا۔ ”میں اس وجہ سے اسے دل کی حرکت بند ہونے کا کیس سمجھا تھا کہ پچاس سال کی عمر میں بائیس سال کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا اور جس بیوی نے تیس سال غلاموں کی طرح ساتھ نبھایا، اُس کے ساتھ شرمندگی کی حالت میں رہنا دل کی حرکت بند کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مقتول شریف آدمی تھا۔ بدمعاش آدمی بہت کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔“

چونکہ یہ گھرانے مسلمانوں کے تھے، پردہ تھا، اس لیے مرد عورتوں کے متعلق وہی رائے دیتے تھے جو اُن کی عورتیں انہیں بتاتی تھیں۔ ان دونوں نے اپنی عورتوں کی زبانی بتایا کہ دوسری بیوی غریب گھرانے کی ہے، خوبصورت ہے، چالاک نہیں۔ پہلی بیوی زیادہ عمر کی وجہ سے تجربہ کار ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اتنا بڑا جرم کر سکتی ہے۔ وہ اتنی ہوشیار نہیں۔ اپنی قسمت کا رونا روتی ہے کہ اُس کی اولاد نہ ہوئی۔ اُس نے کسی سے شکایت نہ کی کہ اس کے خاوند نے دوسری شادی کر لی ہے۔ یہ بھی سُنا گیا ہے کہ اپنے خاوند کو ہر وقت اُداس دیکھ کر اس نے اُسے بخوشی دوسری شادی کی اجازت دی تھی۔

ان سے بہت سی معلومات لے کر میں نے اپنی ضرورت کے مطابق آدمی جمع کیے اور انہیں

بتانے چلنے کو کہا۔ ان میں پہلی بیوی کے دو بھائی تھے۔ مقتول کا ایک بھائی، دوسری بیوی کا باپ اور بیٹے کے یہ دو آدمی تھے جو پہلی بیوی کے شوہر پر پہنچے تھے۔ ان سے تو اِدھر اُدھر کی صف پوری معلومات یعنی تھیں۔ صحیح اطلاعیں لینے کے لیے مُخبروں کو استعمال کرنا تھا۔ ان میں دو عورتیں تھیں۔

تھانے میں جاکر میں نے ان امکون سے سوچا تو سب سے پہلے دل سے یہ دُعا نکلی کہ یہ موت قدرتی نکلے اور پوسٹمارٹم رپورٹ ثابت کر دے کہ یہ قتل نہیں، مرنے والے نے خود ہی تکیہ اپنے منہ پر رکھ لیا ہو۔ جس نے مرنے میں اس کا سانس روک دیا۔ اس کے بعد میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ پہلی بیوی کے لیے قتل کا یہ جواز ہو سکتا ہے کہ جائیداد خاوند کے نام پر ہوگی۔ اس عورت کو یہ خطرہ محسوس ہُوا ہوگا کہ وہ نئی نویلی دُلہن کے جال میں آکر جائیداد اُس کے نام کر دے گا۔

نئی دلہن کا اغوا یا فرار میرے لیے اُلجھن پیدا کر رہا تھا اور مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ لڑکی اگر اغوا ہوئی ہے تو کیا قتل اور اغوا ایک دوسرے سے متعلق ہیں یا اغوا (یا فرار) محض اتفاق سے قتل کی رات ہُوا ہے؟

تفتیش میں بعض اوقات یُوں بھی ہوتا ہے کہ بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں والی بات ہوتی ہے اور مجھ جیسے مغز خورے تھانیدار سارے تھانے کی حدود یعنی اپنے تمام تر علاقے کی خاک چھانتے اور ہر مُشتبہ کے لیے قیامت کھڑی کیے رکھتے ہیں، مگر ایسی خوش نصیبی کبھی کبھی دیکھنے میں آتی ہے۔ میں نے تفتیش کی انسانی مشینری کو خوب مشق کرا رکھی تھی۔ اُدھر واردات ہوتی تھی اِدھر میرے سرکاری اور غیر سرکاری مُخبر اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھال لیتے تھے۔ ان میں زیادہ تر افراد خفیہ تھے جن کے متعلق اُن کے عزیز دوست اور قریبی رشتہ دار بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ کتنے خطرناک لوگ ہیں۔ اس کیس میں مجھے اُن کا خصوصی استعمال کرنا تھا۔ میں نے انہیں بُلایا اور دونوں مُخبر عورتوں کو بھی بُلایا۔

مجھے پوسٹمارٹم رپورٹ کا انتظار تھا۔ اس میں معمول سے زیادہ وقت لگ گیا۔ رپورٹ شام کو آئی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ حرکتِ قلب بند ہونے سے موت واقع نہیں ہُوئی سانس رُکنے سے ہُوئی ہے۔ ڈاکٹر یہ تو نہیں لکھ سکتا تھا کہ کسی نے اس کی ناک اور مُنہ پر سرہانہ رکھ کر اُوپر سے دبائے رکھا حتیٰ کہ وہ مر گیا۔ اس کیس میں سانس رُکنے سے مراد قتل تھا۔ ڈاکٹر نے مزید تصدیق کے لیے مقتول کا دل اور پھیپھڑوں کا کچھ حصہ اور غالباً اندر کے ایک دو اور اعضا نکال کر ضلعے یا صوبے کے ماہرین کو بھجوا دیئے تھے۔ میرے لیے معاملہ صاف تھا۔ یہ قتل کی واردات تھی۔

میں نے دونوں مُخبر عورتوں سے کہا کہ وہ مقتول کی پہلی بیوی کے متعلق معلومات حاصل کریں اور دوسری بیوی کے متعلق تفصیل سے معلوم کریں کہ چال چلن کی کیسی تھی۔ اس کا کسی کے ساتھ دوستانہ تھا؟ کسی کے ساتھ چوری چُھپے میل ملاپ تھا؟ اور کیا وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا اغوا ہُوئی ہے؟ دوسرے مُخبروں کو بھی ضروری ہدایات دیں اور رُخصت کر دیا۔ رات کو میں نے تفتیش جاری رکھی۔

دوسری بیوی کے باپ سے پوچھا کہ وہ لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانا چاہتا ہے یا اُسے یقین ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ اُس بے چارے کی حالت ایسی تھی کہ منہ کھول کر مجھے دیکھتا رہا۔ بولا کچھ بھی نہیں۔ مجھے بہرحال اس لڑکی کو ڈھونڈنا تھا کیونکہ خاوند کے قتل کے ساتھ اُس کا گہرا تعلق تھا خواہ گواہ کی حیثیت سے ہی سہی۔ میں نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہ کی۔ اس کے باپ پر ہر زاویے سے حملہ کیا۔ اُسے بہت چکر دیئے مگر مجھے اس سوال کا جواب نہ ملا کہ اس کی بیٹی کی گمشدگی اغوا ہے یا فرار۔

مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ باپ کچھ چھپا نہیں رہا تھا۔ اُس نے تو یہ بھی نہ چھپایا کہ اس نے اپنی بیٹی کا رشتہ پانچ ہزار روپیہ نقد لے کر مقتول کو دیا تھا۔ اُس دَور کا پانچ ہزار آج کے

چالیس ہزار کے برابر تھا۔ باپ نے خدا کے نام پر اپنی بیٹی بیچی تھی اور اب ایسی اذیت میں مبتلا تھا کہ اس کے مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی اور اُس کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔

پہلی بیوی کے بھائی نے دھمکی دی

مَیں نے مقتول کے بھائی کو اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا کہ اُس نے لاش دیکھ کر ہی کیوں کہ دیا تھا کہ اس کا ہارٹ فیل نہیں ہُوا اسے قتل کیا گیا ہے؟

"میرے بھائی نے جب دوسری شادی کا دن مقرر کر دیا تو اس کی پہلی بیوی کے بھائی نے مجھے کہا تھا کہ مَیں بھائی کو دوسری شادی سے منع کروں" — اُس نے جواب دیا — "مَیں نے اُسے کہا کہ مَیں اُسے منع کر چکا ہوں مگر وہ نہیں مانتا۔ مَیں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میرے بھائی نے جب سے دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا مَیں اُس کی مخالفت کر رہا تھا۔ مَیں اُسے کہہ رہا تھا کہ پچاس سال تمہاری عمر ہو گئی ہے۔ نوجوان لڑکی معلوم نہیں تمہیں دل سے قبول کرے نہ کرے۔ کئی خرابیاں پیدا ہونی ہیں لیکن وہ نہیں مانا۔ اس کے دماغ پر اولاد سوار تھی۔ کہتا تھا کہ اتنا بڑا مکان اور اتنی بڑی دکان ہے۔ کون سنبھالے گا۔ بیوی کے بھائی کھا جائیں گے۔ مَیں نے اُسے یہ بھی کہا کہ خدا نے تمہیں لڑکا دے بھی دیا تو تم اس کے لڑکپن میں ہی بوڑھے ہو کر مر چکے ہو گے۔ ہم میں سے بھی کوئی نہ ہوگا۔ اس لڑکے کا کیا بنے گا؟ ایسی اور بہت سی باتیں اُسے سمجھائیں لیکن اس غریب باپ نے میرے بھائی کو اپنی کنواری بیٹی دے دی۔ اس کے بعد میرے بھائی کی پہلی بیوی کے بھائی نے مجھے غصے سے کہا کہ بھائی کو شادی سے منع کرو ورنہ تم سب پچھتاؤ گے۔ مَیں بھی غصے میں آگیا۔ آپس میں بہت بک بک ہوئی۔ وہ طبیعت کا ذرا کڑوا اور تیز ہے۔ اُس نے کہا کہ بھائی اور اپنی نئی بھابھی کو سنبھال کر رکھنا۔"

"کیا یہ شخص اتنا دلیر ہے کہ اُس نے تمہارے بھائی کو قتل کرا دیا ہوگا؟" — مَیں نے پوچھا۔

"میرے پاس کوئی ثبوت نہیں" — اُس نے جواب دیا۔ "جہاں تک دلیری کا تعلق ہے وہ کوئی ایسا گیا گزرا بھی نہیں۔ ہو سکتا ہے غصّے میں اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔ مَیں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شک ضرور ہے"۔

"تمہاری بڑی بھابھی نے اس سلسلے میں تمہارے ساتھ کوئی بات کی تھی؟"

"مَیں خود اُس کے پاس گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "مَیں نے اُسے کہا تھا کہ بھابھی! مَیں نے اپنے بھائی کو شادی سے بہت روکا ہے لیکن وہ نہیں مانتا۔ مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مَیں اس کی شادی میں راضی ہوں۔ وہ روتی تھی اور کہتی تھی کہ مَیں نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔ اب وہ مجھ سے یہ قربانی مانگتے ہیں تو مَیں نے خود ساتھ ہو کر رشتہ کروا دیا ہے۔ میری قسمت میں جو لکھا تھا اس پر صبر شکر کرتی ہوں"۔

"لیکن تمہیں معلوم ہے کہ مکان اور دکان کس کے نام پر ہے؟"

"اچھی طرح معلوم ہے" — اُس نے جواب دیا — "یہ ابھی بھائی کے نام پر ہیں"۔

"کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمہاری بڑی بھابی نے تمہارے بھائی کو اس خطرے سے قتل کرایا ہو کہ وہ جائیداد دوسری بیوی کے نام پر لکھ دے گا؟"

"میرے خیال ہے کہ وہ اتنے بڑے جُرم کی سوچ بھی نہیں سکتی" — اُس نے جواب دیا۔

"اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری نئی بھابی رات سے لاپتہ ہے؟"

اُس کی آنکھیں حیرت سے کُھل گئیں۔ کچھ دیر تک وہ بول بھی نہ سکا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ نئی دُلہن غائب ہے۔ وہ جب بولا تو اُس نے کہا — "مجھے بھائی کے گھر جا کر دیکھنا پڑے گا کہ زیورات اور نقدی تو نہیں لے گئی۔ وہ ضرور لے گئی ہو گی۔ اگر وہ نہیں لے گئی اور خود نہیں

بھاگی تو اسے میری بڑی بھابی کے بھائی نے غائب کرایا ہے۔"

"تم ابھی بھائی کے گھر جاؤ اور ایک تو یہ معلوم کرو کہ گھر سے زیورات، نقدی اور جائیداد کے کاغذات غائب ہیں یا موجود ہیں۔ اور دوسرے یہ معلوم کرو کہ اس لڑکی کا گھر میں رویہ کیسا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات معلوم کر سکو تو کرو اور جتنی جلدی ہو سکے مجھے بتاؤ۔"

اُسے بھیج کر میں نے پہلی بیوی کے اُس بھائی کو بلایا جس نے مقتول کے بھائی کو دھمکی دی تھی۔ اس کے ساتھ مجھے اُستادی سے باتیں کرنی تھیں۔ کچھ اگلوانا تھا۔ اس نے مقتول کی دوسری بیوی کے خلاف خوب زہر اگلا۔ اُسے بدکار کہا اور جو منہ میں آیا کہتا چلا گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے میکے میں تھی، خاوند کی موت کی خبر سن کر آئی ہوگی۔ اُس نے بکار سا جواب دیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ لڑکی غائب ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر وہ بدچلن ہے تو مجھے صرف ایک آدمی بتا دو جس کے ساتھ اُس کے تعلقات ہیں۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ میں اُس کے پیچھے پڑ گیا اور یہ بھی کہا کہ وہ کسی کا نام بتائے کیونکہ مجھے شک ہے کہ تمہارے بہنوئی کو اسی لڑکی نے اپنے کسی آشنا سے قتل کرایا ہے۔ اُس نے کوئی نشاندہی نہ کی۔

وہ غلط بیانی کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے سوالوں کی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا اور میں نے جب اُسے وہ دھمکی یاد دلائی جو اُس نے مقتول کے بھائی کو دی تھی تو پہلے اُس نے انکار کیا پھر میری جرح سے گھبرا کر فضول سی ہنسی ہنس پڑا اور کہنے لگا — "وہ تو غصّے کا اظہار تھا۔ میں اُسے ڈرا رہا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ اپنے بھائی کو بتائے گا اور وہ شادی سے باز آ جائے گا۔"

میں نے اُسے ڈھیلا نہیں چھوڑا۔ وہ اکھڑ گیا اور ہکلانے لگا۔ میں نے سوالوں میں ہیرا پھیری کی۔ اُسے بہت چکر دیئے۔ وہ اکھڑتا ہی چلا گیا اور اپنے خلاف میرے شک کو پختہ کرتا گیا مگر یہ صرف شک تھا۔ اُس کے منہ سے میرے کام کی کوئی بات ابھی نکلی نہیں تھی۔ میں نے اُسے

مشتبہ قرار دے دیا۔

پہلی بیوی کا ایک بھائی اور بھی تھا۔ اُسے بلایا۔ وہ بھی تھانے میں موجود تھا لیکن میں جلدی جان گیا کہ مولوی قسم کا آدمی ہے اور اس قتل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اسے اور اُن سب کو جنہیں میں نے تھانے بٹھائے رکھا تھا گھروں کو جانے کی اجازت دے دی۔ پہلی بیوی کے ایک بھائی کو حراست میں تو نہ لیا، تھانے میں ہی سُلانے کا انتظام کر دیا۔ اسے میں گرفتار نہیں کر سکتا تھا اور چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک حیران کُن انکشاف

میں نے بھی چھٹی کی۔ شام کو تھانے میں آتے ہی میں نے اے۔ایس۔آئی اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہہ دیا تھا کہ شہر اور ارد گرد کے جرائم پیشہ اور سزا یافتہ افراد کو تھانے میں بلا لیں اور تھانے کے علاقے کے نمبرداروں اور چوکیداروں سے بھی کہہ دیں کہ ایک لڑکی کا دھیان رکھیں جو شہر سے اغوا یا فرار ہوئی ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کو بلانا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ مجرم یا مجرموں نے جہاں سے دیوار پھلانگی تھی وہاں سے مجھے چرس والے سگریٹ کا ٹکڑا ملا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مجرم جرائم پیشہ ہیں۔

میں اگلے روز تھانے میں آیا تو غنڈے بدمعاش اور دیگر مطلوبہ افراد آئے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جرائم کرنے والے، جُوئے باز اور چرسی تھے۔ دیہاتی علاقے میں دو آدمی ایسے تھے جو کرائے کا قتل کر سکتے تھے۔ وہ دونوں آ گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ پولیس کی گفتگو کچھ اور انداز سے ہُوا کرتی ہے۔ میں نے وہ انداز اختیار کیا۔ بہت جھک جھک کی۔ ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ میں انہیں اکیلے اکیلے بلا رہا تھا۔ انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا اور اُکسا بھی رہا تھا۔ ڈرایا

دھوکا یا بھی مگر بات گول ہی رہی۔ مَیں نے انہیں اکٹھا بٹھا کر شرم دلائی کہ اُن کے شہر میں باہر سے کوئی آکر واردات کر گیا ہے۔ مَیں نے انہیں بتایا تھا کہ یہ قتل اُجرت پر کیا گیا ہے اور شہر کی ایک لڑکی بھی نکل گئی ہے جس کے متعلق معلوم نہیں کہ اغوا ہوئی ہے یا اپنی مرضی سے گئی ہے۔ مَیں نے کہا کہ اگر اغوا ہوئی ہے تو تم سب پر لعنت ہے۔

جرائم پیشہ افراد ایک دوسرے کے سامنے پولیس کو کوئی بات نہیں بتاتے۔ اس طرح وہ بدنام ہو جاتے ہیں۔ اُن کے ہم پیشہ ساتھی کہتے ہیں کہ یہ مُخبری کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مُخبری سب کرتے ہیں۔

مَیں نے انہیں ایک بار پھر اکیلے اکیلے اندر بُلایا اور ایک ہی سوال پوچھا ــ "باہر سے کون آیا تھا؟" ــ میرا مطلب تھا کہ باہر کا کوئی جرائم پیشہ شہر میں دیکھا گیا ہوگا۔

صرف ایک نے کہا ــ "آسی آیا تھا۔"

مَیں آسی کو نہیں جانتا تھا۔ مَیں اپنے آپ پر حیران ہُوا کہ یہ شخص اگر جرائم پیشہ ہے تو مَیں اُسے نہیں جانتا۔ معلوم ہُوا کہ وہ تھانے کے ریکارڈ پر نہیں اور شہر سے دُور رہتا ہے۔

مَیں نے دوسروں سے پوچھا کہ آسی کون ہے؟ کیا وہ ہمارے کام کا آدمی ہے؟

میرے ان سوالوں پر ایک اُدھیڑ عمر بدمعاش جو اسی قصبے کا رہنے والا تھا چونک کر بولا۔

"ہاں ملک صاحب! اس واردات میں وہ آپ کے کام کا آدمی ہو سکتا ہے۔ اللہ کی تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن آسی کا تعلق بنتا ہے۔"

اس پر دو اور بول پڑے۔ معلوم ہُوا کہ واردات والی رات سے ایک روز پہلے آسی کو شہر میں دیکھا گیا تھا۔

اور جب انہوں نے مجھے بتایا کہ آسی کون ہے تو ایسے لگا جیسے ان لوگوں نے میرے جسم

کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیئے ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ آسی مقتول کی پہلی بیوی کے پہلے خاوند کا بیٹا ہے۔ اس کا نام آصف علی تھا اور اُسے آسی کہتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ مقتول کی پہلی بیوی کی پہلے کسی اور سے شادی ہوئی تھی۔ اُس کا ایک بیٹا پیدا ہُوا جو یہ آسی تھا۔ یہ چار پانچ سال کا ہُوا تو اس کا باپ مر گیا۔ اس کی ماں کی عمر ابھی بائیس تیئیس سال ہی ہُوئی تھی۔ برادری نے اس کی شادی مقتول کے ساتھ کر دی۔ آسی آوارہ ہو گیا اور لڑکپن میں بُری بیٹھک میں چلا گیا۔ وہاں سے واپس نہ ہُوا۔ نوجوانی تک وہ استادوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ قتل کی اس واردات کے وقت وہ ایک گروہ کے ساتھ تھا لیکن ان لوگوں نے بتایا کہ ابھی اکیلے واردات کرنے کے قابل نہیں ہُوا۔ گروہ کے لیے مُخبری کرتا اور ہر طرح کی مدد کرتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ وہ شہر میں کبھی کبھی آتا ہے۔ ماں سے، ماموؤں سے اور کسی رشتہ دار سے نہیں ملتا۔ برادری اسے دھتکار چکی ہے۔

یہ انکشاف میرے لیے بڑا قیمتی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے ایک اور انکشاف کیا۔ وہ یہ تھا کہ اُسے کئی بار شبّو کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا گیا ہے۔ اس موقعہ پر ایک نے بتایا کہ پرسوں یعنی قتل کی رات سے پہلے دن اُسے شبّو کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا گیا تھا۔

شبّو میری ایک مُخبر عورت تھی۔ مَیں نے دو مُخبر عورتوں کو سراغرسانی کی ڈیوٹی دے رکھی تھی۔ ان میں ایک شبّو تھی۔ یہ تو گھر کا قصہ تھا۔ آسی کے متعلق مجھے شبّو سب کچھ بتا سکتی تھی۔ اس سے پہلے کسی نے آسی کا نام تک نہیں لیا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ آسی کو قتل کے لیے استعمال کیا گیا ہوگا۔ یہ ماں (مقتول کی پہلی بیوی) بھی کر سکتی تھی اور آسی کا یہ ماموں بھی جسے مَیں نے مشتبہ رکھا تھا۔ مَیں نے ان جرائم پیشہ اشخاص سے آسی کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کریں اور شبّو کا انتظار کرنے لگا۔ اس سے بات کیے بغیر مَیں پہلی بیوی کے مشتبہ بھائی اور پہلی بیوی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شام سے کچھ دیر پہلے شبّو نہ آئی دوسری عورت آگئی۔ اُس نے وثوق سے رپورٹ دی کہ لڑکی (دوسری بیوی) چال چلن کی صاف معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے متعلق کوئی جھوٹا قصّہ بھی کسی نے نہیں سنایا۔

مقتول کی پہلی بیوی کے متعلق رپورٹ بظاہر صاف تھی لیکن محلّے اور برادری میں یہ شک کیا جا رہا تھا کہ قتل میں پہلی بیوی بے گناہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی سب کو پتہ چل چکا تھا کہ دوسری بیوی لاپتہ ہے۔ عورتوں سے اس کی گمشدگی چھپائی نہیں جا سکتی تھی۔ ہر کسی نے دیکھا کہ خاوند کی موت پر وہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔ جب معلوم ہوا کہ وہ یہاں ہے ہی نہیں تو راز کھل گیا اور عورتوں نے باتیں گھڑنی شروع کر دیں۔ مُخبر عورت نے یہ باتیں غور سے سُنیں لیکن اس کی نگاہ میں یہ سب من گھڑت قصّے تھے۔ مجھے یہ شک بھی ہوا کہ لڑکی نے کہیں جا کر خودکُشی کر لی ہوگی۔ اس صورت میں مجھے اطلاع مل جانی چاہیئے تھی۔ لاش کی اطلاع تھانے میں ہی آنی تھی۔

مَیں نے اس مُخبر عورت سے مقتول کی پہلی بیوی کے پہلے خاوند اور بیٹے (آسی) کے متعلق پوچھا۔ اس نے تصدیق کی کہ اس کا پہلے ایک خاوند تھا جس سے ایک بیٹا تھا۔ یہ آسی تھا جو بڑا ہو کر بدمعاش اور غنڈہ بن گیا اور غائب ہو گیا۔ اس عورت نے کہا — "مَیں نے دو تین دفعہ اُسے شہر میں دیکھا ہے لیکن میری اس کے ساتھ کوئی بات چیت نہیں۔ شبّو اُسے اچھی طرح جانتی ہے۔"

اتنے میں مقتول کا بھائی آگیا۔ اُسے مَیں نے کہا تھا کہ مقتول کے گھر جا کر معلوم کرے کہ زیورات وغیرہ غائب ہیں یا نہیں۔ اُس نے بتایا کہ ایک بھی چیز غائب نہیں، بلکہ دوسری بیوی کے زیورات کی بھی کچھ چیزیں گھر میں موجود ہیں۔ مَیں نے اُس سے بھی آسی کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بھی تصدیق کی اور یہ بھی بتایا کہ مقتول آسی کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ قتل سے بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ آسی اپنی ماں سے ملنے آیا تھا۔ مقتول نے اُسے بہت بُرا بھلا کہا اور اُسے گھر میں بیٹھنے بھی نہیں دیا تھا۔ اُس وقت اتفاق سے یہ بھائی مقتول کے گھر میں موجود تھا۔ پہلی بیوی (آسی کی ماں) بہت روئی تھی۔

"کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ قتل میں آسی کا ہاتھ ہو؟" — مَیں نے پوچھا۔

"مَیں کچھ کہہ نہیں سکتا" — اُس نے جواب دیا — "مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ غنڈہ گردی اور بدمعاشی کرتا ہے یا نہیں یا کہیں نوکری چاکری کرتا ہے۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ کبھی کبھار ماں سے ملنے آتا ہے۔ اُس کی ماں کے بھائی بھی اُسے منہ نہیں لگاتے۔"

شبّو۔ مُخبر یا مشتبہ؟

پھر شبّو بھی آگئی۔ مَیں اُسے الگ لے گیا۔ اُسے فوراً نہیں کہا کہ وہ آسی کو جانتی ہے اور اُس کے متعلق کچھ بتائے۔ مُخبر عورتیں اور مرد بے شک پولیس کے لوگ ہوتے ہیں لیکن عقل والے تھانیدار اُن کی ہر رپورٹ کو سچ نہیں مان لیا کرتے کیونکہ یہ لوگ صاف چال چلن کے نہیں ہوتے۔ بعض جرائم پیشہ منہ مانگے پیسے دے کر اُن کے منہ بند کر دیتے اور اُن کی زبان سے پولیس کو گمراہ کراتے ہیں۔ پولیس کے لیے مُخبر کا وجود ضروری ہوتا ہے لیکن مشکوک بھی۔

مَیں نے پہلے شبّو کی رپورٹ سُنی۔ اُس نے دوسری بیوی کے متعلق جو رپورٹ دی وہ اس سے مختلف تھی جو مجھے دوسری مُخبر عورت دے چکی تھی۔ اُس نے بتایا کہ لڑکی چالباز ہے۔ شادی سے پہلے صاف نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ شبّو نے اپنی رپورٹ صحیح ثابت کرنے کے لیے بہت سے زبانی ثبوت پیش کیے اور مجھے شک میں ڈال دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مقتول کے ساتھ شادی کر کے یہ لڑکی دو تین روز خاوند کے پاس رہتی تھی اور دو تین روز ماں باپ کے

گھر میں نے اس کی یہ بات مان لی۔ یہی بات مجھے مقتول کی پہلی بیوی بتا چکی تھی۔ شبتو نے لڑکی کے متعلق چند ایک غلیظ باتیں بھی کہیں۔

"شبتو!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "یہ آسی کون ہے؟"

"آسی؟" ــــ اُس نے حیران ہو کر جواب دیا ــــ "کون آسی؟ میں تو کسی آسی کو نہیں جانتی۔"

"میں جانتا ہوں" ــــ میں نے کہا اور شبتو کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت ہی چالاک عورت تھی۔ وہ گھبرائی تو نہیں لیکن میں نے اُس کے چہرے کے رنگ کی تبدیلی دیکھ لی۔ میں اُس سے کچھ زیادہ ہی چالاک تھا۔ اُس نے مجھے نمایاں شک میں ڈال دیا۔ میں نے ذرا محتاط ہو کر اُس سے بات کی ــــ "میں اُسے جانتا ہوں شبتو! سنا ہے وہ مقتول کی پہلی بیوی کا پہلی شادی سے بیٹا ہے۔ مجھے اُس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں۔ تمہیں کچھ علم ہو تو بتاؤ۔"

"ہاں، یاد آگیا" ــــ اُس نے بڑے اطمینان سے کہا ــــ "میں نے اُسے عرصہ ہوا دیکھا تھا۔ کبھی خیال نہیں کیا کہاں چلا گیا ہے۔ اتنا یاد ہے اس عورت کا ایک بیٹا ہوا کرتا تھا۔ آج آپ سے پتہ چلا ہے کہ اُس کا نام آسی تھا" ــــ اُس نے اس موضوع کو گول کرنے کے لیے دوسری باتیں شروع کر دیں۔

"ٹھہرو شبتو!" ــــ میں نے اُسے روک دیا اور کہا ــــ "تم نے مقتول کی دوسری بیوی کے چال چلن کے متعلق جو رپورٹ دی ہے وہ ایسی ہے کہ مجھے اُن لوگوں سے بھی پوچھنا پڑے گا جنہوں نے تمہیں بتایا ہے کہ لڑکی چالباز ہے اور شادی سے پہلے صاف نہیں تھی۔ مجھے دو تین آدمی یا عورتیں بتا دو۔"

"وہ سب پولیس سے ڈرنے والے لوگ ہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں اُن کے نام بتا

دوں گی لیکن آئندہ میں ان لوگوں سے کوئی بات معلوم نہیں کر سکوں گی۔ میرا اعتبار ٹوٹ جائے گا۔"

میں نے شک کی بنا پر اس پر جرح شروع کر دی، لیکن ایسے انداز سے کہ اُسے شک نہ ہو کہ میں اُس پر شک کر رہا ہوں۔ میں بھولا اور انجان بن گیا اور اُس کا انداز ایسا ہو گیا جیسے مجھے نہیں بلکہ کسی بچے کو کوئی بات سمجھا رہی ہو۔ اس سے میرا شک پختہ ہوتا گیا۔

"شبتو!" ــــ میں نے مسکرا کر کہا ــــ "تم جو کچھ سوچ کر آئی تھیں وہ تم نے کہہ لیا ہے۔ آؤ اب کام کی باتیں کریں۔ یہ یاد کر لو کہ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے اور ایک لڑکی لاپتہ ہے جو مقتول کی بیوی تھی۔ تم جانتی ہو کہ یہ معمولی چوری چکاری یا کسی کے لڑائی جھگڑے کی واردات نہیں۔ یہ بھی یاد کر لو کہ یہ علاقہ ہندوؤں کا ہے اور میں مسلمان ہوں۔ تم بھی مسلمان ہو۔ ہندوؤں کے دل میں میرے خلاف دشمنی ہے۔ اگر کوئی میرا سگا عزیز مشتبہ ہو گا تو میں اُسے بھی نہیں بخشوں گا۔ تم اب ذرا دل کو صاف کر کے بات کرو۔ تم آسی کو نہ صرف جانتی ہو بلکہ کئی بار اُس کے ساتھ تمہاری باتیں بھی ہوئی ہیں۔ جھوٹ بولنے سے پہلے سوچ لینا کہ یہ اطلاع مجھے تم جیسے مُخبروں نے دی ہے۔ اس شہر میں مُخبر بھی ہیں مُجرم بھی ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جن کی نظریں تم سے زیادہ گہری ہیں۔"

وہ پریشان ہو گئی لیکن عورت چالاک تھی۔ زبان کی اُستاد تھی۔ اس نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی، پھر یہ کہا کہ مخبروں وغیرہ کے گروہ میں کچھ لوگ اس سے جلتے ہیں کیونکہ وہ ہر رپورٹ صحیح لاتی ہے۔ میں نے اب سیدھے سوال پھینکنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ روپڑی جو اداکاری تھی۔ وہ مجھے اُلو نہیں بنا سکتی تھی۔

"تم نے آخری بار آسی کو کب دیکھا تھا؟" ــــ میں نے کہا ــــ "سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ اب

تم مُجرم نہیں مشتبہ ہو۔ اس تھانے سے اب باہر نہیں جا سکو گی۔ بتاؤ تم نے اُسے کب دیکھا تھا؟"

"کہہ تو رہی ہوں کہ اُسے دیکھے ہُوئے عرصہ ہوگیا ہے" — اُس نے مظلوموں کے لہجے میں جواب دیا۔

"اور یہ عرصہ صرف دو دن کا ہے" — میں نے کہا — "قتل اور اغوا سے پہلے وہ تمہیں ملا تھا" وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اب وہ گھبرا رہی تھی۔ میں نے کہا — "اگر وہ تمہیں ملا تھا تو چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کوئی جُرم تو نہیں"۔

اُس کی چالاکی ختم ہو چکی تھی۔ ذرا سوچ کر بولی — "راستے میں مل گیا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں ہُوئی۔ مجھے دیکھ کر رُک گیا۔ خیر خیریت پوچھی اور چلا گیا"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں وہ اتنی اچھی طرح جانتا ہے کہ اُس نے خیر خیریت پوچھنے کی ضرورت محسوس کی" — میں نے کہا اور اُسے مشورہ دیا — "تم تھانے میں ہی رہو گی۔ ٹھنڈے دل سے سوچو اور اپنا دل کھول کر میرے آگے رکھ دینا۔ دیکھو شبّو! ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں تو بچوں کا پیٹ پالتے اور عزت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تم نے میری اور میرے محکمے کی بہت خدمت کی ہے۔ میں تمہاری خدمت کروں گا۔ لیکن مجھے بچہ سمجھ کر چکمہ دینے کی کوشش نہ کرو"۔

اس طرح کی کچھ اور باتیں کہہ کر اُسے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا۔

لڑکی اندھیرے راستے سے گئی

میں نے تین افراد کو تھانے بلایا۔ ایک مقتول کی دوسری بیوی کی ماں، اس کا باپ اور مقتول کی پہلی بیوی۔

یہ لوگ آگئے تو میں نے دوسری بیوی کی ماں کو الگ کر کے دفتر میں بٹھا لیا۔ اسے کہا کہ اچھی طرح یاد کر کے بتاؤ کہ جس شام اس کی بیٹی لاپتہ ہُوئی اُس روز یا اس سے ایک دو روز پہلے اُس کے گھر کون کون سی عورت آئی تھی۔ میں نے یہ سوال اپنے تجربے کی بنا پر کیا تھا۔ لڑکیوں کے اغوا یا فرار میں بعض اوقات شبّو کی قماش کی عورتیں کام کیا کرتی ہیں۔ وہ لڑکی کو جا کر پیغام دیتی ہیں۔ وقت اور جگہ بتاتی ہیں۔ اگر اغوا کرانا ہو تو انہیں کسی کا غلط پیغام دے کر ایسی جگہ پہنچا دیتی ہیں جہاں اغوا کرنے والے موجود ہوتے ہیں۔ میرے دماغ میں پہلے کی کچھ وارداتیں آگئی تھیں جن کی روشنی میں میں نے سوچا تھا کہ مقتول کی دوسری بیوی کے اغوا یا فرار میں شبّو نے مدد دی ہوگی۔

لڑکی کی ماں نے سوچ سوچ کر بتانا شروع کیا۔ اُس نے تین چار عورتوں کے نام لیے۔ ان میں شبّو کا نام بھی تھا۔ مجھے اسی نام سے دلچسپی تھی، لہٰذا اسی کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔ میں نے پُوچھا کہ شبّو اُس کے گھر اکثر آتی جاتی ہے؟ اُس نے بتایا کہ اسے وہ اتنا ہی جانتی ہے کہ اس کا خاوند چیچک سے اندھا ہو گیا تھا اور شبّو محنت مزدوری کر کے گزارہ کرتی ہے۔ شبّو کو وہ غریب عورت سمجھتی تھی۔ مجرم عورتوں کی یہی خوبی تھی کہ وہ غریب اور مظلوم بنی رہتی تھیں۔ میرے سوال کے جواب میں دوسری بیوی کی ماں نے بتایا کہ شبّو اُن کے گھر زیادہ نہیں آتی جاتی۔ قتل کے روز آئی تھی اور اس سے ایک دو روز پہلے بھی آئی تھی۔

"اُس نے تمہاری بیٹی کے ساتھ الگ ہو کر کوئی بات کی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"وہ دراصل میری بیٹی کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی" — اُس نے جواب دیا — "میں کسی کام سے باہر نکل گئی تھی"۔

"تمہاری بیٹی جب شام کے بعد گھر سے نکلی تو تمہیں کیا بتا کر گئی تھی؟" — میں نے کہا — "اس نے جو کچھ کہا تھا وہ مجھے بتا دو"۔

"اُس نے اپنی سہیلی کا نام لے کر کہا تھا کہ اُس کے گھر جا رہی ہوں"۔ اُس نے جواب دیا — "مَیں نے اُسے کہا تھا کہ دن کے وقت جانا تھا۔ اُس کے گھر کا راستہ اندھیرا ہے۔ میری بیٹی نے کہا کہ اُس نے کسی ضروری بات کے لیے بلایا ہے۔ شبّو نے آ کر کہا تھا کہ اس نے شام کے بعد بلایا ہے۔ وہ شاید اپنے رشتے کی کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ — مَیں نے بیٹی سے کہا کہ جلدی آ جانا۔ کہو تو مَیں ساتھ چلتی ہوں لیکن بیٹی نے ذرا غصّے سے کہا کہ مَیں بچی تو نہیں۔ راستے میں ڈاکو تو نہیں بیٹھے ہوئے۔ وہ چلی گئی اور مَیں پچھتا رہی ہوں کہ مَیں اس کے ساتھ کیوں نہ چلی گئی۔"

مجھے یہی معلوم کرنا تھا کہ اس ڈرامے میں شبّو موجود ہے یا نہیں۔ وہ موجود تھی۔ اب یہ دیکھنا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی یا اغوا کرائی گئی ہے۔ اس کی سہیلی کے گھر تک کا راستہ تاریک اور ویران تھا۔ مَیں نے فوری طور پر یہ کام کیا کہ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ وردی اُتار کر اپنے کپڑے پہنے اور دوسری بیوی کی ماں کے ساتھ اُس کی سہیلی کے گھر جا کر معلوم کرے کہ اُس نے شبّو کی زبانی یہ پیغام بھیجا تھا کہ گمشدہ لڑکی شام کے بعد اس کے گھر آئے؟

ہیڈ کانسٹیبل اس عورت کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ مَیں نے مقتول کی پہلی بیوی کو بلا لیا۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تمہارا ایک بیٹا بھی ہے؟" — مَیں نے اُسے کہا۔

اس گھبرائی عورت کے چہرے پر گھبراہٹ آ گئی اور خاموش رہی۔ مَیں نے کہا "مَیں نے سُنا ہے کہ وہ گھر گھاٹ کا نہیں رہا" — اُس کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے مَیں نے ہمدردی کے لہجے میں کہا — "خُدا نے تمہاری قسمت میں دُکھ ہی دُکھ لکھے ہیں۔ پہلا خاوند مر گیا۔ خدا نے ایک بیٹا دیا وہ کسی کام کا نہ نکلا۔ دوسرے خاوند سے اولاد نہ ہُوئی اور اُس نے بڑھاپے میں آ کر یہ دُکھ دیا کہ دوسری شادی کر لی۔ پھر وہ زندہ ہی نہ رہا۔"

"اُس کے آنسو بہ نکلے۔ مَیں نے اُسے جذبات میں اُلجھا لیا۔ بہت دیر جذباتی باتیں کر کے مَیں اُسے نہایت آہستہ آہستہ اُس کے بیٹے آسی کی طرف لایا۔

اُس نے التجا کے لہجے میں پوچھا — "آپ اُسے قتل کے شک میں پکڑ تو نہیں لیں گے؟"

"اُس بے چارے کا قتل کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے" — مَیں نے ایسے خلوص کے لہجے میں کہا جس میں کوئی خلوص نہیں تھا۔ مَیں اُس وقت پولیس انسپکٹر تھا جس کے سامنے جذبات نہیں اپنا فرض تھا۔ مَیں نے کہا — "مَیں نے آسی کی بات صرف اس لیے چھیڑ دی ہے کہ پہلے خاوند سے تمہارا ایک بچہ پیدا ہُوا۔ دوسرے خاوند سے تم بے اولاد رہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول کو خدا نے یہ وصف دیا ہی نہیں تھا۔ اُس نے دوسری شادی کر کے غلطی کی تھی۔"

"یہ تو مَیں نے بھی اُسے کہا تھا" — اُس نے کہا — "لیکن مَیں اُس کی خواہش رد نہ کر سکی۔ مَیں جانتی تھی کہ دوسری بیوی سے بھی اُس کی اولاد نہیں ہو گی۔ لڑکی والوں نے جائیداد کے لالچ میں لڑکی دے دی تھی۔"

"اب تم تنہا رہ گئی ہو" — مَیں نے کہا — "اگر مجھے تمہارا بیٹا مل جائے تو مَیں اُسے سمجھا بُجھا کر یا ڈرا دھمکا کر تمہارے قدموں میں بٹھا دُوں۔"

"اُسے سمجھانے یا ڈرانے کی ضرورت نہیں" — اُس نے کہا — "وہ مجھ سے نہیں بھاگا، اپنے سوتیلے باپ نے اُسے بھگایا تھا۔ اس معصوم کے ساتھ میرے دوسرے خاوند (مقتول) نے ایسا بُرا سلوک کیا کہ آج بچہ مجھے نظر نہیں آتا۔"

ماں، بچّے اور مقتول کی کہانی

اُس نے اپنے بچّے (آسی) کی اخلاقی تباہی کی داستان یُوں سنائی کہ آسی اپنے

باپ کا پہلا بچہ تھا اس لیے باپ نے اُسے بہت زیادہ پیار دیا۔ بچہ اس پیار کا عادی اور نشئی ہوگیا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ وہ چار سال کا ہُوا تو باپ مر گیا۔ بچے کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ وہ اپنے باپ کو اور اس کے پیار کو ڈھونڈتا تھا۔ ماں نے باپ بننے کی کوشش کی جو بچے کا دل نہ بہلا سکی۔ ڈیڑھ ایک سال بعد اس عورت کی شادی مقتول کے ساتھ کر دی گئی۔ بچہ ساتھ تھا۔ مقتول نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا مگر بچے کا مطالبہ بڑا سخت تھا۔ پہلے پہل مقتول نے بچے کی ماں کی منت سماجت پر بچے کو پیار دینے اور اس کی ہر ضد پوری کرنے کی کوشش کی مگر بچہ سنبھل نہ سکا۔ مقتول آخر پہلا باپ تھا۔ خون کا رشتہ تو نہیں تھا۔ وہ بچے سے تنگ آگیا۔ اُس نے بچے کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ ماں بچے کو سینے سے لگاتی تھی تو بھی کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ دو سال بعد بچے کو سکول داخل کرایا تو اُس نے قیامت کھڑی کر دی۔ اُس زمانے میں تعلیم تو اچھی ہوتی تھی لیکن اُستاد بچوں کو ظالمانہ سزا دیتے تھے۔ بچہ سکول میں روتا یا وہاں سے بھاگتا تھا تو اُسے اُستاد پیٹتا تھا۔ گھر باپ پیٹتا تھا۔ رات بچہ ماں کے ساتھ لگ کر سوتا تھا۔

بچہ گیارہ بارہ سال کا ہوگیا۔ مقتول کی کوئی اولاد نہ ہُوئی۔ اُس نے اپنی بیوی کا علاج شروع کرا دیا۔ آسی اب سیانا ہوگیا تھا اور پوری طرح آوارہ۔ مقتول کے ساتھ اُس کی بول چال بند ہو چکی تھی۔ مقتول نے اُسے دکان پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن آسی اب اُسے پریشان کر کے خوش ہوتا تھا۔ اُسے ماموؤں نے بھی سنبھالنے کی کوشش کی اور اُسے اپنے گھر رکھنا چاہا مگر وہ ماں سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ مقتول کی توجہ اب اس پر لگی ہُوئی تھی کہ اس کی اپنی اولاد ہو۔ آسی کی ماں نے اُسے کہا کہ آسی کو ہی اپنا بچہ سمجھ لو۔ مقتول کو یہ منظور نہ تھا۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں بچہ راتوں کو بھی باہر رہنے لگا۔ دن کو تو اکثر غائب رہتا تھا۔ اس کی پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ مقتول اپنے کاروبار کے لیے نکل جاتا تو آسی اپنی ماں کے پاس

آتا اور چلا جاتا تھا۔ ایک روز مقتول گھر آیا تو آسی گھر میں تھا۔ اُس نے آسی سے کہا کہ وہ یہاں سے نکل جائے اور آئندہ اس گھر میں نہ آئے۔ آسی نے اُسے کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس آتا ہے اور اس گھر کے پانی کے گھونٹ کو بھی حرام سمجھتا ہے۔ اُس کی ماں نے مقتول کی منت کی کہ وہ ایسا ظلم نہ کرے۔ مقتول نے اُسے بتایا کہ اس لڑکے نے سارے خاندان کو بدنام کر دیا ہے۔ اسی عمر میں یہ تکیے پر جاتا ہے، چرس پیتا ہے اور غنڈوں بدمعاشوں کے ساتھ اس کا دوستانہ ہے۔

ماں آخر ماں تھی۔ اُس نے مقتول سے کہا کہ لڑکے کو اس حال تک اُسی نے پہنچایا ہے۔ اس پر میاں بیوی میں تُو تُو مَیں مَیں ہوگئی۔ آسی اب بدمعاشی میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس نے مقتول سے کہا۔ "تم میری ماں کے خاوند ہو میرے کچھ نہیں لگتے۔ اگر تم نے میری ماں کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچائی تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اب ذرا ہوش سے بات کرنا"۔ اور وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔

ماں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا اور اب کہاں رہتا ہے۔ دوسرے تیسرے مہینے مقتول کی غیر حاضری میں ماں کے پاس آتا تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھتا اور پوچھتا تھا کہ اُسے خاوند کی طرف سے کوئی تکلیف تو نہیں۔ ایک روز وہ آیا تو ماں کے منہ سے اپنے خاوند کے خلاف کوئی شکایت نکل گئی۔ شام کو خاوند گھر آیا۔ آسی جا چکا تھا۔ خاوند نے آسی کی ماں کو بتایا کہ آسی دکان پر گیا تھا اور اُسے (مقتول کو) کہ گیا تھا کہ میری ماں کو تنگ کرتے ہو۔ اگر باز نہ آئے تو پچھتاؤ گے۔ مقتول اس سے ڈر گیا تھا۔ آسی کی ماں نے خاوند سے معافی مانگی اور گھر میں سکون رکھنے کی خاطر خاوند سے کہا کہ وہ آئندہ آسی کو گھر میں نہیں آنے دے گی۔ مقتول آسی سے اتنا ڈر گیا تھا کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اُسے گھر میں داخل ہونے سے نہ روکنا۔

اس کے بعد مقتول نے اپنی بیوی کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی۔ آسی دوسرے تیسرے

ملنے آتا رہا۔ دو بار وہ عید سے ایک روز پہلے آیا اور ماں کے لیے کپڑے بھی لایا۔ ماں اُسے سینے سے لگا کر روتی اور پیار کرتی تھی اور اُسے کہتی تھی کہ وہ شریفوں کی طرح رہے تو اُسے اپنے ماموں اپنے ساتھ لگا لیں گے... مگر آسی شریفوں کی زندگی سے دُور نکل گیا تھا۔ مقتول بے اولاد رہا۔ اُس کی اور آسی کی ماں کی جوانی ڈھل گئی۔ آسی پوری طرح جوان ہو گیا۔ پھر وہ دن آیا کہ مقتول نے پچاس سال کی عمر میں دوسری شادی کر لی۔

نئی بیوی کو آئے تین چار دن گزرے تھے کہ آسی آگیا۔ اب وہ چوبیس سال کی عمر کا جوان آدمی تھا۔ اُس نے ماں سے کہا کہ اُس کے خاوند نے اُسے (ماں کو) اس عمر میں آکر دُکھ دیا ہے جسے آسی برداشت نہیں کر سکتا۔ ماں نے اُسے بہت سمجھایا کہ مقتول نے اُس کی مرضی سے دُوسری شادی کی ہے کیونکہ وہ اولاد چاہتا ہے۔

آسی ٹھنڈا نہ ہُوا۔ اُس نے نئی بیوی سے کہا ——— "تم اگر اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤ تو تمہارے لیے اچھا رہے گا۔ جب تک میری ماں زندہ ہے میں تمہیں یہاں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر مجھے پہلے پتہ چل جاتا تو میں تمہارے ماں باپ کو روک دیتا۔ تم بے گناہ ماری جاؤ گی۔"

نئی بیوی رو پڑی۔ اُس نے کہا کہ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ اُس نے اپنے ماں باپ کا حکم مانا ہے۔ آسی چلا گیا تو اُس کی ماں نے نئی بیوی کی منت سماجت کی کہ وہ خاوند کو نہ بتائے کہ آسی آیا تھا اور یہ دھمکیاں دے گیا ہے۔ مگر آسی دکان پر چلا گیا اور مقتول کو بھی دھمکیاں دے آیا۔ مقتول بہت پریشان تھا۔

"اس کے بعد میں نے آسی کو نہیں دیکھا۔" اس کی ماں نے جذبات کی روانی میں ساری داستان سنا کر کہا ——— "اُسے پتہ چل جاتا کہ اس کی ماں اُجڑ گئی ہے تو وہ اُڑ کر پہنچتا۔"

پردے اُٹھنے لگے

مجھے شک ہُوا کہ اس مقام پر آکر اس عورت نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کی جو کہانی سنائی ہے وہ سو فی صد سچ ہے۔ اُس نے کئی باتوں پر پردہ ڈالا ہو گا اور کچھ اضافے بھی کیے ہوں گے۔ اُس نے سب سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا ——— "آپ اُسے قتل کے شک میں پکڑ تو نہیں لیں گے؟"

وہ آخر بڑی عمر کی عورت تھی۔ اس میں ممتا کے علاوہ اتنی عقل بھی تھی کہ اپنے بیٹے پر شک نہ ہونے دے۔ میرے دل میں شک پیدا ہو چکا تھا جو اس عورت نے پکا کرنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ آسی قتل سے ایک روز پہلے اور اس سے بھی پہلے شہر میں دیکھا گیا تھا۔ یہ ثبوت بھی مل چکا تھا کہ وہ شہر میں نہیں کہیں دُور رہتا ہے۔ ماں کے ساتھ اس کا پیار بہت شدید تھا۔ میں نے ماں کا بیان بہت مختصر کر کے سنایا ہے۔ اگر تفصیل سے سُناتا اور اُس نے جو واقعات سُنائے تھے، وہ بھی سُناتا تو آپ حیران رہ جاتے کہ ایسا آوارہ آدمی ماں کی کس طرح پُوجا کرتا تھا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ آدمی اپنی ماں کی ذرا سی تکلیف پر کئی قتل کر سکتا تھا۔

میرے پیشِ نظر یہ بھی تھا کہ اس کے اندر ظُلم اور اذیت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ نفسیاتی مریض تھا۔ عادی مجرم جن میں ڈاکو اور قاتل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، انہی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں جن میں آسی نے پرورش پائی تھی۔ وہ تخریب اور تباہ کاری کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جرائم پیشہ گروہ کے ساتھ رہ کر جوان ہُوا تھا اور وہ چرس بھی پیتا تھا جو سوچنے کی صلاحیت کو ختم کر دیتی ہے۔

میں نے اُس کی ماں سے تفتیش کے انداز سے پوچھ گچھ شروع کی تو میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ غلط جواب دے رہی ہے۔ اُس کے بعض جواب گول مول تھے اور بعض اس طرح ادھورے کہ آدھا جواب [illegible] میں بڑبڑا کر غائب کر دیتی تھی۔

اُس کے اس رویے نے مجھے اتنا پریشان کر دیا کہ میں نے اُسے جھنجھلا کر کہا — "اگر تمہیں اپنے بیٹے کا اتنا زیادہ خیال تھا تو پہلے ہی کہہ دیتیں کہ وہ لڑکپن میں گھر سے غائب ہُوا اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ اب جو میں پوچھتا ہوں وہ صحیح صحیح بتا دو، ورنہ میں اُسے خود پکڑ لوں گا اور تم ساری عمر پچھتاتی رہو گی۔"

یہ دراصل میری اُستادی کا نتیجہ تھا کہ وہ میری جذباتی باتوں میں آگئی اور اپنے بیٹے کی کہانی سنا بیٹھی تھی۔ اب اُسے شک ہو گیا تھا کہ میں اس کے بیٹے کو قتل کے جرم میں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔

"اگر وہ تمہیں پرسوں ترسوں ملا بھی تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قتل اُسی نے کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر آپ کیوں بار بار پوچھتے ہیں؟" — اُس نے کہا — "میں جو کہتی ہوں کہ اُس نے قتل نہیں کیا۔ وہ گھر میں آیا ہی نہیں۔"

"میں کس طرح مان لوں؟" — میں نے کہا — "میرے پاس گواہیاں ہیں جو بتاتی ہیں کہ قتل کے روز اور اس سے ایک روز پہلے وہ یہاں تھا اور وہ تمہیں ملا ہے۔"

اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا اور عجیب سی مسکراہٹ سے بولی — "ماں سُولی چڑھ جائے گی اپنے بچے کو ہتھکڑیوں میں نہیں دیکھے گی۔"

یہ الفاظ اُس نے جذباتی ہو کر کہے تھے لیکن میرے لیے بڑے قیمتی تھے۔ اس کے

بعد میں نے اس کے منہ سے کام کی کوئی ایک دو باتیں نکلوانے کے لیے سوالوں کی جو بوچھاڑ کی اس میں اُس نے میری یہ توقع تو پوری نہ کی کہ کوئی نشاندہی کر دیتی۔ البتہ اُس نے جس انداز سے جواب دیئے اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے یہ شک بھی ہُوا کہ اپنے خاوند کو اُس نے خود اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل کرایا ہے۔ وہ کوئی جرائم پیشہ یا مُخبر عورت نہیں تھی۔ میں نے اُس پر دہشت پیدا کرنے کے لیے اُسے کہا کہ وہ دو چار روز تھانے میں ہی رہے گی۔ اسے بھی میں گرفتار نہیں کر سکتا تھا اور چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُسے الگ بٹھا دیا۔ گھریلو عورت کے لیے تھانے میں بیٹھنا ہی بہت بڑی سزا ہے، مگر مجھے اب یہ ثبوت نہیں مل رہا تھا کہ یہ عورت واقعی شریف ہے۔

میں کمرے سے باہر نکلا۔ اس عورت کا دوسرا بھائی آیا ہُوا تھا۔ ایک کو تو میں نے مُشتبہ بٹھا رکھا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی آگیا تھا جو دوسری بیوی کی سہیلی سے پوچھنے گیا تھا کہ اُس نے اُسے کوئی پیغام بھیجا تھا یا نہیں۔

اس سہیلی نے بتایا کہ اُس نے ایسا کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا کہ وہ (دوسری بیوی) شام کے بعد اُس کے گھر آئے اور کسی کو ساتھ نہ لائے کیونکہ کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ شبّو کو نام اور شکل سے جانتی پہچانتی ہے وہ اس کے گھر نہیں آتی تھی۔ اگر ضرورت ہوتی بھی تو وہ اس کی زبانی اپنی کسی بھی سہیلی کو پیغام نہ دیتی کیونکہ ابا جان نے گھر والوں سے کہہ رکھا ہے کہ شبّو بدنام اور بدکار عورت ہے، اسے گھر میں نہ بیٹھنے دیا کرو۔

یہ بیان سُن کر میں پہلی بیوی (آسی کی ماں) کے بھائی کی طرف متوجہ ہُوا۔ اُس کے آنے کی وجہ صاف تھی۔ اس کا ایک بھائی پہلے ہی تھانے میں تھا۔ اب میں نے اس کی بہن کو بھی بلا لیا تھا اور رات خاصی گزر گئی تھی۔ یہ بھائی مولوی قسم کا شریف انسان تھا۔ بہت ہی

پریشان تھا۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ان دونوں کو تفتیش کے سلسلے میں روکا ہُوا ہے اور مَیں کہہ نہیں سکتا کہ کب تک روکے رکھوں گا۔ اس سے مَیں نے پوچھا کہ آسی کو اس نے پرسوں ترسوں یہاں دیکھا ہوگا۔ مَیں نے اُسے کہا ــــ "مَیں نے سُنا ہے کہ آسی غنڈوں بدمعاشوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ وہ اگر کوشش کرے تو قاتل کا اور دوسری بیوی کا سراغ لگا سکتا ہے۔"

مَیں نے کچھ اور باتیں بھی کیں جن سے یہ سیدھا سادا سا آدمی میرے جال میں آگیا۔

"ہم تو جی آسی سے منہ لگاتے بھی شرماتے ہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "ہم میں سے کسی کو بھی علم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس حادثے سے دو روز پہلے وہ مجھے ملا تھا۔ پریشان سا نظر آتا تھا۔ کہتا تھا کہ ماں کی زندگی اس شخص (مقتول) نے تباہ کر دی ہے۔ آسی نے مجھے بھی لعن طعن کی تھی اور کہا تھا کہ تم اُس کے دو بھائی ہو اور ایک آدمی کو نہیں سنبھال سکے۔ مجھے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ماں سے مل آیا ہے اور اُس کے خاوند سے بھی ملا ہے۔"

مَیں نے اُسے تسلی تشفی دے کر بھیج دیا اور اُس کے دوسرے بھائی کے پاس گیا جسے میں نے مشتبہ بٹھا رکھا تھا۔ اُس سے آسی کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بھی وہی کہانی سُنائی جو مَیں سن چکا تھا۔ اس شخص کا دماغ ٹھکانے آ چکا تھا۔ وہ منت سماجت پر اُتر آیا تھا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ آسی دو روز پہلے آیا تھا اور اُسے بھی ملا ہوگا۔

اُس نے فوراً بتا دیا کہ ملا تھا۔ اسے بھی آسی نے وہی باتیں کہی تھیں جو اُس نے اپنے دوسرے ماموں سے کہی تھیں۔ اس آدمی نے یقین سے کہا کہ آسی اپنی ماں کے پاس گیا تھا اور غُصّے میں تھا۔ اُس نے یہ الفاظ کہے تھے ــــ "تم دونوں بھائی بُزدل اور بے غیرت ہو۔ ایک

آدمی کا دماغ دُرست نہیں کر سکتے۔"

"اب یہ بھُول جاؤ کہ آسی تمہارا کچھ لگتا ہے" ــــ مَیں نے کہا ــــ "مجھے یہ بتاؤ کہ آسی میں اتنی ہمّت ہے کہ وہ کسی کو قتل کر دے؟"

"جناب یہ نہ سمجھیں کہ مَیں اپنی جان چھڑانے کے لیے کہہ رہا ہوں" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "آسی کے اندر زہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُسے قریب نہیں آنے دیتے۔ وہ ایک نہیں ایک درجن آدمیوں کو قتل کر سکتا ہے، لیکن ایک شرط ہے کہ اسے یہ کہہ دو کہ یہ ایک درجن آدمی تمہاری ماں کے دشمن ہیں۔ اپنی ماں کے خلاف ہمارے منہ سے کبھی بات نہیں سُنتا۔"

اُس نے کئی ایک واقعات سُنائے۔ مَیں صرف یہ سُننا چاہتا تھا کہ آسی قتل سے پہلے شہر میں آیا تھا۔ یہ مَیں نے سن لیا اور شبّو کو اپنے دفتر میں بلایا۔

پردے اُٹھنے لگے تھے۔ اب شبّو مجھے چکمہ نہیں دے سکتی تھی۔

اندھے خاوند کی بیوی مان گئی

شبّو نے میرے سامنے آتے ہی دوستانہ بے تکلفی کی باتیں شروع کر دیں جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ مَیں نے اُسے مایوس نہیں کیا۔ دوستانہ بے تکلفی سے ہی مَیں نے اس سے پوچھا۔

"کیا نام ہے اُس لڑکی کا جس کا پیغام لے کر تم مقتول کی دوسری بیوی کے پاس گئی تھیں؟"

اُس نے جواب تو نہ دیا۔ لاعلمی کے اظہار کے لیے چہرے پر حیرت کا تاثر پیدا کر کے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔

مَیں نے ہنس کر کہا ــــ "شبّو! جانے دو۔ آؤ اب کام کی باتیں کریں۔ ناٹک کھیلنا چھوڑ دو۔ تم اکیلی کتنے آدمیوں کو جھٹلاؤ گی۔ اب میری تمہاری باتیں ہوں گی۔ کہو سلطانی گواہ بنتی ہو؟"

"اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مَیں ساری واردات میں شامل ہوں"۔ اُس نے کہا۔ "مَیں نے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کیا کہ لڑکی کو گھر سے باہر نکالنے کی ترکیب کی اور اسے ایسے راستے پر ڈالا تھا جہاں اسے اُٹھا لے جانے والے موجود تھے۔ آپ مجھے گواہ نہیں بنا سکتے"۔

وہ مجھے اور پولیس کو جانتی تھی اور اُس نے دیکھ لیا تھا کہ اب اُس کا جھوٹ ننگا ہو گیا ہے اور میرا بچنے کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ مجھ سے اب رحم اور رعائت چاہتی تھی جو مَیں دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں، مرا پیشہ کیا ہے اور مَیں نے کیوں یہ ذلیل پیشہ اختیار کیا تھا"۔ اُس نے کہا۔ "مَیں نے آپ کے لیے جھوٹ بولے ہیں اور آپ کا کام آسان کیا ہے۔ اب آپ میرے اندھے خاوند پر رحم کریں اور مجھے اس چکر سے نکالیں"۔

اُس نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ اُس نے میرے لیے بہت جھوٹ بولے تھے۔ مُخبری اور سراغ رسانی کے لیے ایکٹنگ بھی کرنی پڑتی ہے اور جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں۔ شبّو کا خاوند شادی کے چھٹے ساتویں سال چیچک کا شکار ہو گیا۔ اُس کی جان تو بچ گئی، دونوں آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ اُس وقت اس کے دو بچے تھے۔ یہ شبّو کا کمال تھا کہ اس نے بچوں کی روزی اپنے ذمے لے لی اور اسے جیسی کیسی محنت مزدوری ملی اس نے کر لی اور اپنی عزت کی بھی حفاظت کی۔ اب اس کے چار بچے تھے اور عمر تیس سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ چار ایک سال سے اُس نے مخبری کا کام سنبھالا تھا۔ اس کام میں اُس نے مہارت حاصل کر لی۔ بدنامی قدرتی بات ہے۔ اس کی چرب زبانی اور ایکٹنگ نے اسے بدنام کر رکھا تھا لیکن اُس نے اپنے خاوند کو دھوکہ نہیں دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے ایک واردات میں مجرم کی مدد دی اور مجھے چکر دینے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے صاف بتا دیا کہ اُدھر سے

(مجرموں سے) اسے زیادہ رقم ملی تھی۔ کام صرف یہ تھا کہ لڑکی (مقتول کی نئی بیوی) کو اس کی کسی ایسی سہیلی کا پیغام دینا تھا جس کے بلاوے کو وہ ٹال نہ سکے۔ شبّو نے یہ کمال کر دکھایا کہ پہلے یہ معلوم کیا کہ دوسری بیوی کی سب سے زیادہ عزیز سہیلی کون سی ہے۔ پھر اس نے پیغام ایسا دیا کہ لڑکی شام کے بعد گھر سے نکل گئی۔

لڑکی کو اُٹھا لے جانے والے دو آدمی تھے۔ ایک آسی اور ایک اس کا ساتھی۔ شبّو آسی کو جانتی تھی۔ یہ شبّو کی ڈیوٹی میں شامل تھا کہ زیادہ سے زیادہ جرائم پیشہ اور مُشتبہ کردار کے افراد سے اس کی واقفیت ہو۔ اسی سلسلے میں اس کی مُلاقات آسی سے ہوئی تھی۔ شبّو کو معلوم تھا کہ آسی کون ہے اور اب کیا کرتا ہے۔ شبّو نے مجھے اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ قتل سے دو تین روز پہلے اسے آسی ملا تھا۔ اُس نے شبّو کو اعتماد میں لے کر کہا تھا کہ وہ اپنے سوتیلے باپ کی دوسری بیوی کو غائب کرنا چاہتا ہے۔ اس نے شبّو سے مدد مانگی اور خاصی رقم پیش کی تھی۔ شبّو نے اس کی ماں کے ہاں جا کر معلوم کیا اور آسی کو بتایا تھا کہ دوسری بیوی میکے گئی ہوئی ہے اور دو چار روز بعد واپس آئے گی۔ دوسرے دن آسی اسے پھر ملا اور بتایا کہ آج شام کے بعد وہ دو وارداتیں کرے گا۔ اس نے دوسری واردات کے متعلق شبّو کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا ہو گی۔

آسی کے متعلق مجھے اپنے قصبے کے جرائم پیشہ افراد نے بتایا تھا کہ وہ ابھی بڑی واردات کرنے کے قابل نہیں ہُوا اور وہ استادوں کی صرف مدد کرتا ہے لیکن جس چابکدستی اور استادی سے اُس نے بیک وقت دو وارداتیں کیں انہوں نے مجھے منوا لیا کہ آسی پختہ کار اُستاد ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تھانے کے ریکارڈ پر نہیں تھا اور ابھی تک وہ کسی واردات میں گرفتار نہیں ہُوا تھا۔ اُس کا گروہ مضبوط تھا جو شاید اسے پہلی وارداتوں میں محفوظ رکھتا رہا ہو۔ اس

کی ان دو وارداتوں کی میں باریک تفصیلات سُنانے سے گریز کروں گا کیونکہ یہ بہت طویل ہیں اور طوالت کے علاوہ میں کسی کو وارداتیں کرنے کی ٹریننگ نہیں دینا چاہتا۔ اُس نے دونوں کے اوقات کی ایسی پابندی کی ... نوں میں کامیاب رہا۔

شبو نے بتایا کہ اسے ... ہے کہ اُس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ اُس نے اسے نہیں دیکھا۔ اُس نے لڑکی کو ... اس کی سہیلی کا جھوٹا پیغام دیا جو اس قسم کا تھا کہ وہ کوئی ذاتی بات کرنا چاہتی ہے اور کہتی ہے کہ اکیلی آنا۔ وہ گہری اور ہمراز سہیلیاں تھیں شبو نے ایسے انداز سے اس جال میں ... تھا کہ لڑکی اندھیرے راستے پر چلی گئی اور واپس نہ آسکی

دوسرے دن شبو کو پتہ چلا کہ اس لڑکی کا پچاس سالہ خاوند بھی قتل ہو چکا ہے۔ اسے یاد آیا کہ آسی نے اُسے کہا تھا کہ وہ دو وارداتیں کرے گا۔ اُسے یقین تھا کہ قتل بھی اُسی نے کیا ہے۔ میں نے شبو کو جرح اور سوال در سوال کی چکی میں پیسنا شروع کیا۔ بہت زیادہ وقت صرف کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ قتل کی واردات میں ملوث ہونے سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر جو کچھ وہ بتا چکی تھی اس سے زیادہ میں اس سے نہ اگلوا سکا۔ مقدمہ قائم کرنے کے لیے مجھے جن باتوں کی ضرورت تھی وہ معلوم کر لیں۔

اب میرے سامنے یہ سوال تھا کہ ان دونوں وارداتوں میں آسی کی ماں کا بھی ہاتھ ہے یا نہیں۔ یہ شک بھی تھا کہ آسی کے اس ماموں کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے جسے میں نے مشتبہ بٹھا رکھا تھا۔ مجھے آسی کو بھی ڈھونڈنا تھا۔ یاد نہیں کہ یہ قتل اور اغوا کے بعد کا چوتھا دن تھا یا زیادہ دن گزر گئے تھے۔ میرے پاس مصدقہ پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی۔ ماہرین نے لکھ دیا تھا کہ موت حرکتِ قلب بند ہونے سے نہیں سانس رُکنے سے واقع ہوئی ہے اور قتل کھانے کے ڈیڑھ یا دو گھنٹے بعد ہُوا ہے۔

میں نے آسی کی ماں کو اُس مخصوص کمرے میں بٹھا لیا جہاں پتھر بھی بول پڑتے تھے۔ میں نے اُسے کہا کہ اب اسے دل کے بھید باہر لانے ہی پڑیں گے۔ وہ کہہ چکی تھی کہ قتل سے ایک دو روز پہلے آسی اُس کے پاس نہیں آیا تھا اور اُسے دیکھے بہت عرصہ گزر گیا ہے۔ وہ ابھی تک اسی بیان پر قائم تھی۔ میں نے اپنے اے۔ایس۔آئی سے کہہ دیا کہ وہ ضرورت کے مطابق پارٹی لے جائے اور آسی کو تلاش کرے۔ آسی کے گروہ کے ٹھکانے کا کچھ اتا پتا معلوم ہو گیا تھا۔ دو راہنماؤں کا انتظار تھا۔ وہ ابھی نہیں آئے تھے۔ انہیں ایک گاؤں سے آنا تھا۔

میں نے آدھی رات کے کچھ دیر بعد تک مقتول کی پہلی بیوی سے پوچھ گچھ جاری رکھی۔ اُس کی حالت بہت ہی بُری ہو چکی تھی۔ میں نے اس پر کوئی تشدد نہیں کیا۔ ... ہی اذیت اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی جس میں وہ مبتلا تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ برداشت کر رہی تھی۔ ... ممتا کی قوت تھی۔ اگر آسی اس کا بیٹا نہ ہوتا تو وہ فوراً اقبالِ جرم کر لیتی۔ آخر اس نے یہ کہنا شروع کر دیا — "میرے بیٹے کو مت ڈھونڈو۔ مجھے سولی پر لٹکا دو" — اُس پر غشی کی کیفیت بھی طاری ہو رہی تھی۔ اس حالت میں بھی وہ میرے مطلب کی بات منہ سے نہیں نکال رہی تھی میری اپنی حالت بگڑ رہی تھی۔ تھکن نے جسم اور دماغ کو بیکار کر دیا تھا۔ میں نے اسے اسی کمرے میں سونے کو کہا اور ایک کانسٹیبل کو پہرے پر کھڑا کر دیا۔ ابھی میں اسے حوالات میں بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں گھر جا کر سو گیا۔

ماں کی محبت اُسے لے آئی

اگلے روز دفتر میں پہنچا۔ اے۔ایس۔آئی اپنی پارٹی کے ساتھ روانہ ہونے والا تھا۔ دونوں راہنما رات کو ہی آگئے تھے۔ میں اس پارٹی کو ہدایات دے رہا تھا کہ ایک جوان آدمی

برآمدے میں داخل ہوا۔ جسم بھرا بھرا تھا اور چہرہ بتاتا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ”میری ماں کو چھوڑ دو اور مجھے گرفتار کر لو۔ تم نے مجھے گرفتار کرنے کا بڑا اچھا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اگر تم میری ماں کو تھانے نہ بلاتے تو تم سب میری گرد کو بھی نہ دیکھ سکتے۔“

”تم آسی ہو؟“ ۔۔ میں نے پوچھا۔

”ہاں میں آسی ہوں“ ——— اُس نے جواب دیا —”اپنے سوتیلے باپ کو میں نے قتل کیا ہے اور اُس کی نئی بیوی کی لاش نکال کر رکھ آیا ہوں۔ میری ماں کو میرے سامنے رہا کر دو، ورنہ تمہارے ہاتھوں مر جاؤں گا بتاؤں گا کچھ بھی نہیں۔“

میں اسے اپنے دفتر میں لے گیا۔ بٹھایا اور اسے کہا کہ میں نے اس کی ماں کو شک میں روکا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ میں تمہارے تمام شکوک رفع کر دوں گا۔ میری ماں کو چھوڑ دو۔

میں نے اس کی ماں کو بلوایا۔ وہ آئی تو اپنے بیٹے کے ساتھ لپٹ گئی۔ آسی نے کہا۔ ”تم گھر جاؤ امی! میں تمہیں چھڑانے آیا ہوں۔“

میں نے دخل اندازی نہ کی۔ ماں بھاگ کر کہاں جا سکتی تھی۔ وہ وہاں سے جا ہی نہیں رہی تھی۔ کہتی تھی کہ بیٹے کے ساتھ جاؤں گی۔ میں نے اسی بہانے اسے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔

آسی نے مجھے کہا —”تم نے میرے ایک ماموں کو بھی بٹھا رکھا ہے۔ اسے بھی چھوڑ دو۔ وہ تو بے غیرت اور بزدل آدمی ہے۔ وہ کسی کو کیا قتل کرے گا۔ اسے بھی بلاؤ۔“

”سنو آسی!“ —— میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا —”پولیس کپتان بننے کی کوشش نہ کرو۔ مجھ پر حکم چلانے آئے ہو؟ میری ماں کو چھوڑ دو۔ میرے ماموں کو چھوڑ

دو۔ تم تھانے میں بیٹھے ہو۔ کہاں کے اُستاد ہو؟ میں تمہاری ماں کو حوالات میں بند کروں گا۔ ثبوت پہلے ہی میرے پاس ہے۔ تمہارے خلاف شہادت مکمل ہے۔ یہ دونوں وارداتیں تمہاری ماں نے تم سے کرائی ہیں۔ تم مجھے کچھ بھی نہ بتاؤ۔ تم اس وقت نہ آتے تو کل اس وقت ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے میرے پاس آ جاتے۔ تمہاری ماں کو میں عمر قید دلاؤں گا۔“ میں دانستہ اس کی ماں پر زور دے رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ شخص اپنی ماں کو چھڑانے کے لیے خود ہی اقبالِ جرم کرنے آگیا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی پوجا کرتا ہے۔ اپنی ماں کی خاطر وہ اپنے آپ کو پھانسی چڑھانے کے لیے آگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے اقبالی بیان لکھوانا شروع کر دیا۔ اُس نے اپنے بچپن کے وہی حالات سنائے جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ سوتیلے باپ نے اُس پر جو ظلم کیے وہ بھی آپ کو سنا چکا ہوں۔ اس شخص کے خلاف آسی کے دل میں اتنی نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ اسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ اسی کے مظالم نے اسے گھر سے بھگایا تھا۔ وہ پہلے آوارہ لڑکوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا رہا، پھر وہ جواریوں کی منڈلی میں گیا اور وہاں سے وہ رہزنوں اور ڈکیتوں کے ایک گروہ میں جا شامل ہوا۔ شہر میں وہ کبھی کبھار آیا کرتا تھا۔ وہ صرف ماں سے ملنے آتا تھا۔ اس دوران سوتیلے باپ کے ساتھ اس کی جھڑپ بھی ہوئی۔ اُس نے کہا —”دنیا میں صرف ماں ہے جسے میں خدا اور رسولؐ کے بعد کا درجہ دیتا ہوں۔ سوتیلا باپ واحد انسان تھا جسے میں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور دنیا کا کوئی انسان مجھے بُرا نہیں لگتا۔“

اس نے اپنی کسی واردات کا ذکر نہیں کیا۔ اپنے گروہ کی نشاندہی نہ کی۔ اُس کی سرگرمیاں بھی نہ بتائیں۔ اس نے کہا کہ وہ ڈیڑھ دو مہینے گزرے ماں سے ملنے آیا تو ماں نے اسے بتایا کہ اس کا سوتیلا باپ دوسری شادی کر رہا ہے۔ آسی کو بہت غصہ آیا۔ وہ سوتیلے

باپ سے مِلا اور اُسے شادی سے روکا۔ پھر اُسے دھمکی بھی دی۔ آخر سوتیلے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ آسی شادی کے بعد ماں کو دیکھنے آیا تو ماں رو پڑی۔ یہ آسی کی برداشت سے باہر تھا۔ اُس نے نئی بیوی کو بھی دھمکی دی۔ ماں نے اسے کہا تھا کہ اس کے سوتیلے باپ نے اس کی مرضی سے شادی کی ہے، اور ماں کو کوئی شکایت نہیں لیکن آسی کے دل میں ماں کے آنسو بیٹھ گئے تھے۔

اُس نے قتل کی سکیم اُسی وقت بنانی شروع کر دی تھی۔ اُس نے کئی طریقے سوچے مگر کامیاب ہوتا کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ کسی کی معرفت اس کی ملاقات شبو سے ہوگئی۔ شبو بھی جرائم پیشہ لوگوں کی پُراسرار دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ شبو کے متعلق اسے بتایا گیا کہ اپنے اندھے خاوند اور بچّوں کے لیے پاپڑ بیل رہی ہے۔ آسی کو شبّو اچھی لگی۔

قتل سے دو تین روز پہلے آسی پھر شہر آیا۔ ماں کے پاس گیا۔ باتوں باتوں میں ماں نے اسے بتایا کہ فلاں رات وہ فلاں گھر شادی پر جا رہی ہے۔ دوسری بیوی کے متعلق اُسے پتہ چلا کہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ آسی کو اتنی خوشی ہوئی جیسے وہ اسی رات کے انتظار میں تھا۔ وہ اپنے اُستاد کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ یہ حالات ہیں اور وہ اپنے سوتیلے باپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔

اُستاد نے اس کی ساری کہانی سُن کر ایک تو اسے قتل کا طریقہ بتایا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ دوسری بیوی کو اگر غائب کر سکو تو لوگ اور پولیس یہ یقین کر لے گی کہ دوسری بیوی اپنے بوڑھے خاوند کو قتل کر کے یا کرا کے اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ آسی کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ وہ اگلے روز شہر میں آیا۔ شبو سے ملا۔ اُس کے ساتھ یہ سکیم بنائی کہ وہ نئی بیوی کو شام کے بعد گھر سے باہر لے آئے۔ اُس نے شبو کو کچھ رقم نقد دی اور باقی

رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا۔

اُس نے انتقام لے لیا

شبّو نے یہ کمال کر دکھایا۔ آسی نے اُسے بتایا تھا کہ آج رات اُس کی ماں شادی کی کسی رسم پر جا رہی ہے اور اُس کا سوتیلا باپ صحن میں اکیلا سویا ہُوا ہوگا۔ آسی نے اپنے گروہ کے ایک ہوشیار دوست کو ساتھ لیا اور اسے یہ سکیم بتائی۔ اس کا دوست تیار ہو گیا۔ اسے آسی نے لڑکی کے اغوا کا کام دیا اور اسے بتایا کہ اسے کہاں گھات لگانی ہے۔ قصبے کا معاملہ تھا۔ لوگ جلدی سو جاتے تھے۔ آبادی کی یہ بھرمار نہیں تھی جو آج ہے۔ شبو نے اُسے بتایا کہ وہ دوسری بیوی کو پیغام دے آئی ہے۔

شام کے بعد آسی نے ایک جگہ چھپ کر دیکھا۔ اُسے اپنی ماں شادی والے گھر جاتی نظر آئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے گھر کے باہر والے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ باہر والی دیوار کی طرف گیا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس وقت وہ چرس والا سگریٹ پی رہا تھا۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ وہ گھوم کر دوسری طرف گیا۔ سگریٹ دیوار کے ساتھ بجھا کر پھینک دیا۔ جُوتے اتارے اور دیوار پر پاؤں جما کر چڑھ گیا۔ سر اُوپر کر کے اُس نے صحن میں دیکھا۔ اُس کا سوتیلا باپ سویا ہُوا تھا۔ آسی دیوار سے کُودا نہیں تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ وہ پاؤں جما کر دیوار سے اُترا۔

سوئے ہوئے سوتیلے باپ کے سرہانے کی طرف جا کر اُس نے ساتھ والی چارپائی سے تکیہ اُٹھایا اور سوتیلے باپ کے منہ پر رکھ کر اُوپر اس طرح بیٹھ گیا کہ دونوں گھٹنے تکیے کے اُوپر رکھے اور ہاتھ اپنے شکار کے سینے پر رکھ کر جسم کا پُورا وزن ڈال دیا۔ مقتول بہت

تڑپا۔ وہ جب بے حس ہوگیا تو آسی نے اس کی نبض اور دل کی حرکت دیکھی۔ یہ یقین کر کے کہ وہ مرگیا ہے اُس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ گھوم کر وہ پھر دیوار کی طرف گیا۔ جوتے پہنے اور بہت تیز چلتا برساتی نالے کے پار دوسری بیوی کی آبادی میں گیا۔ اس لڑکی کی قسمت بہت ہی بُری تھی۔ وہ شام ہوتے ہی گھر سے نکلنے کی بجائے دیر سے نکلی۔ اتفاق دیکھیں کہ وہ اُس وقت اُس جگہ پہنچی جہاں اسے اغوا ہونا تھا جب آسی بھی پہنچ چکا تھا۔ آسی نے لڑکی پر کھیس پھینکا، پھر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر انہوں نے لڑکی کو اُٹھا لیا۔

آبادی سے دُور جا کر انہوں نے لڑکی کو چلنے پر مجبور کیا۔ صبح تک وہ لڑکی کو اپنے خفیہ ٹھکانے تک پہنچا چکے تھے۔ آسی کو اپنی ماں کے متعلق فکر تھا۔ وہ اگلی شام شہر میں آیا اور پولیس کی سرگرمی دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک مخبر کو بھی استعمال کیا تھا۔ پھر اسے پتہ چلا کہ اس کی ماں کو تھانے بلایا گیا ہے۔ اُس نے تھانے پر نظر رکھی۔ میرے کسی مخبر نے اُسے بتایا تھا کہ اس کی ماں کو شک میں حراست میں لے لیا گیا ہے اور تھانیدار کہتا ہے کہ خاوند کو اس عورت نے قتل کیا ہے۔ اس نے کسی کی معرفت میرے کسی کانسٹیبل سے ماں کے متعلق پتہ کرایا۔ کانسٹیبل نے اُسے بتایا کہ اس کی ماں اب بچ نہیں سکتی۔ وہ تفتیش کے کمرے میں ہے اور بہت بُری حالت میں ہے۔ آسی نے رات کے وقت لڑکی کا گلا گھونٹ کر اُسے مار دیا اور ایک کھوہ میں لاش رکھ کر آگے خاردار جھاڑیاں اور درختوں کی ٹہنیاں رکھ دیں۔ صبح وہ میرے پاس پہنچ گیا۔

مَیں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ جنگل میں جا کر لڑکی کی لاش برآمد کی اور آسی کو مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی بیان دینے کے لیے تیار کیا۔ اُس نے مقدمہ تیار کرنے میں میری پُوری مدد کی اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ ان دونوں وارداتوں کا اس کی ماں کو یا کسی ماموں کو علم نہیں تھا۔

مَیں نے اس کی ماں کو چھوڑ دیا۔ ماموں کو بھی چھوڑ دیا، اور مَیں نے آسی سے کہا کہ مَیں شبّو کو بھی چھوڑنا چاہتا ہُوں۔ وہ جس خلوص سے اپنے اندھے خاوند کی خدمت کر رہی تھی اور جس طرح بچوں کو پال رہی تھی مَیں اس کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا۔ آسی بہت خوش ہُوا۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنے بیان میں یہ بتائے گا ہی نہیں کہ شبّو کو لڑکی کے اغوا میں استعمال کیا گیا تھا، بلکہ کہے گا کہ لڑکی کو گھر سے اُٹھانا تھا لیکن اتفاق سے وہ راستے میں مل گئی۔ اُس نے مجھ سے یہ شرط منوائی کہ اس کے ساتھی کو مقدمے میں شامل نہ کیا جائے۔

اُس نے عدالت میں جا کر بھی مجھے پریشان نہ کیا۔ سیشن کورٹ نے اسے سزائے موت سنائی جو اپیل میں بھی برقرار رہی اور ایک صبح آسی کو پھانسی چڑھا دیا گیا۔

ماتا کے سپوت

ایک ایک چاقو دونوں کے
پاس تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن
چلے گئے۔ انہیں بہن اُس وقت
نظر آئی جب گاڑی چل پڑی۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

یہ واردات، دوسری جنگِ عظیم سے چند ماہ پہلے کی ہے۔ مَیں عارضی طور پر سی آئی ڈی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ یہ عام قسم کی سی۔آئی۔ڈی نہیں تھی بلکہ اس محکمے کے اندر ایک اور شعبہ بنایا گیا تھا جس کا رابطہ ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ بھی تھا۔ آپ شاید سُن کر حیران ہوں گے کہ عام پولیس بھی اس شعبے سے ناواقف تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت عرصے سے ہندوستان میں خفیہ تحریکیں چل رہی تھیں جنہیں دہشت پسند کہا جاتا تھا۔ ان میں ہندو بھی تھے، مسلمان اور سکھ بھی۔ ان تحریکوں کا مقصد یہ تھا کہ انگریز کو دہشت زدہ کر کے ہندوستان سے نکالا جائے۔ ابتدا میں ان میں بنگالی زیادہ تھے۔ بعد میں ہندوستان کے کئی اور صوبوں کے لوگ ان میں شامل ہو گئے تھے۔ پنجابی جوشیلے جوانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی خفیہ سرگرمیاں قابلِ تعریف تھیں۔ انہوں نے وائسرائے کو ہلاک کرنے کے لیے اُس کی ریل گاڑی کے نیچے بم رکھے تھے۔ کئی اور اہم جگہوں پر بم رکھے اور انگریزوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان میں سے جو پکڑا جاتا تھا وہ سیدھا پھانسی کے تختے پر جاتا تھا لیکن انہیں پکڑنا آسان نہیں تھا۔ ان کا طریقۂ کار نہایت خفیہ تھا۔ ان کا آپس میں پشاور سے کلکتہ تک رابطہ تھا۔

مَیں آپ کو دہشت پسند تحریکوں کے بے شمار حیران کُن واقعات سُنا سکتا ہوں لیکن میری

کہانی ان سے مختلف ہے۔ انہی لوگوں کی سراغرسانی اور گرفتاری کے لیے ایک تو سی آئی ڈی کا محکمہ تھا۔ دوسرا سول انٹیلی جنس کا اور تیسرا ملٹری انٹیلی جنس کا، اور اسی کے اندر انگریزوں نے ایک اور شعبہ بنا دیا تھا جس میں زیادہ تعداد انگریز پولیس افسروں کی تھی۔ بعد میں اس میں ایسے دیسی افسر بھی لے لیے گئے تھے جو فرض کے پکّے تھے اور جن پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ انگریزوں کو شک ہو گیا تھا کہ ہندوستانی پولیس بھی دہشت پسندوں کی مدد کرتی ہے۔ یہ شک اس لیے پیدا ہُوا تھا کہ تین چار دہشت پسند جادوگروں کی طرح پولیس کی حراست سے فرار ہو گئے تھے۔ اس کے ذمہ دار پولیس افسروں اور دیگر عملے کو دس دس سال سزائے قید دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۹ء کے آغاز میں ہی یقین ہو گیا تھا کہ جرمنی نے جنگی تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ ہٹلر کے بیان دھمکی آمیز ہو گئے تھے، اس لیے جنگ ناگزیر ہو گئی تھی۔ انگریزوں کو معلوم تھا کہ ہٹلر نے جرمنی کو بہت بڑی جنگی طاقت بنا دیا ہے اور وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی بھی ہمت رکھتا ہے۔ جرمنی کے متعلق یہ بھی انگریزوں کو معلوم تھا کہ اُس نے یورپ کے ممالک میں برطانیہ اور افریقہ میں اور ہندوستان میں بھی جاسوس بھیج رکھے ہیں۔ خطرہ یہ تھا کہ جرمنی کا محکمہ جاسوسی ہندوستان کی دہشت پسند تحریکوں کو اپنے زیرِ اثر لے کر انہیں ٹریننگ، اسلحہ اور مالی مدد دے گا یا دے رہا ہو گا۔ اس کی روک تھام کے لیے بھی اس شعبے کی ضرورت تھی جس میں مجھے عارضی طور پر بھیجا گیا تھا۔ میرے لیے یہ ایک اعزاز تھا جو مجھے اس صلے میں دیا گیا تھا کہ مَیں نے مختلف تھانوں میں رہ کر تین ایسی وارداتوں کے مجرم پکڑ لیے تھے جنہیں انگریز ناممکن قرار دے چکا تھا۔

اس شعبے کا ہیڈکوارٹر دلّی میں تھا۔ دلّی سے چالیس بیالیس میل دُور کبیر نگر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ مَیں اس علاقے کے تھانوں میں ایک قسم کے دَورے پر تھا۔ ہر ایک تھانے کے ایس ایچ او

سے کچھ باتیں پوچھنی اور کچھ بتانی تھیں۔ میں وردی کے بغیر تھا کیونکہ اس شعبے میں وردی نہیں پہنی جاتی تھی۔ ایک رات مجھے کبیر نگر رُکنا پڑا۔ صبح روانہ ہونا تھا۔ میں حسبِ معمول بہت سویرے جاگا۔ تھانے میں سرگرمی تھی۔ ایس۔ایچ۔او وہاں نہیں تھا۔ معلوم ہُوا کہ قصبے سے کوئی ایک میل دُور ریلوے لائن کے قریب ایک لاش پڑی ہے۔ ایس۔ایچ۔او وہاں چلا گیا تھا۔ میں روانگی کی تیاری کرنے لگا تو ہیڈ کانسٹیبل آیا۔ اُس نے مجھے کہا کہ سہائے صاحب مجھے جائے واردات پر بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میری مدد کے لیے تھوڑی سی دیر کے لیے آجائیں۔ رام سہائے اسسٹنٹ سب انسپکٹر تھا۔ اتنا میں جانتا تھا، تفتیش میں اناڑی تھا۔ میری جو شامت آئی تو میں جائے واردات پر جا پہنچا۔ اگر میں نہ جاتا تو رام سہائے ضروری کاغذی کارروائی کر کے کوئی ایسا داؤ کھیل جاتا کہ لاش کو لاوارث قرار دے کر دفن کرا دیتا۔ اسے غالباً میرا ڈر تھا کہ میں پولیس ہیڈکوارٹر کا افسر ہوں اس لیے نظر رکھوں گا کہ وہ اس واردات کی کیا کارروائی کرتا ہے۔

میں دراصل تفتیش کا جنونی تھا۔ یہی جنون مجھے وہاں لے گیا اور میں پھنس گیا۔

لاش ریلوے لائن سے تقریباً بارہ گز دُور پڑی تھی۔ کپڑوں پر زمین کی رگڑ کے نشان اور خراشیں وغیرہ بتاتی تھیں کہ اسے ریل گاڑی سے زندہ پھینکا گیا ہے۔ صبح کی روشنی صاف ہوگئی تھی۔ میں نے لاش کا ظاہری معائنہ کیا۔ گردن پر صاف نشان تھے جو بتاتے تھے کہ اس کا گلا دبا کر مارا گیا ہے۔ اس کی عمر تیس سال سے خاصی کم تھی۔ پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ خوبرو جوان تھا۔ علاقہ جنگلی تھا۔ ایک ٹانگ کی پنڈلی گیدڑوں نے کھالی تھی۔ اگر بھیڑیے آجاتے تو لاش کی صرف ہڈیاں رہ جاتیں۔ میں نے اس کے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لی۔ سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ برآمد ہوئے۔ ایک تو کرائے کا ٹکٹ تھا جس پر امرتسر تا کلکتہ لکھا ہُوا تھا۔ یعنی وہ امرتسر سے سوار ہُوا اور کلکتہ جا رہا تھا۔ دوسرا ٹکٹ سیٹ ریزرویشن کا تھا۔ اس پر بوگی نمبر اور سیکنڈ کلاس کی سیٹ کا نمبر لکھا ہُوا تھا

کپڑوں سے وہ کوئی امیر کبیر آدمی نہیں لگتا تھا لیکن سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ بتاتا تھا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ سیکنڈ کلاس وہی کلاس ہے جسے آج کل پاکستان میں فسٹ کلاس کہتے ہیں۔ اُس زمانے میں سیکنڈ کلاس میں اتنا لمبا سفر وہی کرتا تھا جو سرکاری افسر ہو اور سرکاری خرچ پر سفر کرے یا کوئی بہت ہی امیر آدمی یہ عیاشی کرتا تھا۔ امیر آدمی بھی انٹر کلاس میں سفر کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں ریل گاڑیوں میں رش بالکل نہیں ہوتا تھا۔ انٹر کلاس کو باعزت کلاس سمجھا جاتا تھا۔ فسٹ کلاس میں انگریز سفر کیا کرتے تھے۔ سیکنڈ کلاس عموماً خالی رہتی تھی۔ ریزرویشن کی تو ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

رات کو یہاں سے ایک پسنجر گاڑی گزرا کرتی تھی لیکن وہ امرتسر سے کلکتہ تک نہیں جاتی تھی۔ اس کے بعد ہوڑا ایکسپریس گزرتی تھی جو لاہور سے کلکتہ تک جاتی تھی۔ بہت تیز رفتار گاڑی تھی۔ قصبوں کے سٹیشنوں پر نہیں رُکتی تھی۔ کبیر نگر سے بھی رَن تھرو ہوتی تھی۔ اُسے اسی گاڑی سے گرایا گیا تھا۔ رام سہائے کی اطلاع کے مطابق وہاں سے ہوڑا ایکسپریس رات ڈیڑھ بجے کے قریب گزرتی تھی۔ میں اسے قتل کی ایک ایسی واردات کہہ سکتا تھا جو چلتی گاڑی میں ہُوئی۔ قاتل گاڑی میں فرار ہوگئے اور مقتول کی لاش یہاں پھینک گئے۔ یہ واردات اُن رہزنوں اور ڈاکوؤں کی بھی ہوسکتی تھی جو چلتی ریل گاڑیوں میں مسافروں کو لُوٹ کر اُس ریلوے سٹیشن کے قریب اُتر جاتے تھے جہاں گاڑی رُکنے کے لیے آہستہ ہوتی تھی اور یہ واردات عداوت کا نتیجہ بھی ہوسکتی تھی۔ بہرحال یہ قتل کی معمولی واردات تھی جو رام سہائے کی سردردی تھی مگر لاش کی جیب سے دو ایسی چیزیں ملیں جنہوں نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ ایک تو ایک ڈسک تھا۔ یہ کیرم کی گوٹیوں کی طرح گول تھا، لکڑی کا بنا ہُوا تھا۔ روپے کے سکّے جتنا تھا۔ اس کے کنارے کے ساتھ سوراخ تھا جس میں دو چابیاں ایک مضبوط دھاگے سے پروئی ہوئی تھیں۔ اس ڈسک کے درمیان میں کیل یا تیز دھار آلے کی نوک سے لفظ "ماتا" کھُدا ہُوا تھا۔ یہ ایسی چیز تھی جس پر کسی کی نظر نہیں پڑسکتی تھی لفظ شوخ نہیں تھا۔

ماتا نے چونکا دیا

اس کی جیب سے ایک پڑیا نکلی۔ چھوٹے سے کاغذ میں الائچی کے آٹھ دس دانے لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا، اس پر پنسل سے کاغذ پر ایک تحریر تھی جہاں تک مجھے یاد ہے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے۔ "بچوں کا خیال رکھنا۔ امرتسر میں منڈی تیز ہے۔ مال جلدی بھیج دو"۔ اس کے نیچے بھی لفظ "ماتا" لکھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے مجھے شک ہوا کہ قتل کی وجہ خواہ کچھ ہی ہو مقتول میرے شعبے کا ملزم ہے۔ وہ کسی دہشت پسند تحریک کا آدمی تھا۔ تقریباً ہر دہشت پسند تحریک کا ایک خفیہ نشان تھا جس سے اس کے ممبر ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔ مثلاً ایک تحریک کا نشان ریشمی رومال تھا، اور ایک تحریک جو "بگ فائر" کہلاتی تھی اس کا نشان چھوٹا سا ایک پتھر تھا جس پر لکھا ہوتا MOTHER رومال اور پتھر کا استعمال یہ تھا کہ کسی ممبر سے کہا جاتا کہ فلاں شہر میں فلاں جگہ فلاں وقت پہنچو تمہیں وہاں ایک آدمی ملے گا۔ یہ ممبر اس جگہ جا کر ریشمی رومال ہاتھ میں لے لیتا یا "بگ فائر" کا ممبر مخصوص چھوٹا سا پتھر ہاتھ میں اچھالنے لگتا تھا۔ اس کے گروہ کا آدمی جو وہاں انتظار میں موجود ہوتا تھا اس کے قریب آجاتا اور خفیہ الفاظ بول کر وہ ایک دوسرے سے واقف اور اپنے مشن پر روانہ ہو جاتے۔ سی آئی ڈی نے متعدد دہشت پسند ریشمی رومال اور پتھر کا دھوکہ دے کر پکڑے تھے لیکن وہ لوگ اتنے ہوشیار تھے کہ انہیں پکڑنا بہت ہی مشکل تھا۔

لفظ "ماتا" میرے لیے نیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ میرے لیے نیا ہو سکتا ہے میرے محکمے کے لیے مانوس ہوگا۔ چنانچہ میں نے لاش کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ مقتول کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر ممبر کے پاس اپنا ایڈریس ضرور ہوتا ہے لیکن وہ سامنے نہیں ہوتا، نہایت خوبی سے چھپایا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے پہلے تو جائے واردات کے اردگرد ریلوے لائن کے ساتھ ایک فرلانگ سے کچھ زیادہ پیچھے جا کر دیکھا۔ کام کی کوئی چیز نہ ملی۔ لاش تھانے لے گئے۔ میں نے اس کا کوٹ اتار کر اس کی سلائیاں دیکھیں۔ کوٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اوپر سے ٹٹولا۔ کالر کے نیچے چھپے ہوئے حصے میں کچھ شک ہوا۔ سلائی ادھیڑی تو اندر سے ایک انچ لمبا اور آدھا پونا انچ چوڑا کاغذ کا ٹکڑا نکلا۔ اس پر لکھا تھا —— "گھنشام۔ پہاڑ گنج دتی"۔ اس پر مکان نمبر اور گلی نمبر بھی لکھا ہوا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ تحریر نہایت باریک تھی۔ اس سے کوئی شک وشبہ نہ رہا کہ مقتول کسی دہشت پسند تحریک کا ممبر تھا۔ انگریز بادشاہ کو ایک دہشت پسند کے قتل سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ خوشی ہوتی لیکن اس کے قتل کی تفتیش سے بڑے کام کے انکشاف ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنے گروہ کے ساتھ غداری کی ہو جس کی پاداش میں اسے قتل کر دیا گیا ہوگا۔ اس صورت میں قاتل اس کے ہم سفر ہوں گے۔

اس ذرا جتنے قصبے میں پوسٹ مارٹم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہ سہولت میسر تھی کہ تھانے میں ٹیلیفون موجود تھا۔ میں نے دتی اپنے ہیڈ کوارٹر کو فون کیا اور انسپکٹر راجرز سے بات ہوئی۔ راجرز بے حد ذہین اور کام کی خاطر کئی کئی راتوں کی نیند حرام کرنے والا انگریز تھا۔ وہ تفتیش میں بہت ہی ہوشیار اور غیر معمولی طور پر قابل تھا لیکن تھرڈ ڈگری (اذیت رسانی) میں بے حد ظالم تھا۔ اس کے ہاتھ میں کیس آجاتا تو بڑے افسروں کے لیے بھی یہ گورا انسپکٹر مصیبت بن جاتا تھا۔ انگلینڈ کے مشہور سراغرساں پولیس کے ادارے سکاٹ لینڈ یارڈ کا مانا ہوا سراغرساں تھا۔ کچھ عرصہ افریقہ میں بھی رہ آیا تھا۔ اس نے یہ اصول میرے دماغ میں ڈالا تھا کہ پہلے شرافت اور محنت سے تفتیش کرو۔ اگر یقین ہو جائے کہ مجرم یہی ہے جسے پکڑا ہے اور وہ اقبالِ جرم نہیں کرتا تو اسے تھرڈ ڈگری میں ڈال دو۔ اس کی بوٹیاں نوچ لو لیکن اس سے پہلے تمہیں یقین کر لینا چاہیئے کہ تم بے گناہ کو ظلم وتشدّد اور اذیت کا نشانہ نہیں بنا رہے۔

میں نے ٹیلیفون پر اسے بتایا کہ لاش ملی ہے۔ میں نے جو مشاہدات کیے تھے وہ بھی بتائے اور جو اشیاء برآمد کی تھیں وہ بھی بتائیں۔ اس نے چند ایک سوال پوچھے۔ میں نے جواب دیئے۔ اس نے کہا — "لاش اور برآمد شدہ اشیا لے کر پہلی گاڑی سے دلی پہنچو۔ یہ ہمارا کیس معلوم ہوتا ہے" — میں نے مقتول کے کوٹ کی سلائیوں میں سے نکالے ہوئے کاغذ پر جو ایڈریس پڑھا تھا وہ بھی اسے نوٹ کرا دیا۔ وہ زمانہ ریل گاڑیوں کا تھا۔ بسیں اور کاریں بہت ہی کم تھیں۔ اگر ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر ہوتے تو موٹر ایکسپریس کو راستے میں ہی روک لیا جاتا۔ میں نے انسپکٹر راجر کو ٹکٹ نمبر، سیٹ نمبر اور بوگی کا نمبر بھی اس کے پوچھنے پر نوٹ کرا دیا تھا۔ رام سہائے نے بتایا کہ ایک پسنجر ٹرین جو دلی تک جاتی ہے، آنے والی ہے یا آچکی ہوگی۔ اسے پکڑنا مشکل تھا۔ میں نے ریلوے سٹیشن فون کیا تو پتہ چلا کہ گاڑی آرہی ہے، سگنل ڈاؤن ہو چکا ہے۔ میں نے اپنا تعارف کرا کے سٹیشن ماسٹر سے کہا کہ گاڑی کو سٹیشن پر روکے رکھے خواہ کتنی ہی لیٹ ہو جائے اور انٹر، تھرڈ سیکنڈ کا کوئی کمپارٹمنٹ بالکل خالی کرائے کیونکہ ایک لاش دلی لے جائی جا رہی ہے۔

میں جب لاش چارپائی پہ ڈلوا کر ریلوے سٹیشن پہنچا تو گاڑی کو وہاں رُکے بیس منٹ گزر چکے تھے۔ میں نے رام سہائے سے احتیاطاً تین مسلح کانسٹیبل ساتھ لے لیے تھے کیونکہ لاش دہشت پسند کی تھی۔ خطرہ تھا کہ اس کے ساتھی یا قاتل راستے میں گڑبڑ کریں گے۔ انٹر کلاس کا ایک کمپارٹمنٹ خالی تھا۔ لاش اس کے فرش پر رکھوائی۔ میں نے انجن کے ڈرائیور کو بلا کر کہا کہ وہ دلی اپنے صحیح وقت پہ پہنچے، جتنا وقت یہاں ضائع ہوا ہے وہ تیز رفتاری سے پورا کرے۔ رام سہائے نے مجھے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ اسے خوش ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ میں اس کے تھانے کی ایک واردات اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ میں پرائیویٹ کپڑوں میں تھا۔ ریوالور پتلون کی جیب میں تھا جس میں چھ گولیاں تھیں۔ اٹھارہ گولیاں چھوٹے سے سوٹ کیس میں تھیں

جو میرے ساتھ تھا۔ میں نے کانسٹیبلوں کو کھڑکیوں کے ساتھ بٹھا کر کہا کہ باہر نظر رکھیں۔ دوسرے ڈبے سے کوئی ادھر آنے کی کوشش نہ کرے۔ میں لاش کو غور سے دیکھنے لگا۔ نئی چیز یہ دیکھی کہ اس کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ میں نے ایک اور چیز نوٹ کی جو میں نے جائے واردات پر بھی محسوس کی تھی اور جب اس کے کوٹ کو تھانے میں اُتار کر ٹٹولا تو زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ یہ کسی تیز عطر کی خوشبو تھی۔ میں نے گاڑی میں کوٹ کو پھر سُونگھا۔ خوشبو کوٹ کے سینے والے حصے میں تھی۔ پولیس آفیسر کے کان اور ناک تیز ہوں یعنی زیادہ حساس ہوں تو کوئی کام کا سراغ مل جاتا ہے۔

میں اس سوچ میں گم ہو گیا کہ ایک دہشت پسند آدمی اتنے تیز عطر کا شوقین ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا تھا، کیونکہ دہشت پسندی اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالے رکھنے کا ذہنی رجحان اور بموں سے تباہی مچانے کے عزائم کسی نفاست پسند اور شائستہ ذوق والے انسان کے نہیں ہو سکتے۔ میں اس واردات کے نفسیاتی پہلو پر غور کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص دہشت پسند نہیں ہو سکتا اور اگر دہشت پسند ہے تو اس کے ساتھ کوئی عورت تھی جس نے تیز عطر لگا رکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی ہے۔ میں نے اس کے کوٹ کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس کی قمیض کو بھی دیکھا۔ ساری لاش کو دیکھا۔ مجھے کسی عورت کی کوئی نشانی نہ ملی۔ ایک آدھ بال مل جاتا۔ کہیں لپ سٹک کی سُرخی نظر آجاتی۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے خوشبُو اپنے آپ میں محفوظ کر لی۔ راستے میں لاش کو کئی بار سُونگھا اور خوشبو کو یاد کرتا رہا۔ لاش کی بدبُو اپنی جگہ تھی لیکن میری سُونگھنے کی حِس نے خوشبو کو الگ کر لیا تھا۔۔۔۔ لاش کے پاؤں میں جُوتے نہیں تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جب اس کا گلا گھونٹا گیا اور گاڑی سے پھینکا گیا تو وہ سویا ہوا تھا۔

لاش کے ہمسفر اور وارث

لاش دلی ہیڈکوارٹر میں پہنچائی تو چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ ان چار گھنٹوں میں راجرز

تفتیش کا کمال دکھا چکا تھا۔ اس نے کلکتہ کے راستے کے چند ایک بڑے ریلوے سٹیشنوں کے سٹیشن ماسٹروں سے معلوم کر کے کہ اس وقت ہوڑا ایکسپریس کہاں ہے یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ فلاں نمبر کی بوگی کے فلاں سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں اگر کوئی مسافر ہے تو اسے اُتار کر روک لیا جائے اور اگر کمپارٹمنٹ خالی ہے تو اسے سیل (مہر بند) کر کے گاڑی سے الگ کر لیا جائے۔ مجھے آج اچھی طرح یاد نہیں رہا کہ وہ کونسا جنکشن سٹیشن تھا جہاں کے سٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ ایکسپریس اُس کے سٹیشن میں داخل ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُس سٹیشن ماسٹر نے اطلاع دی کہ اُس نے گاڑی سے بوگی اُتروالی ہے۔ اس میں صرف ایک کمپارٹمنٹ سیکنڈ کلاس کا اور باقی انٹر اور تھرڈ کے تھے۔ اُس نے ریلوے پولیس کی زیرِ نگرانی سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے دونوں دروازے سیل کر کے پولیس کی تحویل میں دے دیے تھے۔ سٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ کمپارٹمنٹ خالی تھا۔ اندر ایک بستر اور کچھ اشیاء پڑی تھیں جنہیں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ انٹر اور تھرڈ کے مسافروں کو دوسری بوگیوں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ انسپکٹر راجرز نے اسے کہ دیا کہ یہ بوگی الگ انجن کے ساتھ فوراً دلی بھیج دی جائے۔ اسے خاص طور پر کہا گیا کہ کسی گاڑی کے ساتھ بوگی نہ بھیجے۔ الگ بھیجی جائے اور اس کے ساتھ پولیس کی کافی گارد ہونی چاہیے۔ اس انگریز انسپکٹر نے وہاں کی پولیس کو اور اس ضلعے کے ڈپٹی کمشنر کو بھی بذریعہ ٹیلیفون احکام جاری کر دیے۔

مَیں بتا چکا ہُوں کہ اُس زمانے میں رش بالکل نہیں ہوتا تھا۔ یہ کوئی حیران ہونے والی بات نہیں تھی کہ ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ خالی جا رہا تھا۔ رش نہ ہونے کی وجہ سے تفتیش میں سہولت ہو گئی تھی۔ آج کل بوگی اور کمپارٹمنٹ کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہر سٹیشن پر مسافر اُترتے اور چڑھتے ہیں۔ اگر کوئی مسافر کوئی چیز گاڑی میں بھول جائے تو دوسرے مسافر ایک دومنٹ میں غائب کر دیتے ہیں۔ ہمیں یہ سہولت حاصل ہو گئی کہ اس کمپارٹمنٹ میں کوئی مسافر نہ بیٹھا اور ہمیں مقتول کی اشیاء مل گئیں ....

انسپکٹر راجرز نے ایک کمال اور کر دکھایا تھا۔ اُس نے لاہور اور امرتسر کے ریلوے سٹیشنوں سے بھی بذریعہ

فون معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ہوڑا ایکسپریس لاہور سے چلتی تھی۔ وہاں سے یہ معلومات ملی تھیں کہ لاہور سے اس بوگی کے سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں تین سیٹیں بک ہوئی تھیں۔ ایک مسلمان تھا دو ہندو۔ چوتھی سیٹ امرتسر سے بک ہوئی تھی۔ یہ بھی مسلمان تھا۔ مجھے باقی مسافروں کے نام یاد نہیں رہے مقتول کا نام آج تک یاد ہے کیونکہ اس کیس کا مرکزی کردار وہی تھا۔ اُس نے بکنگ میں اپنا نام حامد علی خان لکھوایا تھا۔ لاہور کے تینوں مسافروں کی بکنگ دلی تک تھی۔ امرتسر کے مسافر کی بکنگ کلکتہ تک تھی۔ یہ مقتول ہو سکتا تھا۔ کمپارٹمنٹ کی چھ سیٹیں تھیں۔ تین نیچے تین اُوپر۔ دلی سٹیشن سے پتہ چلا کہ وہاں سے کوئی بکنگ نہیں ہُوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ دلی سے آگے مقتول اکیلا تھا۔ غالباً اس کے قاتل اسی انتظار میں تھے کہ وہ اکیلا رہ جائے تو اسے ختم کیا جائے۔ یہ پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی کہ مقتول ہندو تھا لیکن اُس نے بکنگ اسلامی نام سے کرائی تھی۔ وہ اپنی شناخت کو چھپانا چاہتا تھا۔ امرتسر کے سٹیشن ماسٹر نے ٹکٹ نمبر اور بوگی نمبر کی تصدیق کی تھی۔ نام کی تبدیلی سے معاملہ قدرے پُراسرار ہو گیا لیکن یہ یقین ہو گیا کہ مقتول کسی دہشت پسند گروہ کا فرد تھا جس کا نشان "ماتا" تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ دلی تک سفر کرنے والے مسافر کون تھے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ریلوے سٹیشن پر اُن کے ایڈریس نہیں تھے۔ اگر ہوتے بھی تو وہ غلط ہو سکتے تھے۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ ان تینوں نے بکنگ دلی تک کرائی مگر مقتول کو قتل کر کے گاڑی میں سے باہر پھینکنے کے لیے دلی سے آگے بھی سفر کیا مگر یہ محض قیاس آرائیاں تھیں۔ وہ اسے امرتسر سے کچھ آگے بھی گاڑی سے گرا سکتے تھے...

مَیں نے انسپکٹر راجرز سے کہا کہ لاش کا کوٹ سُونگھو۔ اس نے سُونگھا اور میری طرف دیکھا۔ مَیں نے کہا ــــ "ایک خانہ بدوش قسم کا دہشت پسند اتنے نفیس ذوق کا نہیں ہو سکتا۔ یہ عمدہ قسم کا عطر ہے"۔

انسپکٹر راجرز نے پوچھا ــــ "آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"اس کے ساتھ ایک عورت تھی" ــــ مَیں نے جواب دیا ــــ "جس نے بکنگ کے بغیر

سفر کیا۔ کمپارٹمنٹ میں چھ سیٹیں تھیں جن میں دو خالی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے دو نہیں بلکہ صرف ایک خالی تھی۔ اس سیٹ پر عورت تھی"۔

"پھر وہ عورت کہاں گئی؟" ـــــ انسپکٹر راجرز نے پوچھا۔

"یہ شخص اس عورت کی خاطر قتل ہوا ہے" ـــــ میں نے سوچ کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے جواب دیا ـــــ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عورت کو قاتلوں نے مقتول کو پھانسنے کے لیے استعمال کیا ہو۔ وہ ان کی ساتھی ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی خوبصورت لڑکی ہو جسے اڑا لے جانے کے لیے ڈاکو یا بردہ فروش گاڑی میں سوار ہو گئے ہوں۔ انہوں نے مقتول کو مزاحمت کی یہ سزا دی کہ اسے مار کر گاڑی سے باہر پھینک دیا اور لڑکی کو لے گئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقتول نے اس لڑکی پر دست درازی کی ہو اور لڑکی جس کسی کے ساتھ تھی اس نے مقتول کو قتل کر دیا ہو"۔

"سب سے پہلے یہ یقین کرنا ہے کہ اس کمپارٹمنٹ میں کسی کے ساتھ یا مقتول کے ساتھ کوئی لڑکی تھی" ـــــ انسپکٹر راجرز نے کہا ـــــ "معلوم یہ ہوگی آج رات کسی بھی وقت دلی پہنچ جائیگی۔ کمپارٹمنٹ کو دیکھ کر لڑکی کی موجودگی یا غیر موجودگی ثابت ہو جائے گی۔ فوری طور پر کرنے والا کام یہ ہے کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔ مقتول کے گھر کی تلاشی لی جائے اور اس کے لواحقین سے تفتیش کی جائے"۔

میری پہلی اطلاع سے لے کر لاش انسپکٹر راجرز کے پاس پہنچنے تک کے درمیانی چار گھنٹوں میں اس نے پہاڑ گنج میں مقتول کے گھر کے تمام افراد کو باہر نکال کر مکان سربمہر کرا لیا تھا۔ میں نے اسے کیپ نگر سے فون پر مقتول کا ایڈریس نوٹ کرا دیا تھا جو اس کے کوٹ کے اندر سلا ہوا ملا تھا۔ اس نے ایک اور انگریز انسپکٹر کو پولیس کی کار دے کر اس ایڈریس پر بھیجا۔ پتہ چلا کہ گھنشام (مقتول) کا یہی گھر ہے تو اس نے گھر کے بچے سے بڑے تک کو سی۔ آئی۔ ڈی ہیڈ کوارٹر بھیج کر مکان کو مقفل اور سربمہر کر دیا اور وہاں پولیس کا پہرہ کھڑا کر دیا تھا ..... اب اس کے گھر کے افراد باہر بیٹھے تھے۔ ان میں جو بڑی عمر کے افراد

تھے۔ مثلاً باپ اور چھوٹا بھائی اور چھوٹے بھائی کی بیوی، انہیں لاش دیکھنے کے لیے بلایا گیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر ماں اور باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ چھوٹے بھائی کا ردِ عمل معمولی سا تھا اور اس کی بیوی پر کچھ بھی اثر نہیں تھا۔ چھوٹے بھائی کی عمر بائیس تیئس سال ہوگی اور اس کی بیوی اس سے دو تین سال چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ لاش کی شناخت ہو گئی۔ اس کا نام گھنشام ہی تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی۔

"ماتا" کا مطلب بھارت ماتا سے اسلام کا خاتمہ

ہندوستان میں فوج اور پولیس کے انگریز افسر روانی سے اردو بولتے اور سمجھتے تھے۔ نئے افسروں کو بولنے میں ذرا دقت ہوتی تھی۔ انسپکٹر راجرز انہی میں سے تھا جو بہت کم اردو بولتا اور سمجھتا تھا۔ کوشش پوری کرتا تھا۔ ہندوستان میں آئے اسے ابھی ایک سال پورا نہیں ہوا تھا۔ ترجمان کے بغیر تفتیش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کیس میں اس نے مجھے ہی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ہم تفتیش کے کمرے میں گئے تو اس نے مجھے کہا کہ میں اس کے سوالوں کے علاوہ اپنی طرف سے بھی سوال کروں۔ مجھے بھی ایسی اجازت کی ضرورت تھی۔ میں صرف ترجمانی کے فرائض کا پابند نہیں رہنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے مقتول کے باپ کو بلایا گیا۔ اس کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے طریقۂ کار کے مطابق اسے تسلی دلاسہ دیا اور کہا کہ اس کا بیٹا مارا جا چکا ہے اگر وہ زندہ پکڑا جاتا تو پھانسی کے تختے پر مارا جاتا۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے مرے ہوئے بیٹے کے متعلق جو کچھ جانتے ہو بتا دو۔ وہ کیا کرتا تھا، کہاں آتا جاتا تھا، اسے ملنے والے کون لوگ تھے وغیرہ ..... میں نے یہ ساری بات انگریزی میں انسپکٹر راجرز کو بتائی۔

باپ نے مقتول کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں جو مختصراً یوں ہیں کہ وہ اس کا پہلا بچہ تھا

اس لیے، ضرورت سے زیادہ پیار میں پلا۔ بچپن میں ہی اسے فضول خرچی کی عادت ہوگئی تھی جو باپ نے اپنے ہاتھوں ڈالی تھی۔ اس کے بعد اس کی ایک بہن پیدا ہوئی۔ پھر اس کا یہ بھائی پیدا ہُوا جو یہاں موجود تھا۔ اس کی بہن اپنے سسرال میں تھی۔ اس کے بعد ایک اور بھائی پیدا ہُوا جس کی عمر اس وقت چودہ سال کی ہے۔ یہ بہن بھائی پیدا ہُوئے تو گھنشام کی طرف ماں باپ کی توجہ کم ہوگئی۔ باپ کا کاروبار اچھا تھا۔ روپے پیسے کی کوئی تنگی نہیں تھی۔ باپ اسے پیسے دے کر راضی کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس سے بیٹا اور زیادہ بگڑ گیا۔ باپ اسے تعلیم دلا کر اپنے کاروبار کو پھیلانے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا مگر بیٹا بے لگام ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سکول میں پڑھتا تھا لیکن پڑھنے میں اسے دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم آٹھویں جماعت تک پہنچ گیا اور اس عمر میں اس نے چھوٹے بہن بھائیوں کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ گھر میں وہی حیثیت حاصل کرنا چاہتا تھا جو اُسے اُس وقت حاصل تھی جب وہ گھر میں اکیلا تھا۔ وہ جُوں جُوں بڑا ہوتا گیا گھر والوں کے لیے غنڈہ بنتا گیا۔ میٹرک کے امتحان میں دو بار فیل ہُوا اور اس نے تعلیم ترک کر دی۔ یہاں سے وہ آوارگی میں داخل ہوگیا۔

اُس کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر کہا ___ "مہاراج! آپ خفا نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟ آپ کا مذہب کیا ہے؟ ہندو، مسلمان یا عیسائی؟" ___ مَیں نے جھوٹ بولا کہ مَیں ہندو ہوں۔ مَیں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ یہی سُننا چاہتا ہے۔ میرا جواب سُن کر اس کے چہرے پر اطمینان پیدا ہوگیا۔ کہنے لگا ___ "پھر مَیں آزادی سے بات کروں، صاحب بہادر تو ناراض نہیں ہوں گے؟"

مَیں نے انسپکٹر راجرز کو بتایا کہ اس آدمی نے کیا کہا ہے۔ یہ ہندو انگریزی نہیں جانتا تھا۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ مَیں نے اسے کہا ہے کہ مَیں ہندو ہُوں۔ انسپکٹر راجرز نے مُسکرا کر مجھ

سے پوچھا ___ "آپ کو معلوم ہے کہ مقتول کی جیب سے جو ڈسک برآمد ہُوئی ہے اس پر کُھدے ہُوئے لفظ 'ماتا' کا کیا مطلب ہے؟" ___ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اُس نے کہا ___ "باقی دہشت پسند تحریکیں میری دشمن ہیں یعنی انگریزی راج کی دشمن مگر 'ماتا' نام کی تحریک تمہاری دشمن ہے۔ یہ تحریک یوپی سے اُٹھی ہے اور پنجاب میں پرورش پا رہی ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹایا جائے۔ اس میں صرف ہندو اور سکھ ہیں۔ یہ قیاس ہے کہ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو (بھارت کا پہلا وزیرِ اعظم)، سردار پٹیل اور اس سطح کے ہندو لیڈروں نے یہ تحریک شروع کرائی ہے۔ ظاہری طور پر وہ ہندو مسلم بھائی بھائی کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں لیکن وہ درپردہ مسلمانوں کو ہندو مذہب میں جذب کر لینا چاہتے ہیں۔ 'ماتا' سے ان کی مراد 'بھارت ماتا' ہے جسے وہ صرف ہندوؤں کا ملک سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ دہشت پسند تحریک مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کو خفیہ طریقوں سے قتل کرے گی۔ تبلیغ کے ذریعے ہندو مذہب پھیلائے گی اور کٹّر مسلمانوں کو پُراسرار طریقوں سے دہشت زدہ کرے گی۔ یوپی میں اس تحریک نے دہشت پسندی کی کچھ وارداتیں کی بھی ہیں" ___ انسپکٹر راجرز بہت ہی ذہین آدمی تھا۔ اُس نے پوری معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔ اُس نے کہا ___ "ہمارے خفیہ ذرائع نے ہمیں بتایا ہے کہ 'ماتا' تحریک کا دائرۂ عمل وسیع کر کے اسے حکومت کے خلاف بھی استعمال کیا جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ بڑے بڑے دولتمند ہندو تاجر اس تحریک کو مالی امداد دے رہے ہیں.... آپ نے اچھا کیا ہے کہ اسے یہ بتایا ہے کہ آپ ہندو ہیں۔ اسے ڈراؤ بھی اور مسلمانوں کے خلاف گرماؤ بھی۔ یہ کارآمد باتیں بتا سکتا ہے۔"

"صاحب بہادر کہتے ہیں کہ انگریز بھی مسلمانوں کے دشمن ہیں" ___ مَیں نے مقتول کے باپ سے کہا ___ "تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے خوف ہو کر کہو۔"

"میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں لالہ جی مہاراج!" ___ اُس نے روتے ہُوئے کہا ___

جس کا اپنا بیٹا دشمن ہو جائے وہ باپ کسی سے کیا دشمنی کرے گا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ جوان ہوا تو مسلمانوں کا دشمن ہو گیا۔ وہ اپنے جیسے دوستوں کو گھر لاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ کمرے میں بیٹھے بحث کرتے رہتے کہ مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کون سے طریقے اختیار کیے جائیں۔ میں ڈرتا تھا کہ یہ چھوکرے مسلمانوں کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ ان کی لاشیں بھی گم کر دیں گے۔ مسلمانوں کو آپ جانتے ہیں مہاراج! گوشت کھانے والی قوم ہے۔ اس ملک پر حکومت بھی کر چکی ہے۔ کسی کو قتل کر دینا ان کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے۔ مجھے سولہ آنے یقین ہے کہ اسے مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ میں اسے منع کیا کرتا تھا کہ مسلمانوں اور سکھوں سے دشمنی مول نہ لینا۔ آپ کو معلوم ہے کہ دلی میں پٹھان اور پنجابی مسلمان ہیں۔ ان سے بھلا ہم دشمنی مول لے سکتے ہیں؟"

باپ نے بتایا کہ وہ گھر سے کئی کئی دن غائب رہنے لگا۔ آتا تھا تو گھر سے پیسے لے لیتا تھا۔ چار پانچ سال کے عرصے میں وہ ہاتھ سے بالکل نکل گیا۔ باپ نے اُسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تو ایک روز دلی کے پنڈت قسم کے چار آدمی اس کے گھر آئے۔ انہوں نے باپ کو سمجھانے کے لیے کہہ دیا کہ اس کا بیٹا جو کام کر رہا ہے وہ دھرم یُدھ ہے یعنی مذہبی جنگ ہے جسے ہم جہاد کہتے ہیں۔ اُنہوں نے باپ کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ ہندوستان میں اسلام کو ہندو مذہب میں جذب کر لینا ضروری ہے۔ انہوں نے یہ دلیل بھی دی کہ مسلمان پیدائشی سپاہی ہیں۔ انہیں جب کبھی موقع ملا انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اگر انہوں نے انگریزوں سے ملک لے لیا تو وہ ایک بار پھر ہندوستان کے بادشاہ بن جائیں گے۔ انہوں نے جس طرح اپنے دورِ حکومت میں لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنا لیا تھا اسی طرح وہ ہندوستان کے تمام ہندوؤں کو مسلمان بنا لیں گے۔ ان چاروں لیڈروں نے اسے بتایا کہ ہندوستان بھارت ماتا ہے جس پر مسلمان ملیچھوں کی حکومت قائم

ہو گئی تو بھارت ماتا کا ہتیا چار (توہین) ہو جائے گا۔ اس لیے اپنے نوجوان بیٹوں کو اس تحریک (ماتا) میں شامل ہونے سے نہ روکو۔ اگر روکو گے تو پاپی کہلاؤ گے۔

باپ نے انہیں کہا کہ سب سے بڑا پاپی تو اس کا بیٹا ہے جس کی آنکھ میں ماں کی عزت ہے نہ باپ کی۔ بے لگام گھوڑے کی طرح وہ معلوم نہیں کہاں کہاں بھاگتا پھر رہا ہے۔ باپ نے ہاتھ جوڑ کر ان سے درخواست کی کہ اس کے بیٹے کی کھوپڑی میں کچھ عقل اور آنکھوں میں شرم ڈالیں۔ وہ اس کے کاروبار میں بھی اس کی کچھ مدد کرے۔ اس کے جواب میں لیڈروں نے اسے کہا کہ وہ اب تمہارا نہیں بھارت ماتا کا بیٹا ہے۔ وہ اشوک اور شیواجی بن کر اُبھرے گا.... باپ سخت پریشان ہوا۔ لیڈروں نے اسے تسلی دلاسے دیئے اور یہ تاکید بھی کی کہ اگر کوئی گھر آ کر اس کے بیٹے کے متعلق پوچھے تو اُسے کچھ نہ بتائے۔ ہو سکتا ہے وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہو۔ اگر وہ بتائے گا تو اس کا بیٹا گرفتار ہو جائیگا۔ لیڈروں نے اُسے نہایت اچھے الفاظ میں کچھ دھمکیاں بھی دیں اور چلے گئے۔

"ان لیڈروں کو تم جانتے ہو؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"صرف ایک کو"۔۔۔ اُس نے جواب دیا اور التجا کی ۔۔۔ "مہاراج جی! اسے پتہ چل گیا کہ میں نے اس کا نام لکھوا دیا ہے تو وہ میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کرے گا"

"تمہاری حفاظت ہماری ذمہ داری ہے"۔۔۔ میں نے اسے کہا۔۔۔ "اس کا نام پتہ بتاؤ"۔

اُس نے ایک سناتنی ہندو کا نام بتایا اور پتہ بھی بتا دیا۔ وہ اس کے گھر دو سال پہلے آیا تھا۔ میں نے انسپکٹر راجرز کو اس کا بیان انگریزی میں سنایا اور اس سناتنی پنڈت کا نام پتہ بھی لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔ اُمید تھی کہ یہ پنڈت پکڑا گیا تو اس تحریک کی پشت پناہی کرنے والے دوسرے لیڈر بھی پکڑے جائیں گے۔ میں نے مقتول کے باپ سے پُوچھا کہ مقتول کے تعلقات کسی لڑکی کے ساتھ تھے؟ اُس نے جواب دیا کہ اُسے اس کی باہر کی زندگی کے متعلق کوئی زیادہ واقفیت نہیں۔ اُس نے شادی

سے انکار کر دیا تھا۔ گذشتہ تین ساڑھے تین سالوں سے وہ پورا پورا مہینہ گھر سے غیر حاضر رہتا تھا۔ تین چار دنوں کے لیے گھر آتا اور غائب ہو جاتا تھا۔ ماں نے بھی، باپ نے بھی اور بڑی بہن نے بھی اسے شریفانہ زندگی بسر کرنے کو کہا۔ رو رو کر اس کی منتیں کیں لیکن وہ سیدھے راستے پر نہ آیا۔ اس دوران اس کے چھوٹے بھائی کی شادی ہو گئی۔ مقتول اپنے بھائی کی شادی پر بھی گھر نہیں آیا تھا۔ وہ غنڈہ بن چکا تھا۔ گھر کے تمام فرد اس سے ڈرنے لگے تھے۔ باہر سے انہیں پتہ چلا تھا کہ وہ شراب پیتا ہے اور رنڈیوں کے پاس بھی جاتا ہے۔

انسپکٹر راجرز نے اُس پر بہت جرح کی۔ مَیں نے بھی اس پر سینکڑوں سوال کر ڈالے لیکن اس سے کام کی کوئی بات نہ اگلوائی جا سکی۔ اس سوال کے جواب میں کہ اب کے وہ گھر سے کب سے غیر حاضر تھا۔ باپ نے بتایا کہ اُسے گھر سے نکلے بیس روز ہو گئے ہیں۔ انسپکٹر راجرز نے اسے باہر بھیج دیا اور مجھے کہا ــــ "معلوم نہیں اس بوڑھے کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس نے سچ بولا ہے اور اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ بلاوجہ بھی جھوٹ بولتے ہیں لیکن فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں کیونکہ ان کے چہرے کا تاثر اور آنکھوں کی حرکت بدل جاتی ہے۔ میرے ملک کے مجرم جب جھوٹ بولتے ہیں تو دلیر ہو کر بولتے ہیں۔ چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آنے دیتے۔ اس بوڑھے نے جھوٹ نہیں بولا۔"

اب ہمارے سامنے مقتول کا چھوٹا بھائی بیٹھا تھا۔ مَیں نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اپنے بڑے بھائی کی لاش دیکھ کر وہ اپنے ماں باپ کی طرح رویا کیوں نہیں تھا؟ اس نے بے پرواہی سے جواب دیا ــــ "مجھے اس کے مرنے کی خوشی ہے۔" یہ کہہ کر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس نے کہا ــــ "اور مجھے اس پر اور زیادہ خوشی ہے کہ وہ مرا نہیں مارا گیا ہے۔"

مقتول کی دلیری اور بدچلنی

مَیں سمجھا کہ اُس کے دل میں بھائی کے خلاف یہی شکایت ہوگی جو اُس کا باپ تفصیل سے بیان کر گیا تھا۔ مَیں نے اسے کہا ــــ "تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ کھُل کر بیان کر دو۔ مَیں ہندو ہوں۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیا تم انگریزی بول سکتے ہو؟"

"میٹرک پاس ہُوں" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "لیکن انگریزی بولنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ باپ کے ساتھ کاروبار کرتا ہُوں جہاں اُردو اور پنجابی چلتی ہے۔"

مَیں نے اس کے ساتھ جو باتیں کیں اور اس نے جو کچھ کہا تھا وہ انگریزی میں انسپکٹر راجرز کو سنایا۔ اس نے پوچھا ــــ "کیا تم اس کی باہر کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟"

"مَیں اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک خفیہ تحریک کا ممبر تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "مجھے بھی اس میں شامل ہونے کے لیے کہتا رہتا تھا لیکن مَیں نے اس کی یہ بات نہیں مانی تھی۔"

"تحریک کیا ہے؟" ــــ انسپکٹر راجرز نے پوچھا ــــ "اس نے تمہیں ضرور بتایا ہوگا کہ تحریک کے ممبر کیا کرتے ہیں۔"

"ہاں اس نے بتایا تھا" ــــ اس نوجوان ہندو نے بتایا ــــ "پہلے وہ کسی ایسے گروہ میں شامل ہُوا تھا جو انگریزوں کے خلاف خفیہ طور پر کام کر رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے ایک اور گروہ کے متعلق سنانا شروع کر دیا۔ کہا کرتا تھا کہ ہمارا پہلا دشمن مسلمان ہے اس لیے مسلمانوں کو ختم کرنا ضروری ہے۔ وہ مجھے مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ کہتا تھا کہ تم اس گروہ میں شامل ہو جاؤ تو سارے ہندوستان کی سَیر کرو گے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ مسلمانوں کو تباہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔"

"لیکن وہ مسلمانوں کو کس طریقے سے ختم کرنا چاہتا تھا؟" ــــ مَیں نے پوچھا ــــ "اُس کے

ساتھ اور کون لوگ تھے"؟

"میں نے یہی سوال اس سے کئی مرتبہ پوچھا تھا"۔ اس نے جواب دیا ۔۔۔ "لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ کہتا تھا کہ اس گروہ کے لوگ ایسی باتیں زبان پر لایا ہی نہیں کرتے۔ ممبر ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں۔ اس نے مجھے لکڑی کا ایک گول ٹکڑا دکھایا تھا جس پر ماتا کھدا ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ جب گھر سے زیادہ دنوں کے لیے غیر حاضر ہوتا ہے تو امرتسر اور لاہور چلا جاتا ہے جہاں اس کے گروہ کے چند ایک آدمی اس کی خوب آؤ بھگت کرتے اور شہزادوں کی طرح رکھتے ہیں"

"کیا تمہارے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت نہیں ہے؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا اور کہا ۔۔۔ "پوری آزادی سے بات کرو۔ میں ہندو ہوں اور مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں"۔

"ہاں جی!" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "ہر ہندو کو مسلمانوں سے نفرت کرنی چاہیئے۔ میں بھی مسلمانوں کو ناپاک سمجھتا ہوں۔ میں چونکہ تجارت پیشہ ہوں اس لیے یہ میرا فرض ہے کہ کسی مسلمان کو تجارت میں کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن میں کسی ایسی پارٹی میں شامل نہیں ہونا چاہتا جس کی سرگرمیاں خفیہ ہوں اور جس کے ممبر چوروں کی طرح چھپتے پھریں"۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کا کوئی دشمن تھا؟" ۔۔۔ انسپکٹر راجرز نے پوچھا ۔۔۔ "اسے کس نے قتل کیا ہوگا؟"

"میں کسی کا نام نہیں بتا سکتا" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اس کے دشمن کئی ہوں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ کسی مسلمان کو پتہ چل گیا ہوگا کہ گھنشام مسلمانوں کے خلاف خفیہ کارروائیاں کر رہا ہے۔ اس نے اسے قتل کر دیا ہوگا۔ میرا دوسرا شک یہ ہے کہ اس کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے کسی کی بیوی یا بہن پر ہاتھ ڈالا ہوگا اور قتل ہوگیا"۔

اس کے اس جواب پر میں نے اور انسپکٹر راجرز نے اس پر اس قدر سوال کیے اور اتنی جرح کی کہ یہ نوجوان ہندو بے حال ہوگیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور اس کے ہونٹ خشک ہوگئے۔

اس سے یہ کہہ رہے تھے کہ وہ عملی مثال دے کر واضح کرے کہ اس کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ آخر اُس نے پریشان ہو کر بتایا ۔۔۔ "اُس نے میری بیوی کو خراب کیا ہے"۔ ۔۔۔ اُس نے بتایا کہ وہ دو روز کے لیے کاروبار کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ گھنشام آیا اور رات کو اس کی بیوی کے کمرے میں چلا گیا۔ لڑکی کمرے میں اکیلی تھی۔ ماں باپ دوسرے کمروں میں تھے۔ لڑکی کو چاقو دکھا کر اور قتل کی دھمکی دے کر اس نے لڑکی کو خراب کیا۔ یہ واقعہ اس کے قتل سے ایک سال پہلے کا ہے، اس لیے یہ شک بے بنیاد تھا کہ چھوٹے بھائی نے اسے قتل کیا ہوگا۔ بیوی نے اپنے خاوند کو بتایا۔ خاوند نے اپنے باپ کو بتایا اور بات گول ہوگئی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ مقتول بدچلن بھی تھا اور دلیر بھی اور اس میں دہشت پسندی کے اوصاف موجود تھے۔

دن بھر کی جھک جھک سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ مقتول مسلمانوں کو ختم کرنے والے دہشت پسند گروہ کا ممبر تھا اور بدچلن تھا اور اس گروہ کی پشت پناہی چند ایک مذہبی لیڈر کر رہے تھے۔ مقتول کے کنبے سے فارغ ہوئے تو پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی۔ انسپکٹر راجرز نے ایک کارروائی یہ کی کہ مقتول کے باپ نے جس سناتنی پنڈت کا نام پتہ بتایا تھا، اس کے پیچھے سی آئی ڈی اور مخبر لگانے کا انتظام کر دیا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ یہ افراد مسلمان ہونے چاہئیں کیونکہ ہندو دھوکا دے جائیں گے۔ اس نے تین مسلمان بلوائے۔ ان میں ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا اور دو سویلین تھے یعنی وہ پولیس کے صرف ملازم تھے کانسٹیبل نہیں تھے۔ میں نے انہیں مسلم کش تحریک کے متعلق تفصیل سے بتایا اور انہیں بہت سی ہدایات دیں۔ اس ہندو کو پکڑنا نہیں تھا، اس کی حرکات اور سرگرمیاں دیکھنی تھیں تاکہ کچھ اور لوگ بھی سامنے آجائیں۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ موت گلا ہاتھوں سے دبانے سے واقع ہوئی ہے۔ جسم پر خراشیں اور زخم ریل گاڑی سے گرنے کے تھے۔ موت کا جو وقت بتایا گیا تھا وہ تقریباً وہی تھا جو ہوڑا

ایک پولیس کا وہاں سے گزرنے کا تھا۔ اس رپورٹ میں انکشاف والی کوئی بات نہیں تھی.... مقتول کے خاندان کے افراد کو ساتھ لے کر ہم اُس کے گھر گئے اور گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ہر ایک ٹرنک، سُوٹ کیس اور ہر ایک برتن بھی دیکھا۔ کچھ بھی نہ ملا۔ انسپکٹر راجرز نے لاش اور گھر مقتول کے لواحقین کے حوالے کر دیا۔ ہم نے انہیں سختی سے بتایا کہ اگر انہیں کہیں سے کوئی دھمکی ملے یا ان کے ہاں کوئی اجنبی آدمی آئے تو فوراً اطلاع دیں۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ کسی سے ذکر تک نہ کریں کہ ہم نے ان سے کچھ پوچھا ہے۔ ہم نے وہاں سے پولیس کا پہرہ ہٹا دیا لیکن بغیر وردی افراد کا پہرہ لگا دیا جنہیں نظر رکھنی تھی کہ گھر میں کون آتا ہے۔ دس بغیر وردی افراد کو اس کام پر مقرر کیا کہ جب مقتول کو جلانے کے لیے مرگھٹ لے جائیں تو ساتھ جانے والے لوگوں میں شامل ہو کر ہر ایک آدمی کی باتیں سُنیں اور ان سے باتیں کریں۔ اگر کوئی آدمی مشکوک ہو تو اس کا پیچھا کریں۔

خُوشبو والی لڑکی کون تھی ؟

اِدھر سے فارغ ہُوئے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ریلوے سٹیشن سے پوچھا کہ بوگی آئی ہے یا نہیں۔ ابھی نہیں آئی تھی۔ سٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ اُس سٹیشن پر فالتو انجن نہیں تھا جہاں سے بوگی لانی تھی۔ اگلے جنکشن سے انجن کا انتظام کرتے وقت لگ گیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق بوگی کے آنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔ انسپکٹر راجرز نے مجھے کہا کہ مَیں کھانا کھا کر آرام کر لوں اور رات دو بجے اس کے پاس آ جاؤں.... تھکن اور بھوک نے بُرا حال کر دیا تھا۔ مَیں نے جا کر نہایا اور کھانا کھایا مگر نیند نہ آئی۔ یہی ایک خیال انگارے کی طرح ذہن میں دہک رہا تھا کہ ہندو اسلام کا نام و نشان مٹانے کے لیے خفیہ طور پر کیا کچھ کر رہے ہیں۔ یہ تو مَیں جانتا تھا کہ ہندو ہمارا بدترین دشمن ہے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہندو لیڈروں کے عزائم یہ ہیں کہ وہ انگریزوں

سے ہندوستان کو آزاد کرا کے اس کے حاکم بن جائیں۔ مَیں پولیس میں رہا ہوں اور پولیس کے ایسے خفیہ شعبوں میں بھی رہا ہوں جہاں سیاسی لیڈروں کے سینوں کے راز پہنچ جایا کرتے تھے۔ ان سے پتہ چلتا تھا کہ ہندوؤں کی سوچیں اور ارادے کیا ہیں۔ اس میں ذرّہ بھر شک نہیں کہ ہندو کے منہ میں رام رام اور بغل میں چھری ہوتی ہے۔ ہندو ہمارا کبھی دوست نہیں رہا نہ کبھی ہوگا کیونکہ مسلمانوں سے نفرت کرنا اور مسلمانوں کو ہر شعبے میں نقصان پہنچانا ہندو کا مذہبی فریضہ ہے۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہندو ان کا کیا حال کرتے۔ یہ صرف مَیں بتا سکتا ہوں یا پولیس کے وہ افسر بتا سکتے ہیں جنہوں نے ہندو کے سینے کے راز معلوم کیے تھے۔

اُس وقت ۱۹۳۹ء میں، پاکستان کا تو نام بھی سامنے نہیں آیا تھا اور مسلمانوں کے سامنے کوئی واضح منزل نہیں تھی۔ ہماری لیڈرشپ بھی ابھی کُھل کر سامنے نہیں آئی تھی اس لیے مَیں اُس رات بہت پریشان تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ مَیں یہی کچھ کر سکتا تھا کہ ہندو کی اس مُسلم کش تحریک کے زیادہ سے زیادہ افراد اور ان کے لیڈروں کو گرفتار کروں اور انہیں تفتیش کے بہانے ایسی اذیت میں ڈالوں کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی اسلام دشمنی سے توبہ کر لیں.... مَیں یہی کچھ سوچتا رہا اور بے چین رہا۔ انہی سوچوں میں ڈیڑھ بج گیا۔ مَیں نے کپڑے بدلے، ریوالور جیب میں ڈالا اور انسپکٹر راجرز کے دفتر میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ آ گیا اور ہم دونوں ریلوے سٹیشن چلے گئے۔ اُس زمانے میں ہر سرکاری محکمے میں ہر فرد ڈیوٹی پر مستعد رہتا تھا۔ اگر آج پاکستان میں ایسی کارروائی کی ضرورت محسوس ہو کہ سینکڑوں میل دُور سے ایک بوگی لائی جائے تو کارروائی سُرخ فیتے کی نذر ہو جائے اور محض ٹالنے کی خاطر دفتری چکر شروع ہو جائیں۔ اُس وقت یہ عالم تھا کہ رات دو بجے اتنے بڑے سٹیشن کا سٹیشن ماسٹر اپنے تمام تر عملے کے ساتھ موجود تھا۔ بوگی کو وصول کرنے کے لیے اس

نے نہایت موزوں جگہ خالی کرا رکھی تھی اور ریلوے پولیس کی گارد مستعد کھڑی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ پچھلے سٹیشن سے بوگی ٹرین تھرو ہو آئی ہے اور پہنچنے والی ہے۔ سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا۔

بوگی آگئی۔ انسپکٹر راجرز نے سٹیشن ماسٹر کو یہ سہولت دے دی کہ وہ پورا پلیٹ فارم نہ روکے جہاں اسے سہولت ہو وہاں بوگی کو لے جائے تاکہ آنے جانے والی گاڑیوں کو رکاوٹ نہ ہو۔ اس کے مطابق بوگی کو ایک اور جگہ لے گئے۔ اس کے ساتھ پولیس کی گارد تھی۔ سیکنڈ کلاس کے دروازے کی مہر توڑ کر میں اور انسپکٹر راجرز اندر گئے۔ روشنی کا انتظام کرا لیا۔ اس سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی چھ سیٹیں تھیں۔ تین نیچے تین اوپر۔ نیچے والی ایک سیٹ پر بستر بچھا ہوا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر بڑا چھپا کمبل پڑا تھا۔ اس سیٹ کے نیچے شوز کا ایک جوڑا تھا۔ بستر والی سیٹ کے نیچے زنانہ سینڈل کا ایک جوڑا پڑا تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اس بستر کے سرہانے کو سونگھا۔ وہاں وہی خوشبو تھی جو میں نے مقتول کے کوٹ سے سونگھی تھی۔ یہی خوشبو دوسری سیٹ پر پڑے ہوئے کمبل میں تھی۔ انسپکٹر راجرز نے بھی خوشبو سونگھی اور اس نے میری تائید کی کہ خوشبو وہی ہے جو لاش کے کوٹ کے ساتھ تھی۔ بستر والی سیٹ کے نیچے ایک سوٹ کیس رکھا تھا۔ فرش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جو میں نے اُٹھا لیے۔ بستر پر یقیناً لڑکی تھی۔ میں نے اور انسپکٹر راجرز نے بستر کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس کے سرہانے کی طرف نیچے سے ایک پرس نکلا۔ سارے کمپارٹمنٹ کو ہم نے گہری نظروں سے دیکھا۔ پولیس جائے واردات پر بے شمار چیزیں دیکھا کرتی ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ سے ان سب کا ذکر کیا جائے۔ میں آپ کو موٹی موٹی اشیاء بتاتا ہوں تاکہ آپ کو کہانی سمجھنے میں آسانی ہو۔ آپ نے میری تفتیشی کہانیوں میں دیکھا ہو گا کہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا کئی کہانیوں میں ذکر آیا ہے۔ چوڑیاں اور عورت کا ایک آدھ بال دو ایسی چیزیں ہیں جو ایسے موقعۂ واردات پر ضرور ملتی ہیں جہاں عورت پر زیادتی ہوئی ہو اور اگر زیادتی یا ہاتھا پائی زیادہ ہوئی ہو تو ٹوٹی ہوئی چوڑیوں

کے ساتھ دو چار بال بھی مل جاتے ہیں۔ مجرم اتنی جلدی میں ہوتے ہیں کہ موقعۂ واردات سے ان اشیاء کو غائب نہیں کر سکتے نہ جرم کے دوران انہیں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ہوش ہوتا ہے۔ اس واردات کے مقام سے بھی ہمیں چوڑیوں کے ٹکڑے ملے جو ہم نے اُٹھا لیے۔

دوسری کام کی چیز پرس تھا۔ پرس میں کم و بیش سات سو روپیہ نقدی تھی۔ ایک ریشمی رومال تھا اور سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ لیکن ریزرویشن ٹکٹ ساتھ نہیں تھا۔ انسپکٹر راجرز نے مجھے کہا —— "یہ ہے تمہارا پانچواں پیسنجر جو ریزرویشن کے بغیر سفر کر رہا تھا۔ ٹکٹ امرتسر سے کلکتہ تک کا تھا۔ لڑکی کے سینڈل اور پرس اور مقتول کے کوٹ کے ساتھ اس کی خوشبو بتاتی تھی کہ لڑکی مقتول کی ہمسفر تھی مقتول کے کوٹ کے ساتھ لڑکی کی خوشبو یہ بھی بتاتی تھی کہ وہ دونوں جب اس کمپارٹمنٹ میں اکیلے رہ گئے تو لڑکی مقتول کے اتنے قریب بیٹھی رہی کہ اس کی خوشبو مقتول کے کوٹ میں بھی چلی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی بے تکلفی تھی۔ انسپکٹر راجرز کہتا تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقتول نے لڑکی کے ساتھ زبردستی کی ہو اور چھٹے پیسنجر نے اسے جان سے مار کر گاڑی سے نیچے پھینک دیا ہو۔ یہ ممکن تھا کہ کمپارٹمنٹ میں چھٹا پیسنجر بھی ہو جو ریزرویشن کے بغیر سفر کر رہا ہو۔ مقتول کے چھوٹے بھائی کے بیان کے مطابق مقتول نے اس کی بیوی پر مجرمانہ حملہ کیا تھا اور اس کی رائے کے مطابق مقتول اس جرم کا عادی تھا۔ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اُس نے چلتی گاڑی میں بھی یہی حرکت کی ہو گی لیکن میرا موقف یہ تھا کہ جس جگہ سے مقتول کی لاش ملی اس سے اگلے سٹیشن (سٹاپ) پر یہ کمپارٹمنٹ خالی تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی اور اس کے ساتھ اگر کوئی اور تھا تو وہ کلکتہ تک نہیں گئے، راستے میں ہی اُتر گئے۔

ہم نے سوٹ کیس کھولا تو اس میں سے لڑکی کے دو جوڑے کپڑے اور ان کے ساتھ دو دوپٹے اور ضرورت کی چند اشیاء برآمد ہوئیں اور زیورات کا ایک ڈبہ نکلا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک ہار، بُندوں کی ایک جوڑی، دو انگوٹھیاں، دو وزنی چوڑیاں اور دو تین اور زیورات پڑے ہوئے تھے،

یہ سب سونے کے تھے۔ آپ نے زیورات کے ڈبے دیکھے ہیں۔ ہر ڈبہ صرف ایک چیز کے لیے ہوتا ہے۔ ڈبے میں ایک گتہ اُبھرا ہُوا ہوتا ہے، جس پر مخمل چڑھا ہوتا ہے۔ سوٹ کیس میں سے جو ڈبہ نکلا وہ غالباً ہار کا تھا۔ اس میں سے مخمل والا گتے والا حصہ نکلا ہُوا تھا۔ غالباً تمام زیورات کے لیے جگہ بنانے کے لیے ڈبے کا یہ حصہ نکالا گیا تھا۔ ڈبے کے ڈھکنے کے اندر امرتسر کے ایک صراف کا نام پرنٹ کیا ہُوا تھا۔ مجھے یہ نام یاد نہیں رہا۔ بہرحال نام پیارے لعل" کی طرح کا کوئی نام تھا اور دکان کا ایڈریس بھی پرنٹ کیا ہُوا تھا۔۔۔۔ ان زیورات سے دو انکشاف ہوئے۔ ایک یہ کہ لڑکی امرتسر کی رہنے والی ہے اور دوسرا یہ کہ یہ راہزنی یا ڈاکے کی واردات نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو زیورات اور پرس کی نقدی غائب ہوتی۔ مقتول کی جیب سے بھی تقریباً دو سو روپیہ رقم برآمد ہُوئی تھی۔

لڑکی حیوان تھی

ہم نے کمپارٹمنٹ کو پھر سیل کر دیا۔ بوگی کے ساتھ آئی ہُوئی گارد کی واپسی کا انتظام کیا اور بوگی پر پہرہ کھڑا کر کے تمام اشیاء اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے۔ انسپکٹر راجرز نے مجھے ذرا آرام کے لیے چھٹی دے دی۔ آرام کیا کرنا تھا۔ رات تقریباً گزر گئی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے واپس ہیڈ کوارٹر پہنچنا تھا۔ مَیں جا کے سو گیا۔ اردلی نے وقت پر جگا دیا۔ تیار ہو کر انسپکٹر راجرز کے دفتر میں گیا تو دیکھا کہ وہ اس حالت میں دفتر میں موجود تھا کہ کُرسی پر بیٹھا ہُوا اور ٹانگیں میز پر رکھے ہُوئے گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ اس نے رات والے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ مَیں اسے جگانا نہیں چاہتا تھا لیکن اُس کا خانساماں اُس کے لیے ناشتہ لے کر آ گیا اور وہ جاگ اُٹھا۔ معلوم ہُوا کہ مجھے آرام کے لیے بھیج کر وہ دفتر میں بیٹھا تفتیش کے مختلف راستوں اور پہلوؤں پر غور کرتا رہا اور کُرسی پر ہی سو گیا۔ اُس نے رات کو ہی اپنے خانسامے کو اطلاع بھیج دی تھی کہ اس کا ناشتہ دفتر میں ہی لے آئے۔ یہ لوگ فرض کی ادائیگی کے بڑے

ہی پکے تھے۔ اس انگریز نے تہیہ کر لیا تھا کہ تفتیش مکمل کر کے آرام کرے گا۔ مَیں نے اس میں یہ وصف نوٹ کیا کہ وہ کوئی غیر معمولی طور پر ذہین اور قابل سراغرساں نہیں تھا۔ مَیں نے اس کے سوالات اور اس کی جرح غور سے سنی تھی۔ اس میں مجھے کوئی خصوصیت نظر نہیں آئی تھی۔ خصوصیت صرف یہ تھی کہ کام میں دیانتدار تھا اور کام کی خاطر آرام قربان کر دیتا تھا۔ اس کے ہاں — "اچھا یہ کام کل کر لیں گے" — والی خامی نہیں تھی۔ یہی اس کی قابلیت تھی۔ اس نے چند گھنٹوں میں لاہور سے کلکتہ تک کے علاقے کو اپنی تفتیش کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انگریزوں کے انہی اوصاف (دیانتداری، محنت اور فرض شناسی کا جنون) نے انہیں آدھی دنیا کا بادشاہ بنا دیا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی اور مسکرا کر بولا — "مَیں نے بہت سو لیا ہے۔ پورے پچیس منٹ۔ اب میں تازہ دم ہو گیا ہوں" — اس کے چہرے پر شب بیداری اور تھکن کے گہرے اثرات تھے۔ ناشتے کے دوران اس نے نہایت شگفتہ لہجے میں کہا — "ہندوستانی لوگ جرم سے پہلے پلان نہیں بناتے۔ خدا کے بھروسے جو دماغ میں آئے کر گزرتے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ وہ کمپارٹمنٹ میں کتنا سراغ چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں پکڑنا پھر بھی آسان نہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ انہیں کہاں ڈھونڈو گے؟ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ہم اُس ٹھکانے تک پہنچ جائیں گے جہاں سے ملزم چلے تھے" — اس نے کہا — "انسپکٹر خان! مَیں آپ کی تعریف کروں گا کہ تفتیش اور سراغرسانی کے فن میں آپ نے مہارت حاصل کر لی ہے لیکن آپ کی مہارت ابھی نامکمل ہے۔ آپ کو رنگوں کے انتخاب سے اور عطر کے انتخاب سے ملزم کی نفسیات معلوم کرنے کا فن نہیں آتا۔ آپ نے یہ کمال تو کر دکھایا ہے کہ بدبُودار لاش میں سے خوشبو سونگھ لی تھی اور اس سے سو فیصد صحیح قیاس آرائی کی کہ مقتول کے ساتھ لڑکی تھی۔ آپ کی نظر بہت گہری گئی۔ آپ نے چوڑیوں کے ٹکڑے اُٹھا لیے اور سوٹ کیس میں پڑے ہوئے لڑکی کے کپڑے دیکھ لیے لیکن آپ نہیں بتا سکتے کہ لڑکی مزاج اور طبیعت کی کیسی ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں لڑکی کو دیکھے بغیر نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کیسی ہے۔ انسپکٹر راجرز نے کہا ——— "اگر لڑکی کو یہ عطر پسند تھا جس کی خوشبو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہے اور اگر اُسے چوڑیوں کا یہ رنگ پسند تھا اور اگر اُسے کپڑوں کے وہ رنگ پسند تھے جو آپ نے اُس کے سوٹ کیس میں دیکھے ہیں تو لڑکی پاک ذہن کی نہیں ہو سکتی۔ اس پر حیوانی جذبہ غالب ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ مقتول کے ساتھ گھر سے بھاگ رہی تھی۔ اسی لیے زیورات اور اتنی زیادہ نقدی اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ یہ اس کے حیوانی جذبے کی شدت کی دلیل ہے کہ اُس نے مقتول جیسے دہشت پسند اور مجرمانہ طور پر دلیر آدمی کو پسند کیا۔ ہندوستانی لوگ شوخ اور تیز رنگ پسند کرتے ہیں۔ یہ ان کی انتہا پسندی کا ثبوت ہے۔ جوش میں آ کر انتہائی خطرناک جرم یا کارروائی کر گزرتے ہیں اور پھر پچھتانے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ جرم اور پچھتاوے کے درمیانی راستے کو قبول ہی نہیں کرتے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لڑکی جذبات سے مغلوب ہو کر مقتول کے ساتھ جا رہی تھی یا وہ بھی 'ماتا' کی دہشت پسند ممبر تھی اور کسی مشن پر جا رہی تھی۔ بہرحال یہ پیشِ نظر رکھیں کہ لڑکی مقتول کی طرح بے لگام ہے۔ وہ نارمل ذہن کی لڑکی نہیں۔"

"اگر یہ واردات قتل کی عام سی واردات نکلی تو مجھے مایوسی ہوگی۔" میں نے کہا ——— "میں اس گروہ کے زیادہ سے زیادہ افراد کو پکڑنے اور انہیں کالا پانی (جزائر انڈیمان) بھجوانے کو بے تاب ہوں۔ آپ مجھے جذباتی کہیں۔ میں آپ کا ملازم ہوں۔ میری وفاداری میں آپ کو شک نہیں ہوگا لیکن میں یہ نہیں بھول سکتا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ لوگ میری قوم اور میرے مذہب کے دشمن ہیں۔ آپ بے شک اپنا فرض ادا کر رہے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں جیسے آپ میرے دشمنوں کو پکڑنے میں میری مدد کر رہے ہیں۔ میں آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ کیس میرے ذاتی وقار کا مسئلہ ہے۔"

"میرے اپنے جذبات آپ سے ملتے جلتے ہیں" ——— اُس نے کہا ——— "میں سلطنتِ برطانیہ

کا محافظ ہوں۔ میں جب ہندوستان آنے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو مجھے یہاں کی مختلف قوموں کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا تھا۔ ہندوؤں کے متعلق بتایا گیا تھا کہ مکار، عیار اور موقع پرست قوم ہے۔ اس کی انہی خصلتوں کو اُبھارو اور انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرو۔ مسلمانوں کے متعلق بتایا گیا تھا کہ یہ سپاہیوں کی قوم ہے۔ زبان سے کم اور ہاتھوں سے زیادہ بولتی ہے۔ یہ قوم ہندوستان کی فوجی قوت ہے۔ عقل اور فہم و فراست بھی رکھتی ہے۔ اس کے یہی اوصاف اپنے مقصد کے لیے استعمال کرو۔ میں نے گزشتہ ایک سال میں یہ رائے قائم کی ہے کہ مسلمان قابلِ قدر قوم ہے اور قابلِ اعتماد بھی، اس لیے میری دلچسپیاں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ آج کسی ہندو پولیس افسر نے میرے سامنے ذاتی وقار کا نام نہیں لیا۔ آپ چوتھے مسلمان افسر ہیں جنہوں نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ ان کا ذاتی وقار بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ لوگوں کا یہ وصف مجھے بہت پسند آیا ہے" ——— اُس نے اس قسم کی کچھ اور باتیں کیں اور گھڑی دیکھ کر کہنے لگا ——— "ہم دونوں جذباتی ہو گئے ہیں۔ آپ فوراً اپنا بستر اور اٹیچی وغیرہ لے آئیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی سے ایک کانفرنس کرنی ہے اور اُس کے فوراً بعد ہمیں امرتسر کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اب ہماری تفتیش امرتسر اور لاہور میں ہوگی۔"

میں تیاری کے لیے اپنے کوارٹر میں گیا۔ ضروری سامان اُٹھوا کر واپس گیا تو انسپکٹر راجرز تیار تھا۔ اس نے دفتر میں ہی شیو بنائی۔ وہیں نہایا اور اس کا سامان بھی آ گیا۔ ایک انگریز ڈی۔ ایس۔ پی اور ایک انگریز انسپکٹر، انسپکٹر راجرز کے کمرے میں آ گئے۔ ہماری چاروں کی کانفرنس شروع ہوئی۔ انسپکٹر راجرز نے واردات اور تفتیش کی تفصیل سنائی۔ برآمد شدہ اشیا سب کو دکھائیں اور تفتیش کا اگلا مرحلہ واضح کیا جس پر ہم روانہ ہو رہے تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی بوڑھا انگریز تھا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ یہ گروہ جو 'ماتا' کہلاتا ہے ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا۔ یہ ابھی ابتدائی مرحلوں میں ہے۔ اس کے عزائم ہر دہشت پسند تحریک کی طرح خطرناک ہیں۔ اُن کی زیرِ زمین کارروائیوں کا زیادہ تر نشانہ

مسلمان میں لیکن یہ حکومت کو بھی پریشان کریں گے۔ انہیں ختم کرنا اس لیے زیادہ ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی دہشت پسند تحریک انہیں اپنے ساتھ ملا لے گی اور یہ خطرہ تو موجود ہی ہے کہ جرمنی کے تباہ کار جاسوس انہیں استعمال کریں گے۔ اس امکان کو نظرانداز نہ کریں کہ جرمن جاسوس سرگرم ہو گئے ہیں۔ سول اور ملٹری انٹیلی جنس ہمہ تن مصروف ہے۔ آپ لوگ اس واردات کو صرف قتل کی واردات نہ سمجھیں۔۔۔۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے ہمیں بہت سی ہدایات دیں۔ دوسرے انگریز انسپکٹر نے بھی کچھ مشورے دیئے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے بتایا کہ وہ امرتسر اور لاہور کے ڈپٹی کمشنروں کو اور فوج کے اعلیٰ افسروں کو بذریعہ فون ہمارے متعلق بتا دے گا۔

انسپکٹر راجرز نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔ اُس نے صبح سویرے ریلوے سٹیشن والوں سے فون پر کہہ کر فرسٹ کلاس کی دو سیٹیں بک کرا لی تھیں۔ ہم نے اپنا سامان اور برآمد شدہ اشیاء میں سے جن کی ضرورت سمجھی ساتھ لے لیں اور ریلوے سٹیشن پہنچے۔ انسپکٹر راجرز نے مجھے بھی فسٹ کلاس کے سفر کی عیاشی کرائی۔

لڑکی چلتی گاڑی پر سوار ہوئی

امرتسر کے ڈپٹی کمشنر نے ریلوے سٹیشن پر ہمارے استقبال کے لیے اپنا نمائندہ اور ایک انگریز پولیس انسپکٹر بھیج دیا تھا۔ ہمارے ڈی۔ ایس۔ پی کی ہدایت کے مطابق وہاں ہماری رہائش کا خفیہ انتظام کر دیا گیا تھا۔ ہم وردی میں نہیں تھے نہ ہمیں وردی پہننی تھی۔ یہ انتظام بھی کرا لیا کہ ہم جہاں بھی جائیں رائفلوں سے مسلح لیکن بغیر وردی پولیس کے ہوشیار اور ذہین افراد ہمارے اردگرد موجود رہیں۔ خطرہ یہ تھا کہ دہشت پسند کہیں نہ کہیں ہم پر وار کریں گے۔ اُن کا وار خفیہ ہوتا تھا۔ ہم نے ممکن حد تک اس کی پیش بندی کر لی تھی۔۔۔۔ ہم نے تفتیش کا آغاز ریلوے سٹیشن سے کیا۔ سٹیشن ماسٹر کو گاڑی کا

دن اور وقت بتا کر کہا کہ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ یہاں سے ایک عورت سیکنڈ کلاس میں سوار ہوئی تھی۔ کیا اُس نے سیٹ ریزرو کرائی تھی یا نہیں اور وہ کون تھی۔ سٹیشن ماسٹر نے بکنگ کلرک کو بلایا۔ اس کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ اُس نے اپنا ریکارڈ دیکھا۔ ذہن پر زور دیا اور بتایا کہ حامد علی خان نام کے ایک آدمی نے دو روز پہلے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور اس کے لیے سیٹ ریزرو کرائی گئی تھی جس تاریخ کی اُس کی سیٹ ریزرو ہوئی تھی اُس روز ایک لڑکی نے ہوڑا ایکسپریس کے آنے سے دو اڑھائی گھنٹے پہلے سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا تھا۔ یہ دونوں ٹکٹ امرتسر سے کلکتہ تک تھے۔ میں نے لڑکی کے پرس سے برآمد کیا ہوا ٹکٹ بکنگ کلرک کے ریکارڈ سے ملایا۔ اُسے یہی ٹکٹ دیا گیا تھا۔

بکنگ کلرک کو یہ لڑکی اس لیے اچھی طرح یاد تھی کہ ابھی تین چار روز ہی گزرے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں سیکنڈ کلاس کا مسافر کوئی کوئی ہوتا تھا۔ تیسری وجہ یہ کہ وہ لڑکی تھی جو اُس کے کہنے کے مطابق جوان، خوبصورت اور شوخ تھی اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ بکنگ کلرک نے لڑکی سے کہا تھا کہ اتنے لمبے سفر کے لیے وہ سیٹ بک کرا لے تاکہ راستے میں اُسے تکلیف نہ ہو لیکن لڑکی نے کہا تھا کہ ریزرویشن میں وقت لگے گا اور اُسے اسی گاڑی سے جانا ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اُس زمانے میں گاڑیوں میں رش نہیں ہوتا تھا۔ ایکسپریس اور میل گاڑیاں بڑے سٹیشنوں پر رکتی تھیں تو سٹیشن کا عملہ پلیٹ فارم پر موجود رہتا تھا اور فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے مسافروں پر زیادہ توجہ دیتا تھا کیونکہ اُن دنوں انگریز افسر سفر کرتے تھے جن کے متعلق خیال رکھا جاتا تھا کہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس لڑکی کو ریلوے سٹاف کے دو آدمیوں نے اس طرح گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا کہ انجن نے وسل دی تو وہ گیٹ پر نمودار ہوئی۔ دوسری وسل پر وہ انجن کی طرف چلی اور گاڑی چل پڑی تو وہ دوڑ پڑی اور سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئی۔ بوگی انجن کی طرف سے تیسری تھی۔

ہم نے اُس شام کی ڈیوٹی والے ریلوے سٹاف کو بلوا لیا تھا۔ وہ نہایت کارآمد باتیں بتا رہے تھے۔ ایک نے بتایا کہ اُس نے ساجد علی خان نام کے مسافر کو ساتھ جا کر اُس کی سیٹ والا کمپارٹمنٹ دکھایا تھا۔ اُس وقت اس کمپارٹمنٹ میں تین اور مسافر تھے۔ ہمارے پوچھنے پر ہمیں بتایا گیا کہ پلیٹ فارم پر بہت تھوڑے لوگ تھے۔ گاڑی شام اندھیری ہونے کے بعد امرتسر پہنچتی تھی (مجھے صحیح وقت یاد نہیں رہا)۔ سٹاف کے ایک آدمی نے بتایا کہ اُس نے لڑکی کو دوڑ کر سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سوار ہوتے دیکھا اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ دو سکھ اس کے قریب ہی کھڑے تھے۔ ایک نے کہا ــــ "وہ جا رہی ہے" ــــ وہ دونوں دوڑے لیکن گاڑی تیز ہو چکی تھی اس لیے وہ چھٹی یا ساتویں بوگی کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے۔ یہ آدمی اُن دونوں سکھوں کو نہیں پہچان سکا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو بتایا تھا کہ اس نے یہ تماشہ دیکھا ہے اور وہ اپنے ساتھی کے ساتھ اس پر تبادلہ خیالات کرتا رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔ سٹاف کے چند اور آدمیوں نے بھی لڑکی کو دیکھا تھا لیکن اُسے جانتا پہچانتا کوئی بھی نہیں تھا۔

ہم نے ریلوے سٹاف سے کہا کہ وہ قلیوں اور دیگر افراد سے پوچھتے رہیں کہ ان میں کوئی اس لڑکی کو پہچانتا ہے؟ امرتسر پولیس کے مخبر بھی ہمارے بلانے پر آئے ہوئے تھے۔ اُن کے سپرد بھی ہم نے یہی کام کیا کہ معلوم کریں کہ وہ لڑکی کون تھی ـــــ میں اور انسپکٹر راجرز صراف کی دکان پر چلے گئے۔ زیورات کے ڈبے کے اندر اس کا نام پرنٹ کیا ہوا تھا۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور اُسے بتایا کہ وہ پوری دیانتداری سے ہماری مدد کرے اور کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرے ورنہ اُسے نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ میں نے ڈبہ کھول کر اُس کے آگے رکھ دیا اور کہا کہ یہ زیورات اُس کی دکان کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا خریدار کون تھا؟ اُس نے زیورات کو ایک نظر دیکھ کر کہہ دیا کہ یہ اُسی کی دکان کا مال ہے لیکن اُسے گاہک یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنا رجسٹر اور کاغذات دیکھے اور یاد کرنے کی بھی کوشش کی۔ آخر اُس نے کہا کہ

یہ کم و بیش ایک سال پہلے کی فروخت ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ بالکل اسی ڈیزائن اور وزن کے چار ہار اور بالکل ایسی ہی چوڑیاں (جو دراصل کڑے تھے) اُس نے چار گاہکوں کے ہاتھ فروخت کی ہیں۔ ان میں ایک جوان لڑکی تھی جو اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ باقی تین مرد تھے۔ اُسے کسی کا بھی ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ اس نے سامنے والے دکاندار کو بُلایا۔ وہ بھی صراف تھا۔ اُس نے اس سے پوچھا کہ ایک ماں بیٹی اس کی دکان میں دو تین بار آئی تھی۔ پہلی بار انہوں نے زیورات خریدے تھے پھر کچھ ٹھیک کرانے آئی تھیں۔

دونوں دکانداروں نے یاد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ پھر ایک اور دکاندار کو بُلایا گیا۔ لڑکی کا حُلیہ بتایا گیا۔ پھر ایک اور دکاندار کو بلایا گیا۔ اس چوتھے دکاندار نے کہا ــــ "اگر تم اُس لڑکی کی بات کر رہے ہو جو یہاں سے اکثر گزرا کرتی ہے تو وہ سردار سُرجیت سنگھ کی بیٹی ہے" ــــ اس نے یہ بھی کہا کہ یہاں سے ہندوؤں اور سکھوں کی لڑکیاں تو گزرتی ہی رہتی ہیں۔ اس کے متعلق اُسے اس لیے خیال آیا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ پہلے اُس کی دکان میں گئی تھی لیکن اُسے کوئی ڈیزائن پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ لڑکی بہت شوخ اور منہ پھٹ سی تھی۔ اُس نے سردار سُرجیت سنگھ کے گھر کا پتہ بھی بتا دیا لیکن معاملہ شک میں تھا۔ میں نے ان سب سے کہا کہ وہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہیں کہ لڑکی کون تھی لیکن یہ احتیاط کریں کہ کسی سے ذکر نہ کریں کہ تفتیش ہو رہی ہے ورنہ مارے جاؤ گے۔

ہم اپنی رہائش گاہ میں چلے گئے۔ انسپکٹر راجرز نے کہا کہ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ لڑکی کلکتے سے بہت پہلے کسی سٹیشن پر اُتر گئی یا اتاری گئی ہے وہ کہاں اُتری ہے۔ ذرا سا آرام کر کے وہ ٹیلیفون پر بیٹھ گیا۔ ہمارے لیے ٹیلی فون کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ انسپکٹر راجرز نے ٹیلی فون ایکسچینج سے کہا کہ وہ کسی اور کو کوئی لائن نہ دیں، اور وہ جو نمبر مانگتا ہے فوراً ملاتے چلے جائیں۔ ہم نے ریلوے ٹائم ٹیبل اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ راجرز نے یہ کھول کر دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ جائے واردات یعنی

جہاں سے لاش ملی تھی کونسی ہے۔ میں نے اُسے بتائی تو اس نے ہوڑا ایکسپریس کا اس سے اگلا سٹاپ دیکھا اور آپریٹر سے کہا کہ وہاں فوراً ملا دے .... اُسے سٹیشن ماسٹر مل گیا۔ اس نے اپنا تعارف کرا کے پوچھا کہ فلاں رات ہوڑا ایکسپریس سے ایک لڑکی اُتری ہوگی۔ اگر وہاں دیکھی گئی ہے تو اُسے امرتسر، فلاں نمبر پر بتا دیا جائے۔ اس کے بعد اُس نے اگلے سٹاپ کا نمبر ملایا اور وہاں پہ بھی یہی کہا۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص کتنے سٹیشنوں سے بات کرے گا۔ کلکتے تک بے شمار سٹیشن تھے جہاں ہوڑا ایکسپریس رُکتی تھی۔ یہ انگریز پاگلوں کی طرح لگا ہُوا تھا اور ایکس چینج کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ دو گھنٹوں بعد وہ اُس اسٹیشن پہ پہنچا جہاں بوگی گاڑی سے الگ کر کے دلی بھیجی گئی تھی۔ اُسے کہیں سے بھی تسلی بخش جواب نہ ملا۔

ہم لڑکی کے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے کہ ایک ہندو سب انسپکٹر ایک مُخبر کو ساتھ لایا۔ مُخبر نے بتایا کہ وہ لڑکی سردار سُرجیت سنگھ کی بیٹی تھی۔ اُسے ایک ریلوے گارڈ کے بیٹے نے دیکھا تھا۔ وہ لڑکی کو پہچانتا ہے۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ لڑکے کو بھی ساتھ لانا تھا۔ اُس نے اُسی وقت مُخبر کو بھگا دیا۔ انسپکٹر راجرز نے اُسے ڈانٹ کر کہا کہ شہادت تو ساتھ لاتے .... لڑکا آگیا۔ وہ سولہ سترہ سال کی عمر کا لڑکا تھا۔ بات کرتے جھجکتا اور ڈرتا تھا۔ میری حوصلہ افزائی پہ اُس نے بتایا کہ وہ لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ لڑکیوں میں دلچسپی لینے والے نوجوانوں میں سے تھا۔ یہ لڑکی دلکش قسم کی تھی۔ ایف۔ اے کر کے اُس نے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ سیاست میں دلچسپی لیتی تھی اور ایسی ہی سرگرمیوں کی بدولت مشہور ہو گئی تھی۔ اس لڑکے نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اس لڑکی کو رات دیر سے گھر جاتے بھی دیکھا ہے۔ اُس کا نام دلجیت کور تھا اور کوی کہلاتی تھی۔ اس لڑکے نے اُسے ہوڑا ایکسپریس پہ سوار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ چونکہ ریلوے کوارٹروں میں رہتا تھا جو ریلوے سٹیشن کے ساتھ ہی تھے اس لیے تفریحِ طبع کے لیے ریل گاڑیاں دیکھنے کبھی کبھی پلیٹ فارم پہ چلا جاتا تھا۔

اس نے لڑکی کو ریلوے سٹیشن کی حدود میں داخل ہوتے دیکھا تو اُس کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے لڑکی کو بالکل اسی طرح گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا جس طرح ریلوے سٹاف کے افراد نے بتایا تھا۔ لڑکی کے چال چلن کے متعلق وہ کوئی ایسی رائے نہ دے سکا جسے قابلِ اعتماد کہا جاسکتا۔ اُس نے کہا کہ کالج کے بعض لڑکوں کے ساتھ اُس کا دوستانہ تھا۔ مشہور یہی تھا کہ لڑکی اچھے چلن کی نہیں۔

اس لڑکے نے بھی اُس کے باپ کا نام سردار سُرجیت سنگھ بتایا جو امرتسر کا ایک مالدار تاجر تھا۔ لڑکی کے دو بھائی تھے۔ ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ لڑکے نے گھر کا پتہ بتا دیا اور ہمارے کہنے پر ساتھ چلنے کی بھی پیش کش کی۔ ہم نے لڑکے کو یہ کہہ کر چھٹی دے دی کہ وہ گھر سے غیر حاضر نہ رہے کیونکہ کسی بھی وقت اُس کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔ انسپکٹر راجرز ہنسی مذاق کا بھی عادی تھا۔ اُس نے لڑکے کے ساتھ لڑکی کے متعلق مذاق کے لہجے میں دو تین باتیں کیں تو لڑکے کے دل سے ہمارا ڈر نکل گیا.... وہ چلا گیا۔

لڑکی امرتسر میں

ہم دونوں اس مسئلے پر بحث کرنے لگے کہ لڑکی کے گھر چھاپہ مارا جائے یا کچھ اور انتظار کیا جائے۔ انسپکٹر راجرز کا خیال تھا کہ ہمیں لڑکی برآمد کرنی ہے۔ لڑکی راستے میں کہیں اُتر گئی تھی یا اُسے زبردستی اُتار لیا گیا تھا۔ ممکن نظر نہیں آتا کہ وہ یہاں اپنے گھر میں ہو۔ اگر ہمارا چھاپہ ناکام رہا تو اس واردات سے متعلقہ افراد چوکنے ہو جائیں گے۔ اگر لڑکی بھی اس جُرم میں شامل ہے تو رُوپوش ہو جائے گی۔ میں اُس سے متفق تھا اور میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ دو سکھ کون تھے جو لڑکی کے تعاقب میں دوڑے اور گاڑی کی کسی پچھلی بوگی میں سوار ہو گئے تھے؟ میں نے انسپکٹر راجرز سے اس رائے کا اظہار کیا کہ لڑکی جس انداز سے گاڑی میں سوار ہوئی اس سے

دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گاڑی چلنے کے انتظار میں کھڑی رہی۔ گاڑی چلی تو وہ دوڑ کر اُس کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئی جس میں مقتول موجود تھا۔ اس سے دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ وہ مقتول کے ساتھ گھر سے بھاگ رہی تھی۔ اس کے تعاقب میں جانے والے اس کے بھائی ہوں گے جنہیں کچھ دیر پہلے شک ہوا ہوگا کہ اُن کی بہن بھاگ رہی ہے۔ وہ گھر میں اُس کے تعاقب میں چلے ہوں گے۔ انہوں نے ہی راستے میں مقتول کو قتل کیا، گاڑی سے نیچے پھینکا اور لڑکی کو آگے جا کر کہیں گاڑی سے اُتار لیا۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ لڑکی کو وہ واپس لے آتے ہیں یا قتل کر کے کہیں پھینک آتے ہیں۔

"یہ ضروری نہیں کہ وہ اُس کے بھائی ہوں" ——— انسپکٹر راجرز نے کہا ——— "وہ دونوں یا اُن میں سے ایک مقتول کا رقیب ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے دہشت پسند گروہ کے آدمی ہوں اور اُن کی رقابت سیاسی ہو۔ اس صورت میں لڑکی کی تلاش بے سُود ہوگی۔ اُسے قتل کیا جا چکا ہوگا۔ ایک آدھ دن انتظار کر لیا جائے۔"

اب ہم تفتیش کے اُس غار میں داخل ہو گئے تھے جہاں سیاہ کالی تاریکی اور راستوں کی بھول بھلیاں تھیں۔ صرف ایک کارروائی سمجھ میں آتی تھی۔ سردار سُرجیت سنگھ کے گھر پر چھاپہ۔ مگر معاملہ چوپٹ ہونے کا ڈر تھا۔ ہمیں مُخبروں سے کام لینا تھا۔ فوری طور پر مَیں نے یہ کام کیا کہ دو مسلمان مُخبر بُلا کر انہیں سُرجیت سنگھ کے گھر کا پتہ بتایا اور اس گھر پر نظر رکھنے کو کہا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اُس محلے میں ایک مسلمان عورت بھی مُخبری کا کام کرتی ہے، وہ مدد دے گی۔ مَیں نے انسپکٹر راجرز سے بات کر کے اُسے اس عورت کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ اُن دونوں نے وہیں طے کر لیا کہ ایک آدمی غبارے بیچنے کے بہانے جائے گا اور دوسرا چارپائیاں بُننے والے کا بہروپ دھارے گا۔ مَیں نے انہیں ضروری ہدایات دے کر رخصت

کر دیا۔ مخبروں کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو مَیں بیان نہیں کروں گا کیونکہ پاکستان میں بھی مُخبر استعمال ہوتے ہیں۔ مَیں پولیس کا راز فاش نہیں کرنا چاہتا۔

اس بحث اور کارروائی میں بہت وقت گزر گیا۔ دن کے پچھلے پہر ہمارے پاس ایک ریلوے گارڈ آ گیا۔ یہ اُس لڑکے کا باپ تھا جس نے ہمیں لڑکی کے متعلق بتایا تھا۔ گارڈ کو ہم نے اندر بلا لیا۔ اتفاق سے مسلمان تھا اور پنجابی۔ مَیں نے پنجابی میں ہی اُس سے باتیں کیں۔ اُس نے یہ بیان دیا کہ وہ ابھی ابھی ڈیوٹی سے آیا ہے اور اُسے اس کے بیٹے نے بتایا ہے کہ آپ نے اُسے بُلایا تھا۔ گارڈ نے وہ تمام باتیں بتائیں جو ہم نے لڑکے سے پُوچھی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ کل رات گاڑی کے ساتھ آ رہا تھا۔ اُس کی ڈیوٹی لاہور تک تھی۔ گاڑی کلکتہ کی طرف سے آ رہی تھی۔ امرتسر سے کوئی تیس میل دُور کسی سٹیشن پر گاڑی رُکی، تو انٹر کلاس میں اُسے دو سکھ مسافر ٹکٹ انسپکٹر کے ساتھ جھگڑتے نظر آئے۔ وہ رُک گیا۔ ان دو سکھوں کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ جھگڑا یہ تھا کہ یہ لوگ بلا ٹکٹ سفر کر رہے تھے۔ وہ پیسے تو دے رہے تھے لیکن ٹکٹ انسپکٹر کا مطالبہ زیادہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ریلوے قانون کے مطابق چارج کر رہا ہے۔ لڑکی خاموش بیٹھی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ ان سکھوں کے ساتھ نہیں ہے لیکن وہ اُن کے ساتھ تھی۔ گارڈ نے اُن کا جھگڑا طے کرایا۔ وہ امرتسر تک آ رہے تھے۔ گاڑی امرتسر آئی تو گارڈ نے دیکھا کہ وہ سکھ لڑکی کو ہلکے ہلکے دھکے دے کر لے جا رہے تھے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ لڑکی شکل وصورت اور کپڑوں سے شہری اور امیر لگتی تھی لیکن اس کے پاؤں میں جُوتی نہیں تھی۔ گارڈ نے کوئی شک نہ کیا اور اسے کوئی گھریلو جھگڑا سمجھا۔

گارڈ لاہور تک گاڑی لے جا کر واپس امرتسر آیا تو اُس نے ریلوے سٹاف کے دو تین آدمیوں کے ساتھ گپ شپ کے انداز میں اس لڑکی کے متعلق بات کی۔ اُسے بتایا گیا کہ یہ وہی لڑکی

ہوگئی جو چلتی گاڑی پر سوار ہُوئی اور اس کے پیچھے دو سکھ دوڑے تھے۔ وہ لڑکی تک تو نہ پہنچ سکے، پچھلی بوگی میں سوار ہو گئے تھے۔ گارڈ کو یہ بھی بتایا گیا کہ اس لڑکی کا سراغ لگانے کے لیے ایک انگریز اور ایک دیسی پولیس آفیسر یہاں آئے تھے۔ بہرحال ان لوگوں نے اس واقعہ کو اتنی سی اہمیت دی کہ اس کے متعلق مذاق کے انداز سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد گارڈ کو اس کے بیٹے نے بتایا کہ ہم نے اُسے بلایا تھا۔ گارڈ نے ضروری سمجھا کہ وہ ہمیں ملے۔ اُس نے ایک اچھے شہری کا فرض ادا کیا تھا جس سے ہمیں بڑی مدد ملی۔ ہم اس لائن پر سوچنے لگے کہ لڑکی کو واپس لے آتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ لڑکی زندہ ہے یا قتل کر دی گئی ہے۔ مَیں نے انسپکٹر راجرز کو بتایا کہ پنجاب کے مسلمان اور سکھ گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو بخشا نہیں کرتے۔ قتل کر دیتے ہیں۔ انسپکٹر راجرز سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے گارڈ کا شکریہ ادا کر کے اُسے بھیج دیا۔ سوچ سوچ کر اُس نے مجھے کہا — "آج رات دس بجے کے بعد چھاپہ ماریں گے۔ جن آدمیوں کی ضرورت ہے انہیں بلا لو۔"

بہن کو بھائی کنوئیں میں پھینکنے لگے

شام کے بعد ایک مُخبر آیا۔ اُس کے ساتھ وہ عورت تھی جس کا اُس نے ذکر کیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ لڑکی گھر میں ہے اور اُسے قید میں رکھا ہُوا ہے۔ اُسے غالباً مارا پیٹا بھی جا رہا تھا۔ انسپکٹر راجرز نے کہا کہ ابھی چھاپہ مارا جائے۔ ہم دونوں اُٹھے۔ ریوالور جیبوں میں ڈالے۔ بغیر وردی پولیس کے دو آدمی ہم نے اپنے ساتھ رکھے ہُوئے تھے انہیں ساتھ لیا۔ مُخبر کو گائیڈ بنایا اور ہم چل پڑے۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ گھر زیادہ دُور نہیں تھا..... خاصا امیرانہ گھر تھا۔ ہم نے اپنے آدمیوں کو موزوں جگہوں پر کھڑا کر دیا اور دروازے پر دستک دی۔ سردار سُرجیت سنگھ خود ہی باہر آ گیا۔ مَیں نے اپنا اور انسپکٹر راجرز کا تعارف کرایا۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ سوسائٹی میں اُسے لیڈروں جیسا مقام حاصل

تھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ چھپا نہ سکا۔ کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا۔ مَیں نے جب کہا کہ ہم اندر آنا چاہتے ہیں تو اُس نے پوچھا — "کیا کام ہے؟"

انسپکٹر راجرز بھانپ گیا کہ سکھ کس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گیا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ ہم اندر جائیں۔ اس نے مجھے انگریزی میں غصّے سے کہا — "اس داڑھی والے جانور سے کہو کہ ہمارے راستے میں زیادہ دیر کھڑا نہ رہے۔ مَیں اسے دھکّا دے کر اندر چلا جاؤں گا۔ اسے کہو اپنی بیٹی کو باہر لاؤ۔"

وہ انگریزی سمجھتا تھا۔ ایک طرف ہٹ کر مری ہوئی آواز میں بولا — "آجائیں" — ڈیوڑھی کے ساتھ ہی بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ ہمیں وہاں لے جا کر بٹھایا۔ اُس پر ایسی خاموشی طاری تھی جس میں اُس کی بے بسی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ جس باپ کی بیٹی بے لگام ہو جائے وہ تو جیتے جی مر جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت اُس کی ہو رہی تھی۔ مَیں نے اُسے کہا — "آپ کے لیے بڑی تکلیف دہ صورت پیدا ہو گئی ہے لیکن ہماری مجبوری دیکھیں۔ مَیں آپ کی مدد کرنے کی پوری کوشش کروں گا، بشرطیکہ آپ نے تعاون کیا.... دلجیت کور آپ کی بیٹی ہے؟"

"جی!" اُس نے آہ بھرنے کے انداز سے کہا۔

"اُسے باہر لے آؤ" انسپکٹر راجرز نے کہا — "ہمارے سامنے لاؤ۔"

وہ اُٹھا اور سر جھکائے ہوئے اندر چلا گیا۔ انسپکٹر راجرز نے مجھ سے پوچھا "کیا ہمیں اس پر اعتماد کرنا چاہیئے؟ وہ لڑکی کو پچھلے دروازے سے بھگا دے گا۔"

"مَیں نے مکان کے ہر طرف آدمی پوسٹ کر رکھے ہیں" مَیں نے کہا "انہیں پوری ہدایات دے دی ہیں۔ اس گھر سے کوئی نہیں بھاگ سکتا۔"

"یہاں کے مکان ملے ہوئے ہیں" — انسپکٹر راجرز نے کہا — "چھتوں کے اُوپر سے

ذرا آسان ہے۔"

"اس مکان کے پچھواڑے ایک مسلمان کا گھر ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اس کی چھت پر میں نے دو آدمی بٹھا رکھے ہیں۔ تمام چھتیں اُن کی نظر میں ہیں۔ اُن کے پاس ٹارچیں بھی ہیں ریوالور بھی۔"

"وہ ابھی تک آیا نہیں" ـــــ انسپکٹر راجرز نے کہا۔

"صرف دو منٹ انتظار کریں گے" ـــــ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا اور نظریں گھڑی پر ہی رکھیں ـــــ جونہی دو منٹ گزرے، میں اٹھا اور ڈیوڑھی میں جا کر اندر والے دروازے پر دستک بھی دی اور پکارا ـــــ "سردار سُرجیت سنگھ" ـــــ میں نے دروازے سے کان لگائے تو اندر کھسر پھسر سنائی دی۔ میں نے پھر دستک دی اور آواز بھی دی ـــــ آج چھتیس سال بعد میں بہاں کچھ تفصیلات بھول گیا ہوں مجھے پنجابی کے یہ الفاظ اس طرح یاد ہیں جیسے ابھی ابھی سُنے ہیں ـــــ "پھڑ سُو لتاں تے چک لے" ـــــ (اس کی ٹانگیں پکڑو اور اُٹھا لو) ایک مردانہ آواز تھی جو اندر سے سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک زنانہ آواز سخت گھبرائی ہوئی اور غصیلی سنائی دی۔ "اوئے حرام دیو سکی بھین اے، کھوہ وِچ نہ سُٹنا" (او حرامیو! تمہاری سگی بہن ہے اسے کنوئیں میں نہ پھینکنا) اور زنانہ چیخیں اور بڑی کرخت آہ و بکا سُنائی دی۔ پھر ایک مردانہ آواز "وِچ سُٹ دیو۔ ایہنوں میریاں اکھاں توں اوہلے کر دیو" (اندر پھینک دو۔ اسے میری نظروں سے اوجھل کر دو)۔

میں نے چلا کر کہا ـــــ "مسٹر راجرز، میرے پیچھے آؤ" ـــــ میں نے ریوالور نکالا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر کھلا صحن تھا جس کے تین اطراف برآمدے اور کمرے تھے۔ صحن کے ایک کونے میں کنوآں تھا۔ اُس زمانے میں نلکے نہیں تھے یا کم تھے۔ پیسے والے لوگوں نے گھروں میں کنوئیں کھدوا رکھے تھے۔ دو سکھ ایک لڑکی کو اس طرح کنوئیں کی طرف گھسیٹ رہے

تھے کہ ایک نے اُس کے دونوں بازو کلائیوں سے اور دوسرے نے دونوں ٹانگیں ٹخنوں سے پکڑ رکھی تھیں۔ بجلی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ کنوآں تین چار قدم دُور تھا۔ لڑکی شور مچا رہی تھی اور گالیاں بھی دیتی تھی۔ اس کی ماں اپنے بیٹوں کی طرف لپکتی تھی تو ان کا باپ سردار سُرجیت سنگھ اُسے پیچھے کو گھسیٹ لیتا تھا۔ میں نے یہ منظر دو تین سیکنڈ میں دیکھا اور للکار کر کہا ـــــ "چھوڑ دو اسے ورنہ گولی چلا دوں گا" ـــــ وہ مجھ سے پندرہ سولہ قدم دُور تھے۔ میں نے دوڑ کر ایک سکھ کو دھکا دیا۔ انسپکٹر راجرز نے دوسرے کے منہ پر گھونسہ مارا۔ لڑکی اُٹھ بیٹھی۔ ان میں سے کسی نے کہا ـــــ "وڈ دیو ایہناں نوں وی" (انہیں بھی کاٹ دو)۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے ایک برآمدے کی طرف دوڑے۔ وہ بھاگ نہیں رہے تھے، ہتھیار لینے جا رہے تھے۔ میں نے بیک وقت دو کام کیے۔ ان کے پاؤں میں فرش پر ریوالور کی ایک گولی فائر کی اور جیب سے وِسل نکال کر تین دفعہ بجائی۔ انسپکٹر راجرز ہوشیار آدمی تھا۔ باہر گیا اور چار پانچ کانسٹیبلوں کو لے آیا جو وردی کے بغیر تھے۔ سکھ وہیں رک گئے۔ لڑکی حیران اور پریشان کھڑی تھی۔ سردار سُرجیت سنگھ اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ تین چار بچے بھی تھے وہ روتے روتے چُپ ہو گئے تھے ـــــ ہم نے باپ، دونوں بھائیوں اور ان کی بہن کو حراست میں لے لیا۔ لڑکی سے میں نے پوچھا ـــــ "تمہارا نام دلجیت کور ہے؟" ـــــ وہ خوف زدہ تھی۔ اُس نے صرف سر ہلا کر بتایا کہ وہ دلجیت کور ہے۔

"تم گھنشام کے ساتھ کلکتہ جا رہی تھی؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

اُس نے مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا اور خاموش رہی۔

"گھنشام کے ساتھ تم ہی جا رہی تھی نا؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کہہ دو، ہاں۔"

اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور کلائی اُوپر اُٹھا کر دیکھا۔ اس کی کلائی میں

کوچ کی صرف ایک چوڑی تھی۔ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں اسی کی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ میں نے اس کے سر کو سونگھا۔ وہی خوشبو تھی جو مقتول کے کوٹ کے ساتھ تھی۔ میں نے اس کا بازو چھوڑا نہیں، اسے باہر لے گیا اور بیٹھنے والے کمرے میں اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے بٹھا دیا۔ اس کا باپ اور بھائی بھی وہیں تھے۔ ہمارے چھ آدمی ریوالور لیے ان کے پاس کھڑے تھے۔ انسپکٹر راجرز نے فوری طور پر مکان کی تلاشی لینے کو کہا۔ اُس وقت سرجیت سنگھ اچانک بیدار ہو گیا۔ پہرہ داروں کے روکنے کے باوجود وہ ڈیوڑھی میں میرے پاس آگیا۔ بابِ میں مجھ سے التجا کے لہجے میں کہا کہ تم میرے ہندوستانی بھائی ہو۔ میری عزت اور میرے نام پر رحم کرو۔ میں مظلوم باپ ہوں۔ اس لڑکی نے میری داڑھی میں پیشاب کر دیا ہے۔ میرے گھر کی تلاشی نہ لو۔ تم لوگوں کو یہاں کچھ نہیں ملے گا سوائے اس لڑکی کے۔ مجھ سے جو پوچھو گے بالکل سچ بتاؤں گا، باہر لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مجھے بے عزتی سے بچاؤ۔

انسپکٹر راجرز یہ سننے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا کہ سرجیت میرے ساتھ کیا بات کر رہا ہے۔ میں نے اُسے بتا دیا۔ اس نے سرجیت سنگھ سے کہا ——— "تم عزت دار انسان ہو؟ میں نے تمہیں کہا کہ بیٹی کو باہر لے آؤ اور تم نے اندر جا کر بیٹوں سے کہا کہ اسے کنوئیں میں پھینک دو" ———

سرجیت سنگھ اپنی صفائی میں بولنے لگا تو انسپکٹر راجرز نے اسے "شٹ اپ" کہہ کر کمرے میں بھیج دیا۔

ہم نے گھر کی تلاشی لی۔ کم و بیش تین گھنٹے صرف ہوئے۔ کوئی قابلِ اعتراض چیز، کاغذ یا ہتھیار نہ ملا۔ لڑکی کے ذاتی کمرے اور سوٹ کیسوں میں سے بھی کچھ نہ ملا۔ عطر کی وہ شیشی مل گئی جو وہ استعمال کرتی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ انہیں دلّی لے جایا جائے یا امرتسر میں ہی پوچھ گچھ کی جائے۔ انسپکٹر راجرز نے کہا کہ دلّی لے جانا بہتر ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کام اپنے ہیڈ کوارٹر کے مخصوص کمرے میں آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اگر انہوں نے اقبالِ جرم کر لیا تو نشاندہیوں اور شہادت کی فراہمی کے لیے امرتسر آیا جا سکتا ہے۔ رات کے وقت کوئی موزوں ریل گاڑی دلّی نہیں

جاتی تھی۔ ان سب کو رات کے لیے حوالات میں بند کیا اور ہم اپنی جگہ چلے گئے۔ علی الصبح گاڑی جاتی تھی۔ ہم نے سب ملزموں کو حوالات سے نکلوا کر گاڑی میں بٹھایا اور دلّی لے گئے۔

چلتی گاڑی میں قتل

آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہمارا شعبہ سی آئی ڈی کے اندر ایک خفیہ سی آئی ڈی تھی۔ یہاں یہ بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا کہ تلاشی، برآمدگی اور نشاندہی کے وقت مشیر ساتھ رکھے جائیں اور ملزموں کو گرفتار کر کے کسی مجسٹریٹ سے ریمانڈ لیا جائے یا قانونِ شہادت کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ اس شعبے کے تفتیشی کمرے (بلکہ تہ خانے) میں جو مشتبہ آتا تھا وہ صرف اس صورت میں صحیح اور سلامت رہتا تھا کہ آتے ہی اقبالِ جرم کر لے یا قابلِ قبول ثبوت پیش کر کے ثابت کر دے کہ اُس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یا وہ مقامِ واردات یا واردات کے علاقے سے غیر حاضری ALIBI ثابت کر دے، مگر ایسا کبھی نہیں ہُوا تھا کیونکہ وہاں اُسی کو لے جایا جاتا تھا جس کے خلاف شک پختہ ہوتا تھا اور اُس کے خلاف خاصی شہادت ہوتی تھی۔ دراصل قصہ یہ تھا کہ انگریز ۱۸۵۷ء کے تجربے سے بہت خائف تھا۔ اس کے بعد وہ کوئی ذرا سا خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ آپ نے "حکایت" میں پڑھ لیا ہو گا کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمان مجاہدین کس طرح اچانک اُٹھے اور انگریز سے دِلّی جیسا شہر چھین لیا تھا۔ انگریز کے لیے یہ "حادثہ" غیر متوقع تھا۔ اُس نے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں اور لاہور میں مسجد شہید گنج کے سلسلے میں مظاہرین پر جو ظلم و تشدد اور ان کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا تھا وہ بھی ۱۸۵۷ء کے زخم سے گھبرا کر کیا تھا۔ وہ ہندوستان پر گرفت بے حد مضبوط کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔

اسی مقصد اور پرانے خطروں کے پیشِ نظر انگریز نے دِلّی میں یہ محکمہ قائم کیا تھا اور اس کے

تفتیشی کمرے کو مذبح خانہ بنا رکھا تھا۔ میں نے وہاں ملزموں اور مشتبہ افراد کے ساتھ جو سلوک ہوتا دیکھا ہے وہ آپ تصور میں بھی نہیں لا سکتے۔ میں ایسے تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن میں انگریزوں کو روک نہیں سکتا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کو اسی سلوک کے قابل سمجھتے تھے۔ مگر میں "ماتا" نام کی اسلام دشمن دہشت پسند تحریک کے کسی ممبر کو بخشنے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس لڑکی سے اس تحریک کے ممبروں کی نشاندہی کراؤں گا اور پھر اسے اپنے تفتیشی کمرے کی چکی میں پیسوں گا۔ انگریز اپنی سلطنت کے تحفظ و استحکام کے لیے درندہ بنا ہوا تھا۔ میں اپنی قوم اور اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے درندہ بننے پر تیار ہو گیا۔۔۔ ہم نے جا کر سردار سُرجیت سنگھ، اس کے دونوں بیٹوں اور اس کی بیٹی کے لیے نہایت اچھے کھانے کا انتظام کیا اور انہیں الگ الگ کمروں میں بند کر دیا۔ میں نے چاروں سے کہہ دیا کہ سچ بولو گے تو آرام میں رہو گے۔ ہیرا پھیری کرو گے تو بڑی بُری موت مرو گے۔

رات بارہ بجے کے بعد ہم نے لڑکی کو جگایا اور اسے خصوصی کمرے میں لے گئے۔ وہ بائیس سال کی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کا رنگ صاف ستھرا تھا مگر اُڑا ہُوا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "میں تمہیں خبردار کر چکا ہوں کہ یہاں ہیرا پھیری کرو گی تو تمہارا انجام بھیانک ہو گا۔ اب تمہیں کوئی اور پند و نصیحت نہیں کی جائے گی۔ ہمارے پاس تمہارے خلاف بہت سی شہادت موجود ہے"۔۔۔ میں نے اس کے سینڈل، پرس، زیورات کا ڈبہ اور اس کی چوڑیوں کے ٹکڑے اس کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ میں نے کہا۔۔۔ "گھنشام کے ساتھ تم کلکتہ جا رہی تھی۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں"۔۔۔ اس نے غم زدہ آواز میں جواب دیا۔۔۔ "میں اُس کے ساتھ امرتسر سے سوار ہُوئی تھی"۔۔۔ میرے اگلے سوال سے پہلے ہی اس نے کہا۔۔۔ "میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ میری ایک بات مان لیں، میرے باپ کو چھوڑ دیں۔ ان کا اس کیس کے ساتھ کوئی تعلق

نہیں۔ میں نے پہلے ہی انہیں بہت پریشان کیا ہے۔ انہیں میرے جرم کی سزا نہ دیں"۔

"اور تمہارے بھائی؟"

"دونوں کو میرے سامنے پھانسی چڑھائیں"۔۔۔ اس نے کہا۔

"کیوں؟"

"دونوں قاتل ہیں"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "انہوں نے گھنشام کو قتل کیا ہے"۔۔۔ وہ رونے لگی اور آگے بول نہ سکی۔

میں نے انسپکٹر راجرز کو اس کا بیان سنایا۔ اس نے کہا کہ اسے کہوں کہ یہ تمام واقعہ خود ہی سُنا دے۔ اس کے بعد ہم جرح کریں گے۔ میرے کہنے پر اس نے مختصر سا بیان دیا جو اس طرح ہے کہ گھنشام کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ وہ اسے ملنے دِلی سے امرتسر آیا کرتا تھا۔ اس نے گھنشام کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا۔ دن طے ہو گیا۔ گھنشام دو روز پہلے امرتسر آ گیا۔ اس نے سیکنڈ کلاس میں ایک سیٹ بُک کرا لی۔ لڑکی نے سیٹ اس لیے بُک نہ کرائی کہ اس کا نام کسی ریکارڈ میں نہ آئے۔ گھنشام نے اِسے کہا تھا کہ سیکنڈ کلاس میں جگہ مل جائے گی۔ اس کلاس کی بکنگ زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر کوئی سیٹ نہ ملی تو وہ مسافروں سے یہ کہے گا کہ یہ میری بیوی ہے۔ اسے سیٹ نہیں ملی۔ اِس صورت میں گھنشام فرش پر بستر ڈال لے گا۔ لڑکی نے گاڑی کے وقت سے بہت پہلے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا۔ گھنشام اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرا ہُوا تھا۔ وہ وقت پر سٹیشن آ گیا۔ لڑکی نے گھر سے زیورات اور نقدی چرائی اور سٹیشن پر چلی گئی۔ وہ پلیٹ فارم پر اُس وقت گئی جب گاڑی چل پڑی تھی۔ اس نے دانستہ تاخیر کی تھی۔ وہ دوڑ کر گھنشام کے کمپارٹمنٹ تک پہنچی۔ وہاں دو سیٹیں خالی تھیں۔ گھنشام نے دوسرے مسافروں کو بتایا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔

دونوں خوش تھے کہ فرار کامیاب ہے۔ گاڑی دِلی پہنچی تو ان کے دلوں سے پکڑے جانے کا

تو نکل گیا۔ دوسرے مسافر دلّی اتر گئے اور کمپارٹمنٹ میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ رہا۔ وہ اور زیادہ خوش ہوئے۔ اسی خوشی کا اثر تھا کہ وہ کمپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کرنا بھول گئے۔ دلّی سے گاڑی نکلی تو وہ دونوں ایک ہی سیٹ پر اکٹھے ہو گئے اور دنیا کو اور دنیا کے خطروں کو بھول گئے۔ انہیں پتہ نہیں کہ کتنا وقت گذر چکا تھا۔ یہ ایکسپریس گاڑی تھی جس کے سٹاپ بہت دُور دُور تھے۔ گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر آ گئے۔ انہوں نے دروازہ بند نہیں کیا۔ کمپارٹمنٹ میں صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ گھنشام نے دوسری بتی بھی جلا دی۔ اندر آنے والے آدمی لڑکی کے بھائی تھے۔ اُس وقت لڑکی گھنشام کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ بھائیوں کو دیکھ کر کود کر اُٹھی۔ بڑے بھائی نے اُس وقت گھنشام کی گردن دونوں ہاتھوں میں جکڑ لی جب وہ سیٹ سے اُٹھ رہا تھا۔ لڑکی نے اُسے چھڑانے کے لیے بھائی کے ہاتھ پکڑے۔ چھوٹے بھائی نے بہن کی کلائی پکڑ کر مروڑی تو اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ بھائی نے اُسے بازو مروڑ کر بے بس کر لیا اور اسے پیٹا بھی۔

اُسے معلوم نہیں تھا کہ گھنشام زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ بڑے بھائی نے اسے گھسیٹا اور دروازے تک لے گیا۔ چھوڑا تو وہ گر پڑا۔ دونوں بھائیوں نے اُسے دھکیل کر گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ لڑکی بہت چیخی۔ بھائیوں نے اسے گھونسوں سے پیٹا اور چاقو اس کی گردن پر رکھ کر کہا کہ وہ چپ نہ ہوئی تو اس کی گردن کاٹ کر لاش باہر پھینک دیں گے۔ باہر اندھیرا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ اچانک اس نے محسوس کیا جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔ اس کے بعد وہ بول نہ سکی۔ کبھی سمجھتی جیسے یہ خواب ہے اور جب اسے خیال آتا کہ یہ حقیقت ہے تو اس کے حلق میں پھنسی ہوئی چیز اور زیادہ پھیل جاتی۔ اس کا جسم سُن ہو گیا اور دماغ بھی جواب دے گیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ ایک بھائی نے باہر دیکھا اور کہا ــــ "آگے سٹیشن ہے۔ گاڑی رُکے گی" ــــ اُس نے لڑکی سے کہا ــــ "اگر تم نے گاڑی سے اُتر کر کوئی اُلٹی سیدھی حرکت یا بات کی تو ہم تمہیں سب کے سامنے قتل کر دیں گے۔ اگر

خاموش رہو گی تو ہماری بھی عزت رہ جائے گی اور تمہاری بھی۔ ہم تمہیں واپس گھر لے جا رہے ہیں۔ یہ سب تمہاری عزت کے لیے ہے۔"

گاڑی اتنی آہستہ ہو گئی کہ بھائیوں نے لڑکی کو چلتی گاڑی سے اُتار لیا۔ ایک بھائی نے اُترنے سے پہلے کمپارٹمنٹ کی بتیاں بجھا دی تھیں اور اُترتے وقت دروازہ بند کر دیا تھا۔ پلیٹ فارم ابھی آگے تھا۔ بھائی اسے باہر لے گئے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سا سٹیشن ہے۔ شہر میں گئے اور نہایت معمولی ہوٹل میں ٹھہرے۔ وہاں بھائیوں نے اس سے پوچھا کہ زیورات اور نقدی کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ سب کچھ گاڑی میں رہ گیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ گاڑی سے اُترنے کی جلدی میں اُنہیں نقدی اور زیورات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ لڑکی کے سینڈل بھی گاڑی میں رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی۔ وہ ریلوے سٹیشن پہنچے۔ کسی سے پوچھا کہ انہیں امرتسر جانا ہے، گاڑی کتنے بجے آئے گی۔ انہیں بتایا گیا کہ لاہور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہے اور چلنے والی ہے۔ بھائیوں نے ٹکٹ لینے میں وقت ضائع نہ کرنا چاہا۔ بہن کو اپنے ساتھ دوڑاتے پلیٹ فارم پر گئے۔ گاڑی چل پڑی۔ وہ انٹر کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ دلّی اور امرتسر کے درمیان ایک ٹکٹ چیکر آیا۔ اسے انہوں نے بتایا کہ وہ فلاں سٹیشن سے جلدی میں سوار ہوئے ہیں اس لیے ٹکٹ نہیں لے سکے۔ ان کا ٹکٹ چیکر کے ساتھ جھگڑا بھی ہوا جو گارڈ نے آ کر ختم کرایا۔

وہ امرتسر پہنچے۔ لڑکی کو گھر لے گئے جہاں اُسے پیٹا گیا اور کمرے میں بند رہنے کو کہا گیا۔ اگلی رات ہم اُس کے گھر پہنچ گئے۔ لڑکی نے بتایا کہ اُس کا باپ اندر آیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے بیٹی کو گالیاں دیں اور بیٹوں سے کہا ــــ "باہر پولیس کے دو انسپکٹر آئے بیٹھے ہیں۔ ایک دیسی اور دوسرا انگریز ہے۔ وہ اس منہ کالی کو بلا رہے ہیں۔ یہ تمہیں جیل بھجوائے گی" ــــ بیٹے باپ کو بتا

چکے تھے کہ وہ اپنی بہن کے دوست کو قتل کر آئے ہیں۔ انہوں نے بہن کو پکڑا اور کنوئیں کی طرف گھسیٹنے لگے۔ باپ نے کہا کہ اسے کنوئیں میں پھینک دو۔ ماں نے شور مچا دیا اور بیٹوں کو گالیاں دے کر کہا کہ یہ تمہاری سگی بہن ہے کنوئیں میں نہ پھینکنا۔ بھائیوں نے اسے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا ---- اور ہم نے اسے پکڑ لیا۔

لڑکی نے مجھے وحشی بنا دیا

مَیں نے یہ سارا بیان انسپکٹر راجرز کو سُنا دیا۔ لڑکی ایف۔ اے پاس تھی لیکن انگریزی آسانی سے نہیں بول سکتی تھی۔ موزوں یہی تھا کہ وہ پنجابی میں بات کرے تاکہ کوئی بات اُس کے دل میں نہ رہ جائے۔ اُس نے بیان تو دے دیا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کے لیے بے حد خطرناک مرحلہ تو اب آیا ہے۔ مَیں نے اور انسپکٹر راجرز نے جرح تیار کر رکھی تھی۔ ہم نے وہ ڈِسک جس پر "ماتا" لکھا ہُوا تھا اور کاغذ کا وہ ٹکڑا جس میں الائچی کے دانے لپٹے ہوئے تھے اُس کے آگے رکھ دیئے۔ مَیں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں مقتول کی جیب سے برآمد ہوئی تھیں۔ لڑکی سے پوچھا ---- "اس ڈِسک اور کاغذ کی تحریر کا مطلب کیا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں" ---- اُس نے جواب دیا۔ اُس کے انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"گھنشام کے ساتھ تمہاری دوستی کہاں اور کس طرح شروع ہوئی تھی؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے" اُس نے پہلے سے انداز سے جواب دیا۔ "اس کے متعلق کچھ نہیں بتاؤں گی"

"گھنشام تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے امرتسر گیا تو کون سے دوست کے پاس

ٹھہرا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں" اُس نے جواب دیا۔

"دلجیت کور!" مَیں نے اُسے نرم لہجے میں کہا ---- "تم ان تمام سوالوں کا جواب دے دو گی مگر اُس وقت تک تمہاری یہ حسین صورت چڑیلوں کی طرح ہو چکی ہو گی اور تمہارا جسم ہڈیوں کا پنجر بن چکا ہو گا۔ کیا اِس سے بہتر نہیں کہ تم عزت اور آرام سے ہمیں اِن سوالوں کے جواب دے دو؟"

"دو آدمیوں کو ایک عورت مل جائے تو اس کی عزت کیسے محفوظ رہ سکتی ہے؟" اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا ---- "اگر بہانہ پیدا کر کے مجھے خراب کرنا چاہتے ہو تو مَیں کیا کر سکتی ہُوں؟"

لڑکی چالاک معلوم ہوتی تھی۔ مَیں نے اُس کا جواب انسپکٹر راجرز کو انگریزی میں سُنا کر اپنی رائے دی کہ یہ اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ ہم اسے خراب کریں گے اور اسے تفریح کا ذریعہ بنائیں گے۔ انسپکٹر راجرز نے مجھے کہا کہ اس کے دماغ میں یہ ڈالو کہ ہم اس طرف توجہ ہی نہیں دیں گے کہ یہ عورت ہے یا مرد۔ ہمیں اس کے حُسن اور اس کے جسم کے ساتھ ذرّہ بھر دلچسپی نہیں .... یہ سُن کر مجھے اطمینان ہُوا کہ اس انگریز نے لڑکی کے متعلق کوئی بیہودہ ارادہ دل میں نہیں رکھا تھا۔ مَیں نے لڑکی سے کہا ---- "تم بھُول جاؤ کہ تم گورے رنگ کی بڑی حسین لڑکی ہو۔ ہمیں صرف تین سوالوں کے جواب دے دو اور آزاد ہو جاؤ۔ مقتول تمہارا دوست کس طرح بنا؟ وہ امرتسر کس کے پاس ٹھہرا تھا اور کلکتہ تمہارا مشن کیا تھا؟"

"مَیں ذرا سوچ کر بتاؤں گی" اُس نے کہا۔

"یہ کوئی حساب کا سوال نہیں" مَیں نے کہا ---- "فوراً، ابھی جواب دو" ---- مجھے اس پر رحم آ گیا۔ وہ گمراہ ہو گئی تھی، آخر لڑکی تھی۔ مَیں نے اسے کہا ---- "تم نے کہا تھا کہ تمہارے بھائیوں

کو تمہارے سامنے پھانسی چڑھایا جائے۔ تم اُن سے اُس آدمی کا انتقام لینا چاہتی ہو جسے تم چاہتی تھیں تم قاتل نہیں۔ ہمارے دلوں میں یہ شک کیوں پیدا کرتی ہو کہ تم بھی قتل کے جرم میں شامل تھیں؟ ہم یہ سمجھیں گے کہ تمہارے بھائی بے گناہ ہیں اور تم نے گمنشام کو کسی وجہ سے کسی اور سے قتل کرایا ہے۔ کیا تم تمام عمر جیل میں گزارنا چاہتی ہو؟"

وہ گہری سوچ میں کھو گئی۔ اُسے جیسے اچانک کچھ یاد آگیا۔ کہنے لگی "میرے باپ کو چھوڑ دیں۔ میں بہت ساری باتیں بتاؤں گی۔"

میں نے انسپکٹر راجرز سے ترجمہ کیا تو اُس نے کہا ــــ "اسے کہو ہم تمہارے باپ کو عزت سے رکھیں گے اور دو تین ضروری باتیں پوچھ کر اُسے آزاد کردیں گے۔"

"جب تک میرے باپ کو نہیں چھوڑو گے میں زبان نہیں کھولوں گی۔"

"اس کے تمام کپڑے اُتار دو" ــــ انسپکٹر راجرز نے غصّے سے کہا ــــ "اور اس کے باپ کو یہاں لے آؤ" ــــ وہ تیزی سے اُٹھا اور لڑکی کی طرف بڑھا۔

لڑکی سمجھ گئی تھی کہ اس انگریز نے کیا کہا ہے۔ وہ سکڑنے لگی۔ میں اُٹھ کر لڑکی کے آگے کھڑا ہوگیا اور انسپکٹر راجرز کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُسے روک دیا۔ اُس نے حیران سا ہو کے میرے منہ کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا ــــ "مسٹر راجرز! میری ڈیوٹی اور میرے ایمان میں کچھ فرق ہے۔ مجھے یہ فرق برقرار رکھنے کی مہلت دیں۔ میرا کردار کہتا ہے کہ بیٹی کو باپ کے سامنے ننگا نہیں کروں گا۔ آپ بیٹھ جائیں۔ یہ بولے گی اور یہ سب کچھ بتائے گی۔"

اُس بے رحم انگریز کو نہ جانے کیوں رحم آگیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے گھوم کر لڑکی کا ہاتھ پکڑا۔ بہت خوبصورت ہاتھ تھا اور اُس کی اُنگلیاں باریک اور نہایت اچھی تھیں۔ میں نے میز سے پنسل اُٹھائی۔ پنسل لڑکی کی شہادت اور درمیانی اُنگلی کے درمیان رکھ کر اُس کی دونوں اُنگلیوں کو مُٹھی میں لے لیا۔

میں نے ہاتھ دبایا تو لڑکی درد سے دوہری ہوگئی۔ اس کے منہ سے "سی" نکلی۔ میں نے ہاتھ کا دباؤ کم نہ کیا۔ لڑکی تڑپنے لگی۔ اس سے کتنا درد ہوتا ہے؟ ــــ آپ اپنی اُنگلیوں میں پنسل رکھ کر دبائیں اور اس درد کو محسوس کریں۔ وہ لڑکی تھی۔ اُس میں مردوں والی برداشت نہیں تھی۔ سردی کے باوجود اُس کا چہرہ پسینے سے تر ہوگیا۔ میں نے ہاتھ کو دبایا۔ اُس کی چیخیں نکل گئیں اور وہ فرش پر تڑپنے لگی۔ میں اُس کی اُنگلیوں میں پنسل دباتا چلا گیا۔ وہ چیختی رہی۔ پھر میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"یہ ابتدا ہے" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "تم نے سُن لیا ہے کہ یہ انسپکٹر تمہیں ننگا کر کے تمہارے باپ کو یہاں بلانا چاہتا ہے۔ میں نے تمہاری عزّت کی خاطر انگریز افسر کو ناراض کیا ہے۔ میرے سوال کا جواب فوراً دے دو۔"

"میرے باپ کو آپ نہیں چھوڑیں گے؟" اُس نے ہاری ہوئی آواز میں کہا۔

"اُسے تمہارے سامنے لا کر ہم ننگا کردیں گے" میں نے کہا ــــ "اور تمہارے سامنے کھڑا کر کے اُس پر برف والا پانی ڈالیں گے .... ہمیں حکم نہ دو، ہمارا حکم مانو۔"

اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس وقت میرے جسم میں بہت طاقت تھی۔ میں نے ایک ہاتھ پھیلا کر اُس کے سر پر رکھا۔ مُٹھی بند کی تو اُس کے بال میری مٹھی میں آگئے۔ میں نے اسی ایک ہاتھ سے اُسے اُوپر اُٹھا لیا۔ اُس کے پاؤں زمین سے سات آٹھ اِنچ اُوپر تھے۔ میں نے اُسے بالوں سے اُوپر اُٹھا رکھا تھا۔ اُس کی چیخوں سے کمرہ دہل گیا۔ میں نے اسے اور اُوپر اُٹھا کر مٹھی کھول دی۔ وہ پاؤں پر گری۔ اُس کی آنکھیں لال سُرخ ہو چکی تھیں۔ میں نے کہا ــــ "صرف ایک سوال کا جواب دے دو۔ امرتسر میں 'ماتا' کا اڈہ کہاں ہے اور اس گروہ میں کون کون ہے؟"

"پھر آپ میرے باپ کو چھوڑ دیں گے؟" اُس نے روتے ہوئے پوچھا اور کہنے لگی ــــ "میں

اپنے انجام کو جان گئی ہوں۔ میں آپ کو حکم نہیں دے رہی۔ سودا بھی نہیں کر رہی۔ میری عرض ہے کہ میرے باپ کو چھوڑ دیں۔ میں نے اُسے بہت بدنام کیا ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ اُس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں۔"

میں نے انسپکٹر راجرز سے بات کی۔ اُس نے کہا کہ یہ پورا بیان دے دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کے باپ کو چھوڑ دوں گا۔ میں نے لڑکی کو اس انگریز افسر کا فیصلہ سُنا دیا۔ اُس نے پوچھا ــــ "میں آپ پر کس طرح اعتبار کروں؟" ــــ یہ معاملہ جذباتی تھا۔ لڑکی نے مجھے وحشی بنا دیا تھا مگر باپ بیٹی کے رشتے نے اور باپ کی خاطر بیٹی کی التجاؤں نے مجھے موم کر دیا۔ انسپکٹر راجرز سے اجازت لے کر میں لڑکی کو ساتھ لے گیا۔ ایک کمرے میں بستر کا انتظام کیا۔ اُس کے باپ کو مقفل کمرے سے نکالا اور کُھلے کمرے میں بستر میں لٹا دیا۔ بوڑھے کی جذباتی حالت بہت بُری تھی۔ وہ لیٹ گیا تو بیٹی نے اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ اس نے باپ کے پاؤں چومے اور پھُوٹ پھُوٹ کر روئی۔ باپ کی دھاڑیں نکل گئیں۔ میں لڑکی کو وہاں سے ہٹانے لگا تو باپ نے اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ رو رو کر اُس نے مجھ سے پوچھا ــــ "اب کیا ہوگا؟ میری قسمت میں اور کیا لکھا ہے؟" ــــ میں نے اُسے تسلی دی اور اسے آرام سے سو جانے کو کہا ــــ لڑکی کو میں تفتیش کے کمرے میں لے گیا۔ اس کے باپ کے بھاگنے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ ارد گرد کڑا پہرہ تھا۔

ماتا، مہاتما گاندھی اور مسلمان

انسپکٹر راجرز نے چائے منگوالی تھی۔ میں نے لڑکی کو پانی پلایا پھر چائے پلائی اور کہا۔ "تمہیں کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہر ایک بات بتا دو۔ میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ میں ہندو ہوں۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔"

میں نے اُسے جو اذیت دی تھی وہ اس سلوک کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا جو ملزموں کے ساتھ وہاں کیا جاتا تھا۔ اس نازک سی لڑکی کے لیے اتنا ہی کافی ثابت ہُوا۔ باپ کی طرف سے بھی وہ مطمئن ہوگئی۔ نیند نے اُسے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ اُس نے غنودگی کے عالم میں خاصا طویل بیان دیا۔ اپنے متعلق اس نے بتایا کہ لڑکپن کے آغاز میں اس میں دو رجحان پیدا ہو گئے تھے۔ ایک آوارہ خیالی اور دوسرا مسلمانوں کے خلاف نفرت۔ والدین نے بچپن میں اُسے آزاد کر دیا تھا۔ آگے چل کر وہ خود آزاد ہو گئی۔ بڑے بھائی نے اس کی دو سہیلیوں کے ساتھ دوستانہ کر لیا۔ بہن کو پتہ چلا تو اُس نے سب سے پہلے اپنے بھائی کے ایک دوست سے دوستی کر لی۔ سکول میں اُسے پڑھایا گیا کہ سکھ بڑی زبردست قوم ہے۔ اسی سلسلے میں اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف دشمنی پیدا کی گئی۔ کالج میں وہ لڑکیوں کی لیڈر بن گئی۔ لڑکوں سے بھی ملنے لگی۔ ۱۹۳۵ء میں اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اس سال لاہور میں مسجد شہید گنج کا واقعہ ہُوا۔ یہ سکھوں اور مسلمانوں کا تنازعہ تھا جس میں لاہور کے مسلمانوں نے جانوں کی قربانی بے دریغ دی۔ امرتسر میں سکھوں کو بتایا گیا کہ لاہور میں مسلمان سکھوں کو قتل کر رہے ہیں۔ بہت سے سکھ برچھیوں اور کرپانوں سے مسلح ہو کر لاہور پہنچے۔ وہاں مسلمان، انگریز پولیس اور فوج کی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ اس لڑکی کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور زیادہ گہری ہوگئی۔

اُس وقت تک وہ بہت ہوشیار اور منہ پھٹ ہو چکی تھی۔ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ اس کا باپ بھی لیڈر قسم کا آدمی تھا۔ اُس کی لیڈری میونسپلٹی کے الیکشنوں اور گوردوارے اور دربار صاحب کے انتظامات وغیرہ تک محدود تھی۔ تاہم وہ اپنے آپ کو امرتسر کے سکھوں کا پنچ کہلاتا تھا۔ لڑکی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں اپنے ہم خیال لڑکوں سے بھی ملتی تھی۔ وہ تیز طرار بھی تھی، بے حیا بھی اور اُس کا چال چلن بھی داغدار تھا۔ گھنشام کے قتل سے آٹھ مہینے پہلے اس کی

پہلی ملاقات گھنشام سے ہوئی۔ یہ ایک خفیہ ملاقات تھی۔ گھنشام دلی سے امرتسر ایک دوست کے پاس "ماتا" کی بھرتی کے لیے آیا تھا۔ لڑکی کا ایک دوست اُسے گھنشام کے پاس لے گیا تھا۔ لڑکی نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ گھنشام نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ یوپی میں ہندوؤں نے ایک زمین دوز تحریک کا آغاز کیا ہے جس کے اغراض و مقاصد میں اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی بیخ کنی سرِفہرست ہے۔ اس تحریک کا پروگرام دہشت پسند گروہوں جیسا تھا۔ دوسری تحریکیں انگریزوں کے خلاف کام کرتی تھیں، "ماتا" کو مسلمانوں کے خلاف کام کرنا تھا۔ انہوں نے جو طریقے وضع کیے تھے اُن میں ایک تو مسلمان لیڈروں کو ایسے طریقے سے قتل کرنا تھا کہ قاتلوں کا سراغ نہ ملے۔ دوسرا طریقہ یہ کہ مذہبی لیڈروں اور مسجدوں کے مولویوں تک کو دہشت زدہ کیے رکھنا۔ مثلاً رات کے وقت اُن کے گھروں میں پتھر پھینکنے، دستی بم پھینکنے، اُن کے بچوں کو اغوا کر کے قتل کرنا اور لاشیں غائب کر دینا۔ تیسرا طریقہ تبلیغ کا تھا۔ پیار سے بھی اور تشدد سے بھی مسلمانوں کو ہندو بنانا۔ چوتھا طریقہ یہ تھا کہ ہندو اور سکھ لڑکیاں مسلمان نوجوانوں کو پھانس کر اُن کا مذہب تبدیل کریں خواہ انہیں اپنی عزت قربان کرنی پڑے، اور پانچواں طریقہ یہ تھا کہ مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے دُور دراز لے جانا اور انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بیاہ دینا۔

دلجیت کور کو یہ تحریک اور اس کا پروگرام بہت پسند آیا۔ اس کا نشان لکڑی کی ڈسک رکھا گیا تھا جس پر لفظ "ماتا" لکھا ہوتا تھا۔ گھنشام نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ اس تحریک کے لیڈر مہاتما گاندھی سے مل چکے ہیں اور اپنے اس روحانی لیڈر کی انہیں منظوری مل گئی ہے۔ اُس نے جن لیڈروں کے نام لیے اُن میں سردار پٹیل، مرارجی ڈیسائی، جے پرکاش نارائن اور جواہر لال نہرو قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لیڈر پہلے ہی ان کوششوں میں مصروف تھے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو نکالا جائے یا انہیں مسلمان ہی نہ رہنے دیا جائے۔ انہوں نے شدھی کی تحریک چلا رکھی تھی۔ گھنشام نے لڑکی کو

بتایا کہ یوپی میں "ماتا" کے ممبروں نے اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا ہے۔۔۔ لڑکی نے بیان میں کہا کہ یہ تحریک اتنی سرگرم نہ ہو سکی جتنی توقع تھی۔ دلی کے مضافاتی علاقے میں اس کے تین ممبر پکڑے گئے۔ اُن کے پاس دستی بم تھا۔ پولیس کے پاس جا کر ایک نے اقبالِ جرم کر لیا اور تحریک کو بے نقاب کر دیا۔ پھر یوپی میں کسی جگہ دو ممبر پکڑے گئے۔ وہ بھی پولیس کا تشدد نہ سہہ سکے۔ ان سب کو چودہ چودہ سال سزائے قید دی گئی۔

لڑکی کے بیان کے مطابق کچھ لوگ اس تحریک کو مالی امداد دیتے تھے مگر اُسے کسی ایک کا بھی نام معلوم نہیں تھا۔ گھنشام امرتسر آتا رہتا تھا۔ وہ دراصل سکھ نوجوانوں کو اس گروہ میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی ہر بار اُسے ملتی تھی۔ دونوں میں بے تکلفی پیدا ہو گئی جو محبت کی صورت اختیار کر گئی۔ لڑکی نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ وہ اس تحریک میں شامل ہو جائیں۔ انہیں تحریک پسند نہ آئی۔ گھنشام نے امرتسر زیادہ ہی آنا شروع کر دیا اور زیادہ دن وہاں گزارنے لگا۔ لڑکی اُس کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ بھائیوں نے دیکھ لیا اور بہن کو منع کیا۔ وہ نہ مانی۔ باپ کو پتہ چلا تو اُس نے بھی لڑکی کو روکا۔ وہ باز نہ آئی۔ کرتے کرتے باپ اور بھائیوں کو پتہ چل گیا کہ لڑکی کو تحریک سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی گھنشام سے ہے۔ اُس وقت تک لڑکی بے حیائی اور آشنائی کی وجہ سے خاصی بدنام ہو چکی تھی۔ ایک روز دونوں بھائیوں نے گھنشام کو جا پکڑا اور اُسے دھمکی دی کہ وہ پھر کبھی امرتسر آیا تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اُس نے لڑکی کو بتایا۔ لڑکی نے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ گھر سے نکل جانے کو تیار ہے۔ پروگرام طے ہو گیا۔

اس کے مطابق آٹھ دس روز بعد گھنشام امرتسر آیا۔ لڑکی کو اطلاع مل گئی۔ وہ اسے ملی۔ گھنشام نے اُسے بتایا کہ وہ کلکتہ جا رہا ہے۔ وہاں کے ایک تاجر نے تحریک کے لیے خاصی رقم اور کچھ آدمی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ دلی کے ایک لیڈر نے (جس کا اُسے نام نہیں بتایا گیا) کاغذ پر یہ تحریر لکھ دی کہ امرتسر میں منڈی تیز ہے۔ مال بھیج دو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ امرتسر میں بھرتی مہنگی ملتی ہے۔ اس کے لیے

رقم چاہیے۔ گھنشام نے اس لیڈر کو بتایا کہ وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے جانا چاہتا ہے۔ لڑکی گھر سے بھاگ آئے گی، پھر گھر نہیں جائے گی بلکہ وہ شادی کریں گے۔ گھنشام نے اس لیڈر کو یہ بھی بتا دیا کہ لڑکی تحریک کے لیے بہت کام کرے گی۔ لیڈر نے رقعے میں یہ بھی لکھ دیا کہ بچے آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کلکتے کا وہ تاجر ان دونوں کی رہائش کا بھی بندوبست کرے اور انہیں چُھپا کر رکھے۔ انتظام یہ کیا گیا کہ گھنشام نے ریل گاڑی میں اپنی سیٹ ریزرو کرائی لیکن لڑکی کو ریزرویشن کے بغیر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ چونکہ دہشت پسند تھا اس لیے ذرا ذرا سے خطرے سے بھی محتاط تھا۔ وہ لڑکی کی گمشدگی کا کوئی تحریری سراغ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا — اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ لڑکی پہلے ہی بیان کر چکی تھی۔ بیان کا یہ حصّہ آپ نے پڑھ لیا ہے۔

اپنے باپ کے متعلق اُس نے ایسے جذباتی انداز اور الفاظ میں صفائی پیش کی کہ میں نے اسے تسلیم کر لیا۔ باپ کے ذکر سے لڑکی بہت روئی۔ اُس کے الفاظ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہیں جو میں نے اپنی اولاد کو کئی بار سنائے تھے اور اب اپنی اولاد کی اولاد کو سُنایا کرتا ہوں۔ لڑکی نے کہا —

"اولاد جوان ہو جاتی ہے تو سمجھتی ہے کہ عقل تو صرف اُسے ملی ہے۔ والدین پسماندہ اور جاہل ہیں۔ مجھ جیسی لڑکیاں اپنے جیسے لڑکوں سے اپنی خوبصورتی کی تعریف سُن کر اپنے آپ کو رانیاں مہارانیاں سمجھ لیتی ہیں اور ماں باپ کی عزت کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ ڈالتی ہیں۔ لڑکے آوارہ ہو کر ماں باپ کے لیے روگ بن جاتے ہیں۔ آج جب میرا باپ میری گمراہی پر کُڑھ کُڑھ کر میرے ساتھ قید ہو گیا ہے اور مجھے خدا نے میرے گناہوں کی سزا دی ہے تو مجھے یہ احساس ہُوا ہے کہ میرا باپ اور ہر کسی کا باپ ایک پوتر (مقدس) انسان ہے، اور ماں کتنی عظیم ہوتی ہے جس نے اپنی بیٹی کی بدکاریوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی بیٹوں سے کہا تھا کہ اسے کنوئیں میں نہ پھینکنا۔ اُس نے مجھے بچانے کے لیے اپنے بیٹوں پر حملہ کر دیا تھا۔ میں اُن سے کس طرح معافی مانگوں۔ اگر خدا نے مہلت دی تو باقی عمر اُن

کے قدموں میں سر رکھ کر گزار دوں گی اور اگر زندہ رہی تو نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں میں یہ تحریک چلاؤں گی کہ اپنے ماں باپ کو گورو نانک اور رشیوں کا درجہ دیں۔"

"اور تم مسلمانوں سے بدستور نفرت کرتی رہو گی؟" میں نے کہا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اب صرف اپنی خوبصورتی اور اپنے جسم سے نفرت کروں گی۔"

لڑکی سوگئی، باپ بیدار ہوگیا

اُس نے امرتسر کے چھ سات آدمیوں کے نام پتے لکھوائے جو اِس تحریک کے روحِ رواں تھے اور اُس آدمی کا نام پتہ بھی دے دیا جس کے گھر کو گھنشام نے اپنا اڈّہ بنا رکھا تھا۔ کچھ اور بھی نشاندہیاں تھیں جو اُس نے کر دیں۔ ہم تمام تر گروہ کو پکڑنا چاہتے تھے لیکن دہشت پسندوں کا دستور تھا کہ اُن کے جو ممبر مل کر کام کرتے تھے وہی ایک دوسرے سے واقف ہوتے تھے۔ باقی ممبر ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ گھنشام تجربہ کار اور محتاط دہشت پسند معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے لڑکی کو کسی دوسری جگہ کے ممبروں کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جس کے پاس کلکتہ جا رہے تھے اُس کے متعلق بھی وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ لڑکی دہشت پسندوں کی کسی کارروائی کے متعلق بھی کچھ نہ بتا سکی۔ ہم نے اس پر فوراً اعتبار نہیں کر لیا تھا۔ ہم نے اپنے خصوصی طریقے سے اس کا سینہ کھول لیا تھا۔ اس میں اتنا وقت صرف ہُوا کہ دن کے گیارہ بج گئے۔ لڑکی پر غشی طاری ہونے لگی تھی اور وہ اس طرح بے قابو ہو کر بولنے لگی تھی جیسے اُسے نشہ پلایا گیا ہو۔ اُس کا شعوری ذہن سو گیا تھا اور لاشعوری ذہن میں چُھپی ہوئی باتیں چشمے کی طرح اُبل اُبل کر باہر آ رہی تھیں۔ انسپکٹر راجرز کے کہنے پر میں اُسے اُس کے کمرے میں لے گیا۔ چارپائی، بستر اور اُس کے لیے ناشتہ منگوایا۔ اُسے ناشتے کا ہوش نہ تھا۔ بستر پر

گری اور گہری نیند سو گئی۔

مَیں اُس کے باپ کے کمرے میں گیا۔ اُسے ناشتہ دیا جا چکا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور میرے ہاتھ پکڑ کر بولا ـــ "میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟ میری بیٹی کہاں ہے؟" ـــ مَیں نے اُسے تسلی دی تو اُس نے پوچھا ـــ "میری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟"

"جو ایک باپ کو اپنی بیٹی کے ساتھ کرنا چاہیئے" ـــ مَیں نے کہا ـــ "مَیں آپ سے بہتر قسم کا باپ ہُوں۔ آپ نے اسے کنوئیں میں پھینکنا چاہا تھا لیکن مَیں اُسے کنوئیں سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ نے اُسے اپنے ہاتھوں آزاد کیا اور اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت ڈالی۔ میرے ساتھ آئیں" ـــ مَیں اسے تفتیشی کمرے میں لے گیا۔

ہم نے گزشتہ رات سے ایک منٹ بھی آرام نہیں کیا تھا۔ انسپکٹر راجرز نے گھڑی دیکھ کر کہا ـــ "بارہ بجنے والے ہیں۔ آپ اسے لے آئے ہیں؟"

"اس سے جلدی فراغت ہو جائے گی" ـــ مَیں نے کہا ـــ "ہمیں تفتیش آج ہی مکمل کر لینی چاہیئے۔ امرتسر جا کر گرفتاریاں کرنی ہیں۔ ملزم رُوپوش ہو سکتے ہیں"۔

انسپکٹر راجرز گھبرا کر اُٹھا اور بولا ـــ "ملزموں کی فہرست کہاں ہے؟ گرفتاریوں کے لیے ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ مجھے ڈر ہے وہ روپوش ہو چکے ہوں گے۔ لڑکی کی گرفتاری اور اس کے گھر کی تلاشی سارے شہر میں مشہور ہو چکی ہو گی" ـــ وہ فہرست لے کر کمرے سے دوڑتا نکل گیا۔

مَیں سمجھ گیا کہ وہ امرتسر پولیس کو ٹیلیفون کرنے گیا ہے کہ ان اشخاص کو فوراً گرفتار کر کے ان کے گھروں کی تلاشی لو۔ مَیں نے اس دوران سردار سرجیت سنگھ پر توجہ مرکوز کیے رکھی۔ اُس نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ اپنی بیٹی کے متعلق اُس نے وہی باتیں بتائیں جو بیٹی سُنا چکی تھی۔ اس نے

یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ بیٹی اور بیٹوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا اور انہیں بتایا کرتا تھا کہ انبالہ سے اٹک تک کا علاقہ سِکھوں کا ہے۔ اس پر انگریزوں، ہندوؤں یا مسلمانوں کا کوئی حق نہیں، لیکن اُس کی بیٹی نے جب اپنے بھائیوں سے کہا کہ وہ تحریک میں شامل ہو جائیں جو مسلم کُشی کے لیے کام کر رہی ہے تو اُس نے مخالفت کی کیونکہ پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ تاہم وہ ہندو لیڈروں کے ساتھ اس موضوع پر تبادلۂ خیالات کرتا رہتا تھا کہ مسلمانوں کو کس طرح ختم کیا جائے اور مسلمانوں کو اچھوتوں کا درجہ کس طرح دیا جائے۔ اُس کی بیٹی اُس سے آگے نکل گئی۔ تب وہ پریشان ہُوا، اور اُس وقت تو وہ پریشانی سے بے حال ہو گیا جب اُسے اپنے جیسے معزز آدمیوں نے بتایا کہ اُس کی بیٹی مشکوک چال چلن کے آدمیوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ اُس نے بیٹی کو روکنے کی کوشش کی تو اُس نے پرواہ نہ کی۔ پھر بھائیوں نے اُسے روکا تو بھی وہ باز نہ آئی۔

اس کے بعد باپ کو گھنشام اور اُس کی خفیہ تحریک کے متعلق پتہ چلا اور فوراً ہی بعد بیٹوں نے باپ کو بتایا کہ گھنشام اور لڑکی کے تعلقات صرف سیاسی نہیں، معاملہ قابلِ اعتراض ہے۔ باپ بہت ہی پریشان ہُوا۔ وہ سارے شہر میں بدنام ہو گیا تھا۔ اُس کے کہنے پر اُس کے بیٹوں نے گھنشام کو قتل کی دھمکی دی۔ باپ نے انہیں کہا کہ الفاظ تک ہی رکھنا ورنہ اور زیادہ رسوائی ہو گی۔ گھنشام آخری بار امرتسر آیا۔ ایک شام لڑکی کی ماں نے کچھ نکالنے یا رکھنے کے لیے ٹرنک کھولا تو زیورات کے ڈبے خالی دیکھے۔ صرف ہار والا ڈبہ اور زیورات کی کئی اشیاء غائب تھیں۔ اسی ٹرنک میں کچھ رقم تھی۔ وہ بھی غائب تھی۔ ماں نے سر پیٹ لیا۔ بیٹوں کو معلوم ہُوا تو وہ اُس مکان میں گئے جہاں گھنشام ٹھہرا کرتا تھا۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ ہوڑا ایکسپریس سے چلا گیا ہے۔ بیٹے ریلوے سٹیشن گئے تو گاڑی چل رہی تھی۔ انہیں اپنی بہن نظر آ گئی۔ وہ آگے کو دوڑی جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے مگر بہن گاڑی میں سوار ہو گئی اور بھائی پیچھے کہیں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ بیٹوں

کی بدچلنی نے باپ کا بُرا حال کر دیا۔ وہ انہیں اور اپنی بیٹی کو ڈھونڈتا پھرتا رہا۔ اس ڈر سے کسی سے پوچھتا بھی نہیں تھا کہ رسوائی ہوگی۔ تین روز بعد اُس کے بیٹے بہن کو لے کر آگئے اور باپ کو بتایا کہ وہ گھنشام کو قتل کر آئے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ پکڑے نہیں جائیں گے مگر پکڑے گئے۔

اتنے میں انسپکٹر راجرز آگیا۔ اُس نے امرتسر کے ڈپٹی کمشنر کو ملزموں کے نام پتے بتا کر کہہ دیا تھا کہ انہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ اُن کے گھروں کی تلاشی میں جو اشیاء برآمد کرنی تھیں وہ بھی بتا دیں۔ میں نے اسے لڑکی کے باپ کا بیان سُنایا اور رائے دی کہ اس کے پاس اور کچھ نہیں۔ انسپکٹر راجرز نے اُس پر بہت جرح کی اور مجھے کہا کہ اسے کمرے میں بھیج دو۔ باپ نے مجھ سے پوچھا — ”اب میرا کیا بنے گا؟ میری بیٹی کا کیا بنے گا؟“ — اُس نے اس بار بھی اپنے بیٹوں کے متعلق نہیں پوچھا۔ اُسے بیٹی کا غم کھا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا ”آپ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ میں آپ کے دل میں مسلمانوں کی محبت پیدا کر دوں گا۔“

ہم کھانے اور ذرا آرام کے لیے چلے گئے۔

ماتا کے سپوت ہمارے شکنجے میں

شام کو ہم دونوں بھائیوں کو اکٹھے ہی تفتیشی کمرے میں لے گئے۔ انہیں خبردار کیا کہ اُن کا جرم ہر ایک تفصیل کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے۔ اگر انہوں نے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو قانون کی سزا سے پہلے اس کمرے میں انہیں بڑی بھیانک سزا ملے گی۔ دونوں اس قدر دلیر تھے کہ میں انہیں احمق کہوں گا۔ بڑے بھائی نے کہا — ”چھپانا کیا ہے۔ بہن کے یار کو قتل کیا ہے۔ کہیں ڈاکہ تو نہیں ڈالا“ — چھوٹے بھائی نے ہاتھ میرے منہ کے قریب لا کر زور زور سے

ہلایا اور دھمکانے کے لہجے میں کہا — ”ہم جھوٹ نہیں بولیں گے لیکن یاد رکھو ہم پر کوئی جھوٹا الزام نہ لگانا۔ ہم سر اُونچا کر کے کہیں گے کہ ہم نے بہن کے یار کو قتل کیا ہے۔“

جو پاکستانی سکھوں کو نہیں جانتے وہ حیران ہوں گے کہ ان بھائیوں نے ایسی باتیں کہی ہیں۔ جو لوگ سکھوں کے ساتھ رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سکھ ”بہن کے یار“ سے کہیں زیادہ ننگی باتیں کیا کرتے ہیں۔ سکھ جس قدر احمق ہوتا ہے (جو وہ اکثر ہوتا ہی ہے)، وہ اپنا سر اتنا ہی اُونچا رکھتا ہے۔ میں نے ان بھائیوں کو کھل کر داد دی۔ انسپکٹر راجرز سے بھی اُن کی تعریف کرائی اور سکھوں نے بڑے فخر سے ساری واردات سُنا دی۔ اس کا خاصا حصّہ آپ لڑکی اور اُس کے باپ کی زبان سے سُن چکے ہیں۔ اس میں جو رہ گیا تھا وہ بھائیوں نے اس طرح پورا کیا کہ جب انہیں پتہ چلا کہ ان کی بہن زیورات اور نقدی سمیت لاپتہ ہے تو وہ گھنشام کے اُس دوست کے گھر گئے جہاں وہ ٹھہرا کرتا تھا۔ انہیں پتہ چلا کہ وہ ہوڑا ایکسپریس سے چلا گیا ہے۔ ان کے پاس کچھ پیسے تھے۔ ایک آڑھتی سے انہوں نے خاصی رقم لے لی۔ ایک ایک چاقو دونوں کے پاس تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن چلے گئے۔ لیکن کسی اور طرف سے پلیٹ فارم پر گئے۔ انہیں بہن اُس وقت نظر آئی جب گاڑی چل پڑی اور بہن انجن کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ وہ اُس کے پیچھے دوڑے لیکن گاڑی تیز ہوگئی۔ بہن کو انہوں نے آگے والے ایک ڈبے میں سوار ہوتے دیکھا تو وہ پچھلے ایک ڈبے میں بغیر ٹکٹ سوار ہوگئے۔ راستے میں ٹکٹ چیکر آیا تو انہوں نے امرتسر سے آگے کے تیسرے یا چوتھے کسی سٹیشن تک کے ٹکٹ بنوا لیے۔ (مجھے اس سٹیشن کا نام یاد نہیں رہا)

جہاں بھی گاڑی رُکی انہوں نے انٹر اور تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں بہن کو دیکھا۔ انہیں کہیں بھی نظر نہ آئی۔ رات ہو چکی تھی۔ سیکنڈ اور فسٹ کلاس کے تمام ڈبوں کے شیشے اور شٹر گرے ہوئے تھے۔ یہ تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی بہن سیکنڈ کلاس میں جا رہی ہے۔ اُن کے ٹکٹ والا سٹیشن گزر گیا۔

انہوں نے پرواہ نہ کی اور دلّی تک چلے گئے۔ وہاں سیکنڈ کلاس سے مسافر اُترے تو بھائیوں نے بہن اور گھنشام کو دیکھ لیا۔ بہن انہیں نہ دیکھ سکی۔ وہاں سے گاڑی چلی تو وہ اسی کمپارٹمنٹ کے ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں چڑھ گئے۔ یہ انٹر کلاس تھا۔ انہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں ڈبوں کے پائیدان دُور دُور نہیں۔ گاڑی جب دِلّی سے آگے نکل گئی تو دونوں انٹر کلاس کے پائیدان سے سیکنڈ کلاس کے پائیدان پر چلے گئے۔ انہوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ دروازہ اگر اندر سے لاک ہُوا تو وہ چاقوؤں سے شیشہ اور کھڑکی کا شٹر توڑ کر اندر چلے جائیں گے مگر انہیں دروازہ کھُلا مل گیا۔ لیور گھمایا تو دروازہ کھُل گیا۔ اُس وقت لڑکی گھنشام کے بازوؤں میں تھی۔ قتل کے لیے یہ جواز کافی تھا۔ انہوں نے گھنشام کے قتل کا طریقہ وہی بتایا جو آپ اُن کی بہن کی زبانی سُن چکے ہیں۔ اس کا گلا گھونٹ کر اُسے گاڑی سے باہر پھینک دیا اور اگلے سٹاپ والے سٹیشن کے قریب بہن کو ساتھ لے کر اُتر گئے۔ دوسرے دن وہ بہن کو اُسی سٹیشن سے گاڑی پر سوار کر لائے۔ ہم نے جب امرتسر میں ان کے گھر چھاپہ مارا تو انہوں نے بہن کو کنوئیں میں پھینکنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن مَیں بروقت پہنچ گیا۔ ان دونوں پر مَیں نے اور انسپکٹر راجرز نے بہت جرح کی لیکن انہیں قتل کے علاوہ اور کسی جرم میں ملوث نہ پایا۔ "ماتا" کے گروہ کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ اس گروہ کے اس قدر خلاف تھے کہ انہوں نے گھنشام سنگھ کے امرتسر والے دوستوں کی نشاندہی کی اور اُن کے خلاف گواہی دینے کی بھی پیش کش کی۔

دونوں بھائی ہمارے ملزم نہیں تھے۔ ان کے خلاف رپورٹ شہادت کی فہرست کے ساتھ ہم نے متعلقہ تھانے کو بھیج دی۔ ان کے خلاف قتل کا الزام تھا۔ انہیں متعلقہ تھانے بھجوانے کا انتظام کر کے اُن کی بہن اور باپ کو ہم امرتسر لے گئے۔ وہاں "ماتا" کے سات سپوت گرفتار کیے جا چکے تھے۔ اُن کے گھروں سے "ماتا" کے ڈیسک اور گھنشام کے دوست کے گھر سے دستاویزی ثبوت بھی مل گئے۔ سیدھے طریقے سے اُن کے خلاف جُرم ثابت کرنا ذرا مشکل تھا۔ مَیں نے اسی کو بہانہ بنایا اور انسپکٹر راجرز سے کہہ کر

لڑکی کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا۔ "ماتا" کے سپوتوں کا دل گُردہ ملاحظہ کیجیے کہ ہم نے انہیں اذیت کی پہلی سیڑھی پر ہی رکھا تو ہر ایک نے جُرم کا اعتراف کر لیا۔ مَیں اذیت رسانی کا قائل نہیں تھا لیکن اُن کی ہڈی پسلی ایک کر دینا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے موقع ہی نہ دیا۔ چار اور دوستوں کی نشاندہی کر دی لیکن وہ فوری طور پر پکڑے نہ جا سکے کیونکہ اِن سات کی گرفتاری سے وہ روپوش ہو گئے تھے۔

یہاں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ سب کے اقبالی ہو جانے سے وعدہ معاف گواہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ انسپکٹر راجرز نے لڑکی کو اس رعایت سے محروم کر دیا۔ مَیں اسے سزا سے بچانا چاہتا تھا۔ مَیں نے اُس کے باپ سے دو وعدے کیے تھے: ایک یہ کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو باپ بیٹی کے ساتھ کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ مَیں اُس کے دل میں مسلمان کی محبت پیدا کروں گا۔ مَیں نے انسپکٹر راجرز سے صاف کہہ دیا کہ میں لڑکی کو بچانا چاہتا ہوں۔ اُسے جذباتی دلائل دیئے۔ وہ زندہ دل آدمی تھا۔ کہنے لگا ـــــ "مسٹر خان! آپ تو شادی شدہ ہیں۔ مَیں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں۔ لڑکی میں اتنی کشش ہے کہ ایک شادی شدہ آدمی اس کی محبت میں گرفتار ہو جائے" ـــــ آخر وہ میری بات سمجھ گیا۔ اُسے میری یہ دلیل بہت پسند آئی تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ مَیں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمان محبّت سے نفرت کو محبت میں بدل سکتا ہے۔

مجھے وہ وقت ساری عمر نہیں بھُولے گا جب "ماتا" کے سارے گروہ کو دس دس سال سزائے قید سُنائی گئی اور لڑکی کو وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے آزاد کر دیا گیا تو اس کا باپ میرے پاؤں میں گر پڑا تھا۔ تب مَیں نے اُسے بتایا کہ اُس کی بیٹی کو مَیں نے کس طرح بچایا ہے۔ اس کے بعد مَیں نے باپ بیٹی کی صورت نہیں دیکھی۔ سردار سُرجیت سنگھ مر گیا ہو گا۔ اگر اُس کی بیٹی دلجیت کور زندہ ہے تو اُس نے اپنے بچّوں کو ضرور بتایا ہو گا کہ مسلمان کا دل محبت سے بھرا پڑا ہے اور مسلمان جب نفرت کرتا ہے تو کھُلے میدان میں للکار کر کرتا ہے، زمین دوز، خفیہ اور مجرمانہ طریقوں سے نفرت کا اظہار

نہیں کیا کرتا۔

دونوں بھائیوں کو پانچ پانچ سال سزائے قید دی گئی تھی۔ بہن نے یہ بیان دیا تھا کہ وہ گھر سے زیورات اور نقدی چرا کر بھاگ رہی تھی اور جب اُس کے بھائی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اُس وقت وہ گھنشام کے بازوؤں میں تھی۔ اس بیان سے فوری اشتعال ثابت ہو گیا تھا۔ اسی بنا پر انہیں تھوڑی سزا ملی۔ بہن نے بھائیوں کو سزائے موت یا عمر قید سے بچا لیا۔

کالی چھپکلی اور ریت کے رستم

لڑکی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ شراب کی بوتل پڑی تھی۔ لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ اُس نے دیکھا کہ پولیس آ گئی ہے تو وہ اُٹھی مگر اُس کا سر ڈول گیا اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

آپ نے حکایت میں جرائم کی کہانیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جسے آپ "دنیا کے عجیب وغریب جرائم" کہتے ہیں۔ کہانیاں دلچسپ ہیں لیکن میری رائے یہ ہے کہ شریف لوگوں کی نظر میں ہر جرم عجیب وغریب ہوتا ہے۔ ان کا ذہن قبول ہی نہیں کرتا کہ کوئی انسان کوئی گھناؤنا جرم کر سکتا ہے۔ بہرحال وہ قبول کریں نہ کریں جرائم ہوتے ہیں اور ہوتے ہی رہیں گے۔ انسانی فطرت ایسی ہے کہ اس میں نیکیوں کی بھی کوئی حد نہیں اور بدی کی بھی کوئی حد نہیں۔ انسان جس راستے پہ چل پڑے وہ سمجھتا ہے کہ اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اکثر اوقات اچھے بھلے آدمی میں اچانک جرم کی تحریک ہوتی ہے اور وہ بے قابو ہو کر جرم کر گزرتا ہے۔ وہ چونکہ پیشہ ور نہیں ہوتا اس لیے عجیب وغریب احمقانہ حرکتیں کرتا ہے۔ ایسے جرائم شدید فوری اشتعال یا جذبات سے اندھے ہو کر کیے جاتے ہیں۔ اشتعال اور جذبات کی شدت عقل کو بیکار کر دیتی ہے۔ کسی بھی پولیس آفیسر سے پوچھیں وہ آپ کو ایسی بے شمار وارداتیں سُنائے گا جو صرف عجیب وغریب نہیں ہوں گی بلکہ آپ انہیں سچ مانیں گے ہی نہیں۔

میں آپ کو ایسے ہی ایک جرم کی کہانی سُناتا ہوں جس کا ارتکاب جذبات نے کرایا تھا۔ کیا آپ سچ مانیں گے کہ ایک دلہن کو پہلی رات کمرۂ عروسی میں پلنگ پر بٹھایا گیا مگر دُلہا میاں پہلی

ملاقات کے لیے اندر گئے تو دُلہن غائب تھی۔ وہ کوئی بدمعاش لڑکی نہیں، شریف اور پردہ دار تھی۔ میں نے جب تفتیش شروع کی تو یہ میرے لیے تو نہیں شہریوں کے لیے عجیب وغریب واردات بن گئی۔

واقعہ یُوں ہُوا کہ چار بجے شام دو بزرگ اور ایک نوجوان یہ رپورٹ درج کرانے آئے کہ گزشتہ رات دُلہن کمرۂ عروسی سے لاپتہ ہوگئی ہے۔ ان میں ایک دُلہن کا باپ تھا، دوسرا دُلہا کا باپ اور تیسرا دُلہا تھا۔ واقعات یہ بتائے گئے کہ کل پچھلے پہر ڈولی آئی۔ رات دُلہن کو کمرۂ عروسی میں داخل کیا گیا۔ نو بجے کا وقت تھا۔ دُلہا باہر دوستوں میں بیٹھا تھا۔ پندرہ منٹ بعد دُلہا کی بہن دُلہن کے لیے دُودھ لے کر گئی لیکن اندر سے دروازہ بند تھا۔ بہن یہ سمجھی کہ دُلہا دوسرے دروازے سے اندر آگیا ہے۔ دُلہا کو برآمدے والے یعنی اندر والے دروازے سے کمرے میں جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد دُلہا آیا اور اندر والے دروازے سے کمرے میں جانے لگا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ڈیوڑھی والے دروازے کی طرف سے گیا۔ وہ دروازہ کھُلا تھا۔ اندر جا کے دیکھا۔ وہاں دُلہن نہیں تھی۔ اُس کی شلوار پلنگ پر پڑی تھی۔ پلنگ کی چادر غائب تھی اور کمبل بھی غائب تھا۔ موسم کچھ سرد ہوگیا تھا۔ لوگ برآمدوں میں یا کمروں میں سوتے اور کمبل یا کھیس اُوپر لیتے تھے۔ کمرۂ عروسی میں بھی پلنگ پر نیا کمبل رکھا گیا تھا۔ ان لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ دُلہن اغوا ہوگئی ہے۔

یہ بلاشک وشبہ پولیس کا کیس تھا۔ اُسی وقت پولیس کو اطلاع کر دیتے تو قصبے کی ناکہ بندی کر لی جاتی۔ وہ چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں سے رات کو ایک مسافر گاڑی گزرتی تھی۔ وہ آج کی طرح بسوں اور ٹیکسیوں کا زمانہ نہیں تھا۔ قصبے میں کُل چار لاریاں تھیں جو صرف دن کے وقت چالیس میل دُور ایک

شہر تک ایک طرف اور دوسری طرف تیس بتیس میل دُور ایک اور شہر تک جاتی اور آتی تھیں۔ رات کے وقت کوئی لاری نہیں چلتی تھی، اس لیے ناکہ بندی کی کامیابی کی توقع رکھی جاسکتی تھی، مگر ان لوگوں نے اتنے سنگین جُرم کی تفتیش اُنھی شروع کردی۔ ساری رات گزار دی۔ اگلا دن بھی گزار دیا اور میرے پاس اُس وقت آئے جب دُلہن کم از کم پانچ سو میل دُور پہنچ چکی ہوگی۔ مَیں جانتا تھا کہ یہ لوگ شرم کے مارے دلہن کی گمشدگی کو چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ خود ہی اِدھر اُدھر تلاش کرتے رہے۔ آخر سخت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئے۔

مَیں نے اُن سے بہت کچھ پوچھا۔ مَیں نے دیکھا کہ دُلہن کا باپ، دُلہا اور اس کے باپ کے سامنے میرے سوالوں کا جواب دینے سے جھجکتا تھا۔ مَیں اُسے الگ لے گیا اور اسے کہا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کو برآمد کرانا چاہتا ہے تو یہ ذہن سے اُتار دے کہ وہ اُس کی بیٹی تھی۔ اگر اُس کا چال چلن مشکوک تھا یا وہ کسی اور کو چاہتی تھی تو اس کے اظہار سے باپ کو جھجکنا نہیں چاہیے۔ مَیں اس لائن پر سوچ رہا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی ہے۔

باپ کی جذباتی حالت بہت ہی بُری تھی۔ شریف اور عزت دار آدمی تھا۔ بولتا کم اور روتا زیادہ تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اس کے گھر میں پردے کی پابندی ہے۔ لڑکی باہر نہیں جاتی تھی۔ کسی سہیلی کے گھر جاتی تو ماں سے پوچھ کر اور بُرقعے میں جاتی تھی۔ باپ کو کبھی ایسا اشارہ نہیں ملا تھا کہ لڑکی کسی کو چاہتی ہے۔ اُس کا رشتہ طے ہُوا، منگنی ہوئی، شادی ہوئی۔ اُس نے اپنی ماں سے اور چھوٹی بہن سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے شک ہوتا کہ اُسے یہ رشتہ منظور نہیں۔ باپ نے مجھے یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ اس کی بیٹی ایسی ویسی نہیں تھی۔ مَیں نے ذہن میں یہ نوٹ کیا کہ باپ کو اپنی بیٹی کے دل کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں، یا وہ اپنی عزت کی خاطر چھپا رہا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ باپ اپنی بیٹیوں کے خلاف کوئی بات کرتے بھی نہیں، سُنتے بھی نہیں اور اُن پر کسی قسم کی تُہمت تسلیم ہی

نہیں کرتے۔

دوسرا شک یہ تھا کہ لڑکی کو کسی نے انتقاماً زبردستی اغوا کیا ہے۔ یہ تو مَیں مکان کا محلِ وقوع دیکھ کر رائے قائم کرسکتا تھا کہ وہاں زبردستی اغوا ممکن تھا یا نہیں۔ ایسا امکان کم ہی نظر آتا تھا کیونکہ اغوا غیر معمولی طور پر دلیرانہ اور خطرناک واردات ہے جس کا ارتکاب کوئی پیشہ ور ہی کرسکتا ہے۔ مَیں نے دُلہن کے باپ سے پوچھا کہ لڑکی کے چند اور امیدوار بھی ہوں گے جنہیں رشتے سے جواب دیا گیا ہوگا۔ اُن میں سے کسی نے انتقامی ردِ عمل کا اظہار کیا ہوگا یا دھمکی دی ہوگی۔

باپ نے بتایا کہ یہ رشتہ ایسا ہے کہ اسی گھر میں دینا تھا۔ یہ برادری کے رشتوں کا لین دین تھا جس کے تحت بات کیے بغیر سمجھا جاتا تھا کہ فلاں لڑکی فلاں گھر میں جائے گی۔ پھر بھی دو گھرانوں نے رشتہ مانگا تھا۔ انہیں دھتکارا نہیں گیا تھا۔ انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ برادری کی پابندیوں کی وجہ سے یہ رشتہ نہیں دیا جاسکتا۔ ان گھرانوں نے مجبوری سمجھ لی تھی۔ باپ کی نگاہ میں لڑکی کی گمشدگی کسی کی انتقامی کارروائی نہیں تھی۔

تیسرا شک انسانی نفسیات سے تعلق رکھتا تھا۔ بعض باپ اولاد کو گھر کی زنجیروں میں باندھے رکھتے ہیں۔ لڑکی کو تو وہ پنجرے کا پرندہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس وہم میں مبتلا رہتے ہیں کہ ذرا بھول چوک ہوئی اور لڑکی گئی۔ لڑکی اپنے کوٹھے پر جائے تو باپ اُسے فوراً نیچے آنے کو کہتا ہے۔ اچھی قسم کے باپ شفقت سے بات کرتے اور سمجھاتے ہیں۔ سخت مزاج باپ حکم اور غصّے کے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ دن بھر لڑکیوں کے لیے وبالِ جان بنے رہتے ہیں — "دوپٹہ اچھی طرح لے.... دانت نہ نکالا کر.... دروازے میں کھڑی کیا کر رہی تھی۔ ٹانگیں توڑ دوں گا پھر کبھی دروازے میں دیکھا تو"۔ وہ اس قسم کے حکم چلاتے رہتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ بچی بڑی معصوم اور صابر ذات ہوتی ہے۔ وہ باپ سے شفقت کی طلب گار ہوتی ہے اور اس کے عوض تمام رات باپ کا سر دبانے یا ٹانگیں دبانے

کے لیے تیار رہتی ہے۔

لڑکے جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کی اگر نفسیاتی ضروریات جن میں شفقت سرِ فہرست ہے پوری ہوتی رہیں تو وہ اپنے خاندان کی عزت پہ مرمٹتی ہیں۔ اکثر باپ لڑکیوں پہ اتنی سخت نگرانی کرتے اور ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ بعض لڑکیوں میں تلخی اور گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ لڑکیاں ایسی بھی نکل آتی ہیں جو اپنے لیے معمہ بن جاتی ہیں۔ ان کے اندر مجرمانہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ جہاں انہیں موقعہ ملتا ہے وہ جرم کر گزرتی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی چکر ہے جس میں آئی ہوئی لڑکی بچ کر نکل نہیں سکتی اور لوگ حیران ہوتے ہیں کہ اتنی شریف اور پردہ دار لڑکی نے یہ جرم کیا ہے۔

یہاں بھی مجھے ایسا ہی شک تھا۔ اور خاصی حد تک میرا شک صحیح ثابت ہُوا۔ جرح کر کے میں نے معلوم کر لیا کہ باپ سخت مزاج ہے اور اُس کے احکام بھی سخت ہیں۔ لڑکیوں کے متعلق اُس کی رائے یہ تھی کہ انہیں ذرا بھی ڈھیل نہیں دینی چاہیے اور اُن کا کوئی قدم باپ کی اجازت کے بغیر نہیں اُٹھنا چاہیے۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ لڑکی باپ کے گھر میں ہر قدم اس کی اجازت سے اٹھاتی رہی اور یہ قدم اُس نے اپنی مرضی سے اُٹھایا ہے جو میرے ریکارڈ کا "عجیب و غریب جرم" بن گیا ہے۔

مَیں نے باپ سے لڑکی کی دماغی حالت کے متعلق پوچھا۔ اُس نے کہا کہ وہ نارمل ذہن کی لڑکی تھی۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ پاگل تھی۔ دماغ کی کچھ اور خرابیاں بھی ہوتی ہیں بعض انسانوں کا دماغ ایک دو منٹ کے لیے بگڑتا ہے۔ اس کی تین چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اُٹھ کے چل پڑتا ہے مگر یہ اکثر نیند میں ہوتا ہے۔ باپ نے بتایا کہ اُسے ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مجھے یہ شک تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کی آنکھ لگ گئی ہو اور وہ نیند میں چل پڑی ہو۔

یہ بھی میرے پیشِ نظر تھا کہ اس کی شلوار پلنگ پر پڑی تھی اور پلنگ کی چادر اور کمبل غائب تھا۔ مَیں نے ایسے مریض دیکھے ہیں جو نیند میں کپڑے تک بدل کر کمرے اور صحن میں گھومتے پھرتے اور پلنگ پر واپس آجاتے ہیں۔ باپ نے بتایا کہ اُس میں ایسا کوئی نقص نہیں تھا۔ بعض انسان اچانک غصے میں پھٹ پڑتے اور کوئی ناروا حرکت کر بیٹھتے ہیں، مگر فوراً ہی پچھتانے لگتے ہیں۔ اسے ہم ایک لمحے کا پاگل پن کہتے ہیں۔ خودکُشی اور قتل اسی عارضی پاگل پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دُلہن کے باپ نے بتایا کہ اس کی بیٹی میں ایسی عادت بھی نہیں تھی۔

اس کے بعد ایک ہی پہلو رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ لڑکی خود بھاگی ہے۔ اگر میرا دماغ ٹھیک کام کر رہا تھا تو مَیں نے اس جُرم کا یہ خاکہ بنایا کہ لڑکی نے شلوار اتاری اور پلنگ کی چادر دیہاتی عورتوں کی طرح کمر سے باندھ لی۔ اُس نے کمبل اوڑھا اور باہر نکل گئی۔ ایک صورت یہ تھی کہ اس نے خودکُشی کی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ ریل گاڑی کے نیچے آسکتی تھی لیکن یہ بعید از قیاس تھا کیونکہ خودکُشی کی رپورٹ تھانے میں آچکی ہوتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اُس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ دریا قصبے سے ایک میل دُور تھا۔ اس صورت میں لاش ملنے کا یا جلدی ملنے کا امکان کم تھا، اور ایک صورت یہ بھی تھی کہ لڑکی خودکُشی کے لیے جا رہی تھی کہ کوئی بدمعاش اُسے لے اڑا۔ اگر ایسا بھی نہیں ہُوا تو لڑکی بھیس بدل کر اور اپنے آپ کو کمبل میں چھپا کر بھاگنے کے ارادے سے باہر گئی۔ باہر اس کا آشنا کھڑا تھا جو اُسے ساتھ لے گیا۔

ایک ریل گاڑی رات دس بجے کے قریب چلی گئی تھی۔ دوسری دن کے گیارہ بجے گئی۔ تین چار لاریاں بھی جا چکی تھیں۔ لہٰذا لڑکی کو قصبے میں تلاش کرنا بیکار تھا۔

کالی چھپکلی اور کمرۂ عروسی

لڑکی کے بھاگنے یا خودکُشی کے لیے جواز موجود تھا جو میرے سامنے تھا۔ وہ تھا دُلہا۔ مَیں نے

یہ معلوم کر لیا تھا کہ لڑکی اچھی خاصی خوبصورت تھی اور اس کا قد بُت بھی اچھا تھا۔ یعنی اُس کی شکل، صورت اور قد بُت میں اتنی کشش تھی کہ اُسے دیکھ کر رنگین مزاج انسانوں کے دلوں میں اغوا کی خواہش پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کے مقابلے میں دُلہا میاں اُس کا اُلٹ تھا۔ قد چھوٹا، جسم دُبلا، چہرہ زردی مائل سانولا، گال اندر کو پچکے ہوئے اور آنکھوں کے قریب کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ لڑکی کا رنگ گورا اور آنکھیں سیاہی مائل بادامی رنگ کی بتائی گئی تھیں۔ دُلہا کا سر شاہ دولے کے چوہوں کی طرح چھوٹا اور مخروطی تھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ مَیں اُس کا مذاق نہیں اُڑا رہا۔ ہر انسان کا خالق خدا ہے۔ کسی کی بدصورتی کا مذاق اللہ کے حضور گستاخی ہوتی ہے۔ مَیں نے دُلہا کی شکل وصورت صرف اس لیے بیان کی ہے کہ جُرم کا باعث معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ اتنی خوبصورت اور گورے رنگ کی لڑکی کو ایسے بدصورت لڑکے سے بیاہ دینا مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ مرد کو تو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرے مگر لڑکی پر یہ ظلم کیا جاتا ہے کہ برادری کی پابندیوں کی وجہ سے یا دولت کے لالچ میں بھدّے بدصورت مرد اور بعض اوقات بڑی عمر کے مرد کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ اس واردات میں میرا یہ شک پختہ ہوتا گیا کہ یہ لڑکی باغی ہو گئی ہے۔ اُس نے خودکشی کر لی ہے یا اپنے چوری چھُپے کے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

مَیں نے دُلہا کو الگ بٹھا لیا۔ وہ مغموم تھا۔ اس کی مردانگی پر کاری چوٹ پڑی تھی۔ مَیں نے جب اس کے ساتھ باتیں شروع کیں تو معلوم ہُوا کہ وہ ذہنی لحاظ سے بھی بھدّا اور کاہل ہے۔ میرا سوال سُن کر خالی خالی سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگتا۔ مَیں اپنا سوال دُہراتا تو وہ ادھورا سا جواب دیتا۔ مَیں یہ تو سمجھ سکتا تھا کہ دُلہن کی گمشدگی یا فرار نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا ہے لیکن ذہنی کاہلی اُس کی عادت معلوم ہوتی تھی۔ بعد میں اُس کے باپ سے بات ہُوئی تو اس نے کہا تھا ——

"یہ تو بھولا بادشاہ ہے۔"

میری نگاہ میں یہ بادشاہ ضرورت سے زیادہ ہی بھولا تھا۔ عورت ذات اتنے زیادہ بھولے بادشاہوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا کرتی کیونکہ خاوند کو وہ اپنا فخر سمجھتی ہے اور وہ اپنے فخر کو مذاق کا نشانہ بنتا نہیں دیکھ سکتی۔

"شادی سے پہلے تم نے لڑکی کو دیکھا تھا؟" —— مَیں نے دُلہا سے پوچھا۔

اُس نے جواب دیا کہ بہت قریبی رشتہ داری ہے۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اکٹھے کھیلے بھی تھے —— رشتہ طے ہونے تک ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے رہے ہیں۔

"لڑکی تمہیں پسند کرتی تھی؟" —— مَیں نے سیدھے لفظوں میں سوال داغ دیا اور یہ بھی پوچھا "تمہارے ساتھ اُس کا سلوک کیسا تھا؟"

وہ عادت کے عین مطابق کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ مجھے بڑی ہی پیچ دار جرح کرنی پڑی۔ کوئی خاص بات معلوم کرنے کے لیے جرح ایک خاص ڈھنگ سے کی جاتی ہے۔ بعض باتیں گپ شپ کے انداز میں کی جاتی ہیں۔ یہ استادی صرف پولیس والے جانتے ہیں۔ مَیں نے اس اُستادی سے دلہا سے معلوم کر لیا کہ لڑکی نے اُسے کبھی نفرت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھا تھا اور پسند بھی نہیں کیا تھا۔ مَیں نے اُس سے یہ بھی اُگلوا لیا کہ لڑکی اُس کا مذاق بھی اُڑاتی تھی۔ دو بار لڑکی نے اسے کالی چھپکلی بھی کہا تھا۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ لڑکی اُسے ایک بھدّا بدصورت رشتہ دار سمجھتی تھی۔

مَیں نے یہ رائے قائم کی کہ لڑکی کا رشتہ طے ہُوا تو لڑکی کو بہت دُکھ ہُوا ہو گا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ لڑکی اسے ناپسند کرتی تھی تو وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی یا کسی اور کے ساتھ اس کا میل جول تھا؟

مَیں نے دُلہا سے صاف الفاظ میں پوچھا تو اُس نے پہلے تو گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا اور اُسے شاید غصہ بھی آ گیا تھا۔ اُس نے سوچ کر یا جھینپ کر جواب دیا کہ وہ کسی اور کو پسند نہیں کرتی تھی۔

اُس کا جواب دینے کا انداز ایسا تھا جس سے مجھے شک ہُوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مَیں نے پوچھا کہ رشتہ طے ہو جانے کے بعد کسی نے اُسے براہِ راست یا کسی کی زبانی کوئی دھمکی دی تھی؟

"نہیں" ۔۔۔ یہ جواب بھی اُس نے کوشش کر کے منہ سے نکالا۔ مَیں نے رپورٹ کا اندراج اور دیگر ضابطے کی کارروائی کی۔ اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ریلوے سٹیشن سے پتہ کرے کہ رات کی گاڑی سے کوئی لڑکی کمبل اوڑھے ہوئے، اور چادر باندھے ہوئے کسی کے ساتھ گئی تھی یا نہیں۔ مَیں نے اُسے حلیہ اور لباس اچھی طرح سمجھا دیا اور اُسے کہا کہ لاریوں کے اڈے سے بھی معلوم کرے۔

اُسے اُدھر بھیج کر مَیں وہ مکان دیکھنے گیا جہاں سے دُلہن لاپتہ ہوئی تھی۔ یہاں میں پھر اسی افسوس کا اظہار کروں گا جو مَیں کئی کہانیوں میں کر چکا ہوں کہ یہ واردات بھی مسلمان گھرانوں کی تھی۔ ہندو کچھ پاک تو نہیں تھے۔ ہندو سے زیادہ ناپاک قوم اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کے گھروں میں ایسی شرمناک وارداتیں نہیں ہوتی تھیں۔ مَیں اس محلے میں داخل ہُوا تو تماشائی میرے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ مَیں اندازہ کر سکتا تھا کہ لڑکی کے باپ اور سُسر کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ مَیں گلی کے دونوں طرف کے مکانوں کو دیکھتا واردات والے مکان میں داخل ہو گیا۔ مجھے وہ کمرہ دکھایا گیا جہاں سے دُلہن غائب ہُوئی تھی۔

اس کمرے کا ایک دروازہ اندر تھا اور دوسرا ڈیوڑھی میں کُھلتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور دروازہ تھا جو مکان کے صحن اور ڈیوڑھی کو ملاتا تھا، اور ایک دروازہ ڈیوڑھی کا تھا جو گلی میں کُھلتا تھا۔ یہیں سے گلی شروع ہوتی تھی۔ گلی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ پانچ مکان ایک طرف تھے اور سات دوسری طرف۔ واردات والا مکان گلی کو بند کر دیتا تھا۔ گلی سڑک سے جا ملتی تھی جس کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ مکان کی سیڑھیاں ڈیوڑھی میں تھیں۔ گلی میں کوئی بتّی نہیں تھی۔ سڑک پر بھی بتّی نہیں تھی۔

مَیں جب وہاں پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ لڑکی کا بھاگنا یا اغوا اس وجہ سے آسان تھا کہ وہ قصبہ تھا جہاں کی زندگی شام گہری ہوتے ہی سو جایا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں کاروبار کا آج والا ہنگامہ نہیں تھا۔ آبادی بہت کم تھی جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انگریزوں نے خاندانی منصوبہ بندی کا محکمہ نہیں کھولا تھا۔ رات نو بجے تو قصبہ قبرستان کی طرح خاموش ہو جایا کرتا تھا۔ اُسی روز ڈولی آئی تھی۔ گھر میں مہمانوں کی کچھ تعداد تھی مگر مہمانوں کا ہنگامہ صحن کی طرف تھا۔ اُس طرف ایک اور دروازہ تھا جو ایک میدان کی طرف کُھلتا تھا۔ ایک کشادہ ڈیوڑھی اُس طرف بھی تھی۔ گھر کی عورتیں اور مہمان عورتیں اس ڈیوڑھی اور ساتھ والے ایک کمرے میں کھانے، گانے اور ہنسنے کھیلنے میں لگی ہُوئی تھیں۔ دُلہا باہر میدان میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ لگا رہا تھا۔ گلی کی طرف کوئی رش نہیں تھا۔

مَیں نے کمرۂ عروسی کو اندر جا کر بڑی ہی غور سے دیکھا۔ پلنگ پر پلنگ پوش نہیں تھا۔ دُلہن کی شلوار پلنگ سے اُٹھا کر الماری میں رکھ دی گئی تھی۔ مجھے دکھائی گئی۔ مَیں نے اسے پولیس کی گہری نظر سے دیکھا۔ اس پر مجھے تشدّد کا اور زبردستی کا کوئی ثبوت نظر نہ آیا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں ایسا ہی نہ ہُوا ہو کہ لڑکی کو اغوا کرنے والے اسے چادر اور کمبل میں لپیٹ کر اور گٹھڑی کی طرح اُٹھا کر لے گئے ہوں، لیکن یہ دلیری پیشہ ور ہی کر سکتے تھے۔

یہ سوال بھی میرے سامنے آیا کہ انہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ لڑکی کو فلاں وقت کمرے میں داخل کیا جائے گا اور دُولہا ایک گھنٹہ بعد کمرے میں آئے گا؟ اندر کے دروازے کی چٹخنی کس نے چڑھائی تھی؟ اور یہ بھی ایک معمّہ تھا کہ دُلہن کی شلوار کمرے میں کیوں رہ گئی؟ اس کی جُوتی بھی وہاں نہیں تھی۔ اگر اُسے اٹھایا گیا تو پلنگ سے اُٹھایا گیا ہوگا۔ اُس کی جُوتی وہیں رہ جانی چاہئیے تھی۔ اس صورت میں لڑکی کی کوئی آواز نکلنی چاہیئے تھی۔ مَیں نے گھر والوں سے پوچھا کہ دُلہن کی گمشدگی کے بعد وہ اس کمرے

میں آئے تو انہوں نے یہاں کوئی بُو محسوس نہیں کی تھی؟ میرا مطلب کلوروفارم سے تھا۔ مجھے نفی میں جواب ملا۔

دُلہن کے ساتھ ایک مشکوک عورت

ڈیوڑھی میں بتی جل رہی تھی۔ میں ڈیوڑھی میں گیا۔ سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ چھت پر جا کر جائزہ لیا۔ ساتھ والے مکانوں کی چھتوں سے بھاگ کر جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نیچے آیا تو ڈیوڑھی میں تین چار آدمی کھڑے تھے۔ مجھے سلام کر کے پرے ہٹ گئے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ گلی والے مکانوں میں رہتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ تمہاری نظروں کے سامنے سے لڑکی نکل گئی اور تم لوگوں کو پتہ نہیں چلا۔

ان میں سے ایک نے میرے قریب آ کر کہا — "میں کچھ بتانے کے لیے حاضر ہوا ہوں ..... میں دیر سے باہر سے آ رہا تھا۔ چاندنی میں مجھے ایک آدمی گلی میں جاتا نظر آیا۔ میں اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا جب وہ میرے قریب سے گزرا۔ میں سمجھا کہ اس گھر کا کوئی مہمان ہوگا۔ وہ اسی گھر سے نکلا تھا۔ صبح جب پتہ چلا کہ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے اور یہ بھی کان میں پڑی کہ کمبل اور چادر بھی غائب ہے تو مجھے یہ آدمی یاد آنے لگا۔ اُس نے چادر باندھ رکھی تھی اور سر پر کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ تب میرے دماغ میں آئی کہ سردی نہایت معمولی تھی لیکن اس آدمی نے منہ اور سر بھی کمبل میں چھپا رکھا تھا۔ مجھے ایسے شک ہونے لگا کہ وہ دُلہن ہی تو نہیں تھی؟ رات کو چونکہ مجھے کوئی شک نہ تھا اس لیے میں نے توجہ نہ دی۔"

"ذہن پر زور دیں" — میں نے اُسے کہا — "تصور میں اُسے جاتا ہوا دیکھیں اور بتائیں کہ اس کی چال مردوں والی تھی؟ ہو سکتا ہے وہ کوئی بیمار مرد ہو۔"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آدمی عقلمند معلوم ہوتا تھا۔ خود اعتمادی سے کہنے لگا — "وہ بیمار کی چال نہیں تھی" — وہ چپ ہو گیا اور اچانک بولا — "چال لڑکی کی تھی۔ قدم چھوٹے اور تیز تھے۔ مجھے ایسے شک ہوتا ہے جیسے میں نے ہلکی سی جھنکار بھی سُنی تھی۔ یہ زیورات کی تھی یا چُوڑیوں کی، مجھے یاد نہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ لڑکی تھی۔ اگر لڑکی نہیں تھی تو کوئی نوجوان لڑکا تھا۔"

"گلی سے باہر یا کچھ پرے آپ نے کسی کو کھڑے دیکھا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"گلی سے کوئی پچاس گز دُور ایک تانگہ کھڑا تھا" — اُس نے جواب دیا — "تانگہ بان تانگے میں تھا اور دو آدمی تانگے کے قریب کھڑے تھے۔"

"آپ انہیں پہچان سکتے ہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "چاندنی تو اچھی تھی لیکن میں اُن کے چہرے اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔"

"باہر کا ماحول کیسا تھا؟" — میں نے پوچھا — "سڑک پر یا بازار میں کچھ لوگ تھے؟"

"اللہ کا نام تھا" — اس نے جواب دیا — "بس وہ تانگہ تھا اور دو آدمی اُس کے پاس کھڑے تھے۔ پہرہ کھڑا ہو چکا تھا۔"

مجھے یاد آ گیا کہ رات پہرہ بھی ہوتا ہے۔ یہ سرکاری انتظام تھا۔ سارے قصبے میں بارہ گورکھے رات دس بجے سے سحر تک گھوم پھر کر پہرہ دیا کرتے تھے۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اس وارڈ کے چوکیدار کو ساتھ لے آئے۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ لڑکی فرار ہو گئی ہے اور تانگہ اسی کے لیے لایا گیا تھا، مگر وہ دو آدمی تھے کون؟

میں کمرۂ عروسی میں ہی بیٹھ گیا۔ دُلہا کو دیکھا۔ وہ بُدھوؤں کی طرح چُپ چاپ تھا اور بہت ہی بے چین۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا اور بار بار ذہن میں آتا تھا کہ لڑکی اسے کالی چھپکلی کہا کرتی

تھی۔ وہ بیٹھ جاتا اور فوراً اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تین چار قدم چلتا اور رُک کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگتا۔ مَیں نے کہا کہ دُلہن کی ماں کو بلاؤ اور اگر دُلہن کی بہنیں ہوں تو انہیں بھی بلا لاؤ۔ معلوم ہُوا کہ دلہن کی ایک ہی چھوٹی بہن ہے جس کی عمر سولہ سترہ سال ہے۔ وہ [illegible] اور اُس کی ماں بھی وہیں آئی ہُوئی تھیں۔ مَیں نے سب سے کہا کہ لڑکی کی ماں کو میرے پاس بھیج کر سب باہر چلے جاؤ۔

کمرہ خالی ہو گیا۔ دُلہن کی ماں اندر آئی تو معلوم ہوتا تھا کہ گر پڑے گی۔ غم سے نڈھال تھی۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سُوج گئی تھیں۔ اس نے وہ نیا پلنگ دیکھا جو اُس نے بیٹی کو جہیز میں دیا تھا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ ہاتھ ملتی تھی اور [illegible] زور زور سے ہلاتی تھی۔ مَیں نے اسے تسلیاں دیں۔ اطمینان دلانے کے لیے جھوٹ بولے اور کہا کہ اس کی بیٹی کل صبح تک مل جائے گی۔

”اُسے اسی طرح غائب ہونا تھا تو میرے گھر سے اس کا جنازہ اُٹھتا۔ اتنی خوشیوں سے ڈولی میں بٹھائی“ — اور اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

پولیس والوں کو پتھر ہونا پڑتا ہے۔ اگر مَیں بھول جاتا کہ مَیں تھانیدار ہوں تو مَیں اس عورت سے زیادہ روتا۔ مَیں نے دل پہ پتھر رکھ کر کہا — ”رونے سے تو وہ واپس نہیں آ جائے گی۔ مَیں جو پوچھوں وہ بتا دو تو اسے واپس لے آؤں گا۔“

آپ جانتے ہیں کہ ماں بیٹی ہمراز ہوتی ہیں۔ اگر بیٹی ماں کو ہمراز نہ بنائے تو مائیں ایسی جاسوسی کرتی ہیں کہ بیٹی اُن سے اپنے پیٹ کے اندر کی بھی کوئی چیز نہیں چھپا سکتی۔ جوان بیٹیوں کی ماؤں کو جاسوسی کرنی ہی پڑتی ہے۔ مگر یہ ماں بیٹی کے معاملے میں ڈھلی ہوئی تختی نکلی۔ مَیں نے اس سے وہی سوال پوچھے جو لڑکی کے باپ سے پوچھے تھے۔ ماں نے بھی بیٹی کے چال چلن کی تعریف کی۔

مَیں نے اُسے کہا کہ لڑکی کو زمین نے نہیں نگل لیا اور ابھی کسی ماں نے اتنا دلیر بیٹا پیدا نہیں کیا جو شادی والے گھر سے دُلہن کو اُٹھا کر لے جائے۔ لڑکی نادان تھی۔ جذبات میں آ کر یا کسی کے

ورغلانے میں آ کر نکل گئی ہے۔ مجھے ذرا سا اشارہ دے دیں کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے آپ کے محلے یا برادری کا ہو گا۔

ماں نے رو رو کر، بَین کر کر کے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُس کی بیٹی نیک پاک تھی۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کو یہ رشتہ پسند تھا۔

”آپ کے گھر میں مشکوک چال چلن کی کوئی عورت آیا کرتی تھی؟“ — مَیں نے اُس سے پُوچھا۔

اُس نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔ میرے کریدنے پر اس نے بتایا کہ نوکرانی قسم کی ایک عورت اُن کے گھر آیا کرتی تھی۔ وہ بیاہ شادی اور ماتم کے موقعوں پر گھروں میں کام کرتی تھی۔ شادی بیاہ کا بلاوا دینے گھروں میں جاتی تھی اور اس کی ہر گھر میں بے تکلفی تھی، لیکن لڑکی کی ماں کو اس پر کسی قسم کا شُبہ نہیں تھا۔ اپنی مزید اور ہیرا پھیری والی جرح سے مَیں نے یہ معلوم کر لیا کہ یہ عورت اس کی بیٹی کے پاس بھی کبھی کبھی بیٹھا کرتی تھی۔

”کبھی ایسے بھی ہُوا ہے کہ آپ کی بیٹی سامنے نہیں تو اس عورت نے آپ سے پوچھا ہو کہ بیٹی کہاں ہے؟“ — مَیں نے پوچھا — ”اور پھر وہ اندر آپ کی بیٹی کے پاس جا بیٹھی ہو؟“

”کئی بار ایسے ہُوا ہے“ — اُس نے جواب دیا۔

”آپ کی بیٹی اس عورت کو بہت پسند کرتی تھی؟“ — مَیں نے کہا — ”دونوں اکیلی بیٹھتی تھیں؟“

ماں کے مُنہ سے ’ہاں‘ نکل گیا — مَیں محلوں کے ایسے کرداروں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہر قصبے اور بستی میں ایسی ایک نہ ایک عورت ضرور ہوتی ہے۔ یہ عورت ہر گھر کی رازدار اور ہر گھر کی نوکرانی ہوتی ہے۔ چالاکی اور چرب زبانی اس کا کمال ہوتا ہے۔ یہ ہر کسی کی ہمدرد ہوتی ہے اور

منہ مانگی اُجرت لے کر ہمدردی کے پردے میں جڑوں کو پانی دے جاتی ہے۔ یہ عورت دو دلوں کو جوڑ بھی سکتی ہے۔ اور توڑ بھی سکتی ہے۔ پردہ نشینوں کے عشق و محبت میں یہ پیغام رسانی کا کام کرتی ہے۔ میں نے جب گمشدہ لڑکی کی ماں کی زبان سے ۔۔۔ ایسی ہی ایک عورت کا ذکر سنا تو میں چونکا۔ اس کا نام قبولو بتایا گیا۔ میں نے ماں سے معلوم کر لیا کہ وہ ان کے گھر زیادہ آتی جاتی تھی۔ جب لڑکی کی ڈولی اس گھر میں آگئی تو وہ یہاں بھی یعنی لڑکی کے سسرال آگئی۔

میں نے ماں کو باہر بھیج کر دُلہا کی ماں کو بلا لیا۔ اس سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ اس نے بھی لڑکی کے چال چلن کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ میں نے قبولو کے متعلق کچھ معلومات حاصل کیں۔ دُلہا کی ماں نے بتایا کہ وہ ڈولی کے ساتھ آئی تھی۔ دُلہن کے کمرے کی سجاوٹ وغیرہ میں اس نے بہت دلچسپی لی تھی۔ دُلہن کو کمرے میں داخل کیا گیا تو قبولو اُس کے پاس گئی تھی۔

میں نے جرح کر کر کے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اُسے ایک بار پھر دُلہن کے کمرے میں جاتے دیکھا گیا تھا۔ تاہم کسی کو اس پر شک نہ تھا۔ اُسے سب ہر کسی کی خدمت کرنے والی عورت سمجھتے تھے۔ میں اس کردار کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ دُلہن کے ساتھ اُس کا آنا کوئی خاص واقعہ نہیں تھا۔ اُسے اس گھر میں بھی اپنا حق اور انعام وصول کرنا تھا۔ دُلہا اور دُلہن کے گھر دُور نہیں تھے۔ میرے لیے قبولو کا یہاں آنا غیر معمولی واقعہ تھا۔ میں فوراً ہی اسے تفتیش میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اتنے میں ہیڈ کانسٹیبل آگیا۔ اُس نے بتایا کہ رات کی گاڑی سے ریلوے سٹیشن سے صرف چار ٹکٹ دیئے گئے۔ بکنگ کلرک نے بتایا کہ چاروں دیہاتی تھے۔ دن کی گاڑی کے لیے سات ٹکٹ دیئے گئے۔ ان میں بھی کوئی عورت نہیں تھی۔ لاریوں کے اڈے سے بھی کورا جواب ملا۔

گورکھا چوکیدار آگیا۔ اُس سے پوچھا کہ اس نے اس جگہ کے قریب جو ایک محلے دار نے بتائی تھی، رات نو اور دس بجے کے درمیان کوئی تانگہ دیکھا تھا؟ اُس نے بتایا کہ وہ پہرے کے لیے ابھی آ رہا تھا۔

اُسے ایک تانگہ جاتا نظر آیا تھا۔ وہ چونکہ چوکیدار تھا اس لیے اُس نے ذرا غور سے دیکھا تھا کہ تانگے میں کون ہے۔ وہ کسی کو پہچان نہ سکا۔ اتنا دیکھا کہ وہ تانگہ بان سمیت چار تھے۔

کوئی بات نہ بنی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو الگ کر کے کہا کہ تمام انفارمر (مُخبر) تھانے میں اکٹھے کرو۔ انہیں جو کام دینا تھا وہ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو سمجھا دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گورکھے کو بھی فارغ کر دیا اور دُلہن کی چھوٹی بہن کو کمرے میں بلایا۔ سولہ سترہ سال کی نوجوان اور پردہ دار لڑکی تھی۔ میں نے اسے بٹھا لیا۔ وہ بھی رو رہی تھی۔

دُلہن کی چھوٹی بہن، سہیلی کا بڑا بھائی

جھجک اور شرم لازمی تھی۔ اس کے علاوہ پولیس کا خوف بھی تھا۔ بڑی بہن کے اس حادثے کا غم بھی تھا۔ میں نے کچھ وقت صرف کر کے اس معصوم سی لڑکی کے دل سے پولیس کا خوف نکال دیا۔ جھجک بھی کم کر دی اور اُسے قائل کر لیا کہ میں اس کا ہمدرد ہوں۔ میں نے اُس پر واضح کر دیا کہ میں چونکہ مسلمان ہوں اس لیے مسلمان گھرانوں کی عزت کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اُسے یہ بھی کہا کہ تمہاری بہن کسی کے دھوکے میں آگئی ہے۔ میں کل شام سے پہلے پہلے اُسے اس جال سے نکالنا چاہتا ہوں۔ بہن بہن کی رازدار ہوتی ہے۔ اپنی بہن کے متعلق تم جو کچھ بھی جانتی ہو مجھے بتا دو، ورنہ میں اُسے تلاش نہیں کر سکوں گا۔

اس لڑکی نے بھی بہن کے کسی خُفیہ تعلق سے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن لڑکی عقل مند اور حقیقت پسند معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ کسی کے بارے میں قسم بھی تو نہیں کھائی جا سکتی۔ میں نے اسے کہا کہ میں جو کچھ پوچھوں مجھے اپنا بھائی اور باپ سمجھ کر بتا دے۔ اس نے بلا جھجک کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں چھپائے گی۔ میں نے سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

بے شمار سوالوں کے جواب میں اُس سے مَیں نے جو حاصل کیا وہ یہ تھا کہ اس کی بہن کی تین سہیلیاں ہیں۔ ایک سہیلی بہت گہری ہے۔ بہن اس کے گھر زیادہ جاتی تھی۔ سہیلیوں کے نام سے ایک اور کردار میرے ذہن میں آیا۔ تھا "سہیلی کا بھائی"۔ یہ کردار اب بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ ایسے کیسوں کی کوئی کمی نہیں کہ لڑکیوں کی سہیلیوں کے غیر شادی شدہ بھائیوں سے بے تکلفی پیدا ہو جاتی ہے۔ اچھی قسم کی سہیلیاں بھائیوں کو سہیلیوں سے بیاہ دیتی ہیں مگر جہاں سے شرم و حیا اُٹھ گیا ہو وہاں کوئی اور ہی گل کھلتے ہیں۔ لڑکیاں سہیلیوں سے ملنے کے بہانے اُن کے بھائیوں سے ملتی ہیں۔ اس دُلہن کی بہن سے مَیں نے پوچھا کہ ان تینوں میں سے کسی کا بھائی جوان اور غیر شادی شدہ ہے؟

اُس نے بتایا کہ جس کے ساتھ اس کا بہت پیار تھا اس کا ایک بھائی جوان اور غیر شادی شدہ ہے۔ میرے پوچھنے پر لڑکی نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ اپنی بہن کے ساتھ اس سہیلی کے گھر جایا کرتی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ سہیلی کا یہ بھائی اُن میں بیٹھ جاتا اور گپ شپ لگاتا تھا۔ لڑکی سے مَیں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس کی بہن سہیلی کے بھائی کے ساتھ بے تکلف تھی۔ بعد میں بہن نے چھوٹی بہن کو وہاں لے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اُسے چھوٹی بہن نے محسوس بھی کیا تھا۔ اس بھائی کے متعلق بہن نے بتایا کہ خوبرو نوجوان ہے۔ ہنس مکھ ہے اور کسرتی جسم والا ہے۔ طبیعت کا شوخ اور دلیر ہے۔

قبولو کے متعلق لڑکی نے بتایا کہ اس کی بہن کے پاس آتی جاتی تھی۔ بہن اسے پسند کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی کہ بڑی دلچسپ عورت ہے۔ مَیں نے لڑکی سے پوچھا کہ سہیلی کے اس بھائی اور اپنی بہن کے تعلقات کے متعلق اُس کی کیا رائے ہے۔

"آپ جو کچھ پوچھ رہے ہیں، وہ سچ سچ بتا رہی ہوں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "میرا اپنا

دل کچھ اور قسم کا ہے اس لیے مَیں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ آپ خود سیانے ہیں۔ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ قبولو کے متعلق یہ ضرور کہوں گی کہ وہ شریف عورت نہیں"۔

مَیں نے بہت کوشش کی کہ وہ وضاحت کرے کہ یہ عورت کیا کرتی ہے، لیکن لڑکی نے کوئی بات یا خاص واقعہ نہیں سنایا۔ البتہ اُس نے ایسا لہجہ اختیار کیا جس سے مَیں سمجھ گیا کہ قبولو نے اس لڑکی کو بھی کسی اُمیدوار کا پیغام دیا ہو گا جو لڑکی نے قبول نہیں کیا۔ اپنی بہن کے چال چلن کے متعلق اس نے شک کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بھی وثوق سے کہا کہ اس نے سہیلی کے بھائی سے کبھی چوری چھپے کی ملاقات نہیں کی۔ بہرحال اس لڑکی نے میرے لیے کچھ نہ کچھ زمین ہموار کر دی۔ مَیں نے اُسے بھی فارغ کر دیا۔

مَیں نے گھر کے مردوں کو بلا کر تسلی دی۔ کچھ ہدایات دیں اور تھانے چلا گیا۔ مُخبر آ گئے تھے اور جانے ہی والے تھے۔ مَیں نے انہیں گمشدہ دُلہن کی سہیلی کے بھائی کا نام بتا کر کہا کہ اس کے متعلق تمام تر معلومات حاصل کریں۔ انہیں رُخصت کر کے مَیں اِن دو کرداروں کے متعلق سوچنے لگا۔ ایک قبولو اور دوسرا سہیلی کا بھائی جس کا صحیح نام اگر مجھے یاد رہ گیا ہے تو آصف تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس فرار میں قبولو نے مدد دی ہے ورنہ جو آدمی تانگہ لائے تھے وہ کیسے جان گئے تھے کہ لڑکی فلاں وقت باہر آ جائے گی۔ مجھے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اُن پر براہِ راست حملہ کر دوں یا کچھ شہادت اور سراغ فراہم کر کے اُنہیں گھیروں۔ تفتیش کا یہ مرحلہ بڑا نازک اور خطرناک ہوتا ہے۔ بغیر شہادت کے مشتبہ پر حملہ کرو تو صاف بچ کر اپنے تحفّظ کا بندوبست کر لیتا ہے۔ مَیں نے فیصلہ کیا کہ پہلے تانگے والے کو تلاش کروں۔ ہو سکتا ہے وہ اُن دونوں آدمیوں کو پہچانتا ہو۔

میرا اسسٹنٹ سب انسپکٹر رُہتک کے کسی گاؤں کا رہنے والا رگھوناتھ تھا۔ وہ تھا تو ہندو لیکن مسلمان کی اولاد معلوم ہوتا تھا۔ دلیر بھی تھا دیانتدار بھی۔ اس میں مسلمانوں کے خلاف ذرہ بھر تعصب

نہیں تھا۔ اس شخص پر مَیں ہر قسم کی صورتِ حال میں اعتماد کیا کرتا تھا۔ مَیں نے اُسے دلہن کی گمشدگی کی واردات سُنائی اور کہا کہ کل صبح قصبے کے تمام تانگہ بانوں سے معلوم کرے کہ گزشتہ رات فلاں وقت کون سواری لے گیا تھا اور کہاں لے گیا تھا۔ مَیں نے اُسے سواریوں کے متعلق تمام تفصیلات بتائیں۔ لڑکی کے متعلق بھی بتایا کہ وہ کس لباس میں تھی۔

قصبے میں تانگوں کی تعداد دس بیس تھی۔ یہ ٹوٹے پھوٹے تانگے تھے جو قریبی دیہات تک جاتے تھے۔ قصبے کے اندر ان کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی کیونکہ فاصلے زیادہ نہیں تھے۔ تانگوں کی اتنی تھوڑی تعداد کی چیکنگ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اگر مشکل ہوتا بھی تو ہمیں یہ کام کرنا تھا۔ صرف تانگے والا ہی بتا سکتا تھا کہ اس نے سواریاں کہاں اُتاری تھیں۔ رگھوناتھ نے اُسی وقت کانسٹیبلوں کو بُلا کر اس ڈیوٹی کی تقسیم کر دی۔ مَیں نے کانسٹیبلوں کو خبردار کیا کہ کسی نے کسی تانگے والے سے ایک پیسہ بھی لیا تو جانتے ہو کہ میں کیا حشر کروں گا۔

ایک خُوبرُو جوان قتل ہوگیا

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بُھوک اور نیند نے پریشان کر رکھا تھا۔ مَیں گھر گیا۔ نہایا، کھانا کھایا اور سو گیا۔ صبح پانچ بجے ایک کانسٹیبل نے جگایا اور بتایا کہ قتل کی واردات آئی ہے۔ لاش شناخت کی جا چکی تھی اور ابھی موقعۂ واردات پر پڑی تھی۔ قصبے کے ساتھ ہی ایک میدان تھا جس میں درخت بھی تھے۔ وہاں بچے کھیلا کرتے تھے۔ چند ایک نوجوانوں نے وہاں اکھاڑہ کھودا ہُوا تھا۔

وہ اکھاڑوں کا زمانہ تھا۔ نوجوان ورزش کرتے، کُشتی لڑتے اور کبڈی کھیلتے تھے۔ لباس کی بجائے صحت اور جسم کی ساخت پر توجہ دی جاتی تھی۔ عزت فیشنی لباس والے کی کم اور تنومند جسم والے کی زیادہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس وقت کردار پُختہ تھے اور جرأت مندی بھی تھی۔ کسی کسی کو دلیری غلط

راستے پر لے جاتی تھی جیسے لڑکی کی گمشدگی کی واردات میں ہُوا لیکن جو کوئی سنتا تھا چونک اُٹھتا اور ہاتھ کانوں پر رکھ لیتا تھا۔ آج کل کوئی بھی نہیں چونکتا۔ کسی لڑکی کو کسی کے ساتھ بھاگ جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ انگریزی تہذیب اور فیشن نے سب کو کُھلی چُھٹی دے دی ہے۔ جو گھرانے اخلاقی طور طریقوں اور اسلامی طرزِ زندگی سے آزاد ہو گئے ہیں، اُن کے میاں بیوی آزاد ہیں۔ اُن کی دُلہنوں کو بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوست بلا روک ٹوک مِل جاتے ہیں۔

مَیں موقعۂ واردات پر گیا۔ تماشائی ذرا دُور کھڑے تھے۔ اکھاڑے کے کنارے پہ ایک لاش چت پڑی تھی۔ خوبرو جوان تھا۔ جسم کے پٹّھے نہایت اچھی طرح بنائے گئے تھے۔ اُس نے پہلوانوں والا لنگوٹ باندھ رکھا تھا۔ جسم پر تیل کی مالش کی ہوئی تھی۔ تیل کی شیشی الگ رکھی تھی اور اُس کے قریب اس کے کپڑے پڑے تھے۔ عمر بائیس تئیس سال تھی۔ لاش کی زبان دانتوں میں جکڑی ہُوئی تھی اور آنکھیں قدرتی حالت سے زیادہ کُھلی ہُوئی تھیں۔ مقتول کا باپ، ماں، بہن اور دو چھوٹے بھائی جس طرح چیخ چلّا رہے تھے، اس سے آسمان کا سینہ چاک ہو رہا تھا۔

مَیں نے پہلا کام یہ کیا کہ کھوجی کو لانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو دوڑایا۔ کھوجی ڈیڑھ ایک میل دُور گاؤں میں رہتا تھا۔ لاش کا نظری معائنہ کیا۔ جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ گلا گھونٹا گیا تھا۔ گردن پر نشان واضح تھے۔ گلے میں رسّی ڈالی گئی تھی۔ رسّی وہیں پڑی تھی۔ یہ چارپائی کی ادوائن کی گز بھر لمبی رسّی تھی۔ مَیں نے لاش کو اُٹھوا کر ذرا پرے کرایا۔ مجھے اُمید تھی کہ قاتل کی کوئی نہ کوئی نشانی مِل جائے گی۔ نشانی مِل گئی۔ یہ ایک تعویذ تھا۔ یہ نصف انچ مربع تعویذ چاندی کا تھا۔ اس کے ساتھ کالی ڈوری تھی۔ یہ مقتول کا بھی ہو سکتا تھا قاتل کا بھی۔ لوگ گلے میں تعویذ باندھا کرتے تھے جن کی ڈوری زیادہ لمبی نہیں ہوتی تھی۔

مَیں نے مقتول کے باپ سے پوچھا کہ یہ تعویذ مقتول کا ہے؟ اُس نے بتایا کہ مقتول کا نہیں۔

اس نے تعویذ کبھی نہیں باندھا تھا۔ پھر یہ قاتل کا تھا۔ ڈوری ٹوٹی ہوئی اور پُرانی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مقتول نے مرنے سے پہلے قاتل سے بچنے اور مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ قاتل نے اس کے گلے میں رسّی ڈالی تو مقتول نے اس کے تعویذ کی ڈوری پکڑ لی ہوگی۔ اس کا گلا گھونٹنے کے لیے ڈوری پہ زور دیا تو ڈوری ٹوٹ گئی۔

یہ تو قتل کا طریقہ تھا جو رسّی کی وجہ سے اور مقتول کی گردن پر رسّی کے نشانات سے واضح تھا۔ میرا اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ قاتل کون ہے۔ میں نے اکھاڑے میں دیکھا۔ گزشتہ شام اکھاڑے میں آنے والے کھدی ہوئی مٹی ہموار کر گئے تھے۔ اکھاڑے کے ایک کنارے کے ساتھ پاؤں کے بہت سے گہرے نشان تھے۔ اور مٹی کی حالت بتاتی تھی کہ یہاں قاتل اور مقتول کا مقابلہ ہوا ہے۔ ہموار مٹی پہ پاؤں کے صاف نشان تھے جن کا رُخ بتاتا تھا کہ واردات کے بعد قاتل ادھر سے واپس گیا ہے۔ آنے کے نشان نہیں تھے۔ کھدی ہوئی ہموار اور نرم مٹی پر جس میں تیل اور پسینے کی آمیزش بھی تھی، یہ نشان جنہیں کھُرے کہا جاتا ہے بڑے ہی واضح اور بہت ہی کارآمد تھے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ان کا مولڈ تیار کرنے کا فوراً انتظام کرے۔

تماشائیوں کو میں نے کہا کہ اس اکھاڑے میں جو آدمی آتے تھے وہ آگے آجائیں اور مقتول کے متعلق جو کوئی جو کچھ بھی جانتا ہے وہ بھی آگے آجائے۔ میں نے سب کو یقین دلایا کہ انہیں پریشان نہیں کیا جائے گا۔ میرا انداز درخواست والا تھا۔ اس میں تھانیداروں والا رُعب نہیں تھا۔ اس کا اچھا اثر ہوا۔ کچھ آدمی آگے آگئے۔ باقی سب کو میں نے دُور چلے جانے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ کسی کے ذہن میں کوئی ذراسی اور غیر اہم سی بھی بات آجائے تو فوراً میرے پاس آجائے۔

رگھوناتھ بھی آگیا تھا۔ اُسے میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کو کہا قصبے

میں سول ہسپتال تھا جس کا سول سرجن پوسٹ مارٹم کیا کرتا تھا۔ البتہ دیگر پیچیدہ معائنوں وغیرہ کے لیے ہمیں دُور جانا پڑتا تھا۔ میں نے وہیں چارپائی منگوالی اور بیٹھ گیا۔ اکھاڑے میں جو افراد آتے تھے وہ سب موجود تھے۔ ان کی تعداد نو تھی۔ پانچ ہندو اور چار مسلمان۔ یہ سب نوجوان تھے۔ مقتول کے ہم عمر۔ ان کا کوئی اُستاد نہیں تھا۔ سُورج نکلنے سے بہت پہلے اکھاڑے میں آتے تھے۔ مقتول اُن سے پہلے سحر کی تاریکی میں آجایا کرتا تھا۔ یہ اُس کا روزمرّہ کا معمول تھا۔ یہ لڑکے ورزش کرتے اور کُشتی بھی لڑتے تھے۔ شام کو بھی اکھاڑے میں آتے تھے۔

میں نے اِن سب کو الگ بٹھا دیا تھا۔ ان کے علاوہ سات آدمی اور بھی تھے میں اکیلے اکیلے کو اپنے پاس بُلاتا اور اُسے یہ یقین دلاتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی بتانا چاہے بتا دے کسی کو یہ پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا کہ اُس نے کیا بتایا ہے۔ میں نے تمام لڑکوں کو باری باری بلایا۔ پھر بڑی عمر کے جو سات آدمی تھے اُنہیں بھی باری باری بُلایا۔ ان میں دو ہندو اور پانچ مسلمان تھے۔ یہ سب باعزّت حیثیت کے لوگ تھے۔ میں نے ان سب پر جرح بھی کی۔

ان سے جو معلومات حاصل ہُوئیں وہ یہ تھیں کہ مقتول کو جوانی کے جوش پر قابو نہیں تھا۔ چال چلن کا بُرا نہیں تھا۔ لوفر اور لفنگا بھی نہیں تھا۔ غنڈہ گردی بھی نہیں کرتا تھا۔ اُس میں نقص یہ تھا کہ اپنے آپ کو بہت دلیر اور بہادر سمجھتا تھا۔ اپنے جسم اور طاقت پر اُسے ناز تھا۔ جس کسی کو دیکھے کہ اُس کا جسم موٹا تازہ ہے اور وہ ذرا اینٹھ کر چلتا ہے تو اُسے کُشتی کے لیے چیلنج کرتا تھا۔ میرے لیے اس کردار کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ ایسے کردار اب بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ جو نہی جوان ہوتے ہیں اپنے آپ کو رُستم سمجھنے لگتے ہیں۔ سینہ چوڑا کر کے اور بازو پھیلا کر پہلوانوں کی طرح چلتے ہیں۔ یہ جوانی کا جوش ہوتا ہے۔ ان میں کچھ نوجوان لوفربازی شروع کر دیتے ہیں اور بعض صرف اینٹھتے ہیں سو غنڈہ گردی سے جو بچتے ہیں اس میں شرافت کا

دخل نہیں ہوتا۔ اُن میں دراصل اتنی جراَت نہیں ہوتی کہ ایسی ویسی حرکت کریں۔ وہ اپنے آپ کو دلیر ضرور سمجھتے ہیں۔ میں نے چونکہ نفسیات کا بھی تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے اور عملی زندگی میں بھی مختلف النوع کردار دیکھے ہیں اس لیے میں ان کے اندر کے احوال و کوائف سے واقف تھا۔

مقتول کے متعلق میں نے اس کے دوستوں اور ساتھیوں کی یہ باتیں سُنیں تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا تھا اور کیسا تھا۔ اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ وہ کسی کی عزّت پہ ہاتھ ڈال بیٹھا ہوگا اور قتل ہو گیا۔

ایسے قسم کے نوجوان ہیر رانجھے کا ڈرامہ بھی کھیلا کرتے ہیں۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہر ایک لڑکی اُن پر مرتی ہے۔ میں نے اس کے دوستوں سے الگ الگ پوچھا کہ مقتول نے کبھی کسی لڑکی یا لڑکیوں کی بات کی تھی؟ اس قسم کے کردار اپنے عشق و محبت کے من گھڑت قصے بھی سناتے رہتے ہیں۔

میں یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ مقتول نے کبھی کسی لڑکی کی بات نہیں کی تھی۔ دو دوستوں نے وثوق سے کہا کہ کسی لڑکی کے ساتھ اس کا چکر چل ضرور رہا تھا۔ میں نے بہت کریدا۔ یہ بھی پوچھا کہ وہ کون سے گلی محلے میں زیادہ جاتا تھا۔ مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ مقتول کا باپ بھی سر اُونچا رکھنے والا شخص تھا۔ بیٹے کو غالباً اُسی نے خراب کیا تھا۔

ان لڑکوں کے بعد میں نے بڑی عمر کے آدمیوں کو باری باری بلایا۔ سب نے لڑکوں کے بیان کی تصدیق کی۔ وہ چونکہ سنجیدہ عمر کے آدمی تھے اس لیے انہوں نے سنجیدگی سے باتیں کیں۔ ہندوؤں نے شکایت کی کہ ان کی لڑکیوں کو اس قسم کے مسلمان لڑکوں سے خطرہ رہتا ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ اس قسم کے لڑکے ہندوؤں کی نظروں میں ساری قوم کو بدنام کر رہے ہیں۔ انہوں نے

یہ بھی بتایا کہ ہندو لڑکیاں مسلمان لڑکوں کو پسند کرتی ہیں لیکن یہ اچھی بات نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ مقتول کے باپ سے کہہ چکے تھے کہ اُس کا بیٹا اوچھی حرکتیں کرتا پھرتا ہے لیکن باپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ تمام آدمی مجھے مقتول کے متعلق تو بہت کچھ بتا گئے لیکن مجھے ذرا سا بھی اشارہ نہ ملا کہ اس کی دشمنی کس کے ساتھ تھی اور اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے۔

میں نے ہندو افراد کو ایک بار پھر بلایا اور اُن سے فرداً فرداً پوچھا کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ اُن کی لڑکیوں کو مسلمان لڑکوں سے خطرہ رہتا ہے، اس قسم کا وہ کوئی واقعہ سنا سکتے ہیں؟ اور کیا مقتول کا کسی ہندو لڑکی کے ساتھ دوستانہ تھا؟

یہ لوگ مجھے کوئی واقعہ نہ سُنا سکے۔ یہ صرف شکایت تھی۔ مجھے شک ہُوا کہ مقتول ہندوؤں کا شکار ہُوا ہے لیکن میں اتنی جلدی تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ ہندو قتل کی واردات کر سکتا ہے۔ ہندو ہجوم کی صورت میں کم تعداد اور نہتے مسلمانوں کا کُشت و خون کر سکتے ہیں۔ انفرادی طور پہ ہندو کسی مسلمان کو للکارنے کی جراَت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھا کہ قاتل کوئی ہندو ہو سکتا ہے، اور قاتل کرائے کا بھی ہو سکتا ہے جسے ہندوؤں نے منہ مانگا پیسہ دیا ہوگا ـــــ تعویذ صاف بتاتا تھا کہ قاتل مسلمان ہے۔ اس تفتیش سے مجھے یہی حاصل ہُوا کہ مقتول کیسا تھا۔ اس سے قتل کے باعث کی بھی نشاندہی ہوتی تھی۔

مسئلہ البتہ خاصا ٹیڑھا تھا۔

گمشدہ دُلہن اور مقتول

اس دوران کھوجی آ گیا تھا اور اکھاڑے سے دُور دُور تک کھُرے دیکھ آیا تھا۔ میدان میں گھاس تھی جو خشک بھی ہونے لگی تھی۔ اکھاڑے والا کھُرا کہیں نظر آیا، کہیں غائب ہو گیا۔

کھوجی نے بتایا کہ اکھاڑے میں کھرا قاتل کی واپسی کا ہے۔ دُور کے کھرے بتاتے تھے کہ وہ آیا دوسری طرف سے تھا۔ آبادی کے قریب جا کر کھرے غائب ہو گئے۔ آگے سڑک بھی تھی اور لوگوں کے پاؤں تلے کوئی کھرا محفوظ نہیں رہا تھا۔ مَیں نے کھُرے کا مولڈ بنوانے کے لیے تو کہہ دیا تھا لیکن تجربہ کار کھوجی کا ذہن بہترین مولڈ ہُوا کرتا تھا۔ یہ لوگ برسوں تک کھُرے ذہن میں محفوظ رکھتے اور اس طرح پہچان لیتے تھے جیسے انہوں نے ابھی ابھی دیکھے ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ اُن کی گواہی عدالت میں تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ تفتیش میں ان کی مدد معمے حل کر دیا کرتی تھی۔ اس کھرے کے متعلق اُس نے بتایا کہ دیسی جوتا ہے اور نئی ہے۔ تلوے کی سلائی میں اس نے کوئی ایسی خصوصیت نوٹ کی تھی جو مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔

مَیں نے وہیں مقتول کے باپ کو بلایا۔ اس سے پوچھا کہ کسی کے ساتھ دشمنی عداوت تھی؟ اُس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اپنے بیٹے کے چال چلن کی اُس نے بہت تعریف کی۔ مَیں نے جرح کی تو بھی اُس کے مُنہ سے کام کی کوئی بات نہ نکلی۔ وہ ہر بات میں ظاہر کرتا تھا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے اور اُس کے بیٹے سے سارا شہر ڈرتا تھا۔

مجھے غصہ آ گیا۔ مَیں نے کہا ــــ "اپنا جوان بیٹا مروا کر بھی آپ کا بَل پہلے کی طرح موجود ہے۔ آپ کے بیٹے سے سارا شہر ڈرتا ہو گا لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں کہ اُسے سارا شہر جانتا بھی تھا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قاتل مل جائے تو مجھے بتائیں کہ کبھی کسی آدمی نے آپ سے یہ شکایت کی تھی کہ آپ کے بیٹے نے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟" مَیں نے طنزیہ کہا ــــ "تھوڑی دیر کے لیے سر نیچا کر لیں اور مجھے صحیح جواب دیں۔"

اُس نے دو مسلمانوں کا نام لے کر جن میں ایک حاجی تھا، کہا ــــ "انہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ تمہارا بیٹا اوچھی حرکتیں کرتا ہے۔ انہوں نے کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی۔

کہتے تھے کہ یہ لڑکا کسی روز تمہاری عزت خراب کرے گا۔"

"ان دونوں کی جوان بہو بیٹیاں ہیں؟" ــــ مَیں نے پوچھا ــــ "اور اُن کے جوان بیٹے ہیں؟"

اُس نے جواب دیا کہ ایک کی ایک بیٹی جوان ہے اور دوسرے کی بہو جوان ہے۔ دونوں کے بیٹے ہیں۔ مَیں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مقتول نے ان لڑکیوں میں سے کسی کو چھیڑا ہو گا اور اس کے نتیجے میں قتل ہو گیا۔ باپ نے ایسے کسی الزام کو تسلیم نہ کیا۔

مَیں اندھیرے میں ہاتھ مار رہا تھا۔ مقتول کی ماں کو بلایا۔ وہ بیان دینے کی حالت میں نہیں تھی۔ جس ماں کا جوان بیٹا قتل ہو جائے اُسے تو ہر جیتا جاگتا انسان قاتل نظر آتا ہے۔ ماں پاگل ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت اس ماں کی تھی۔ اُس سے بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ مقتول کے بھائی چھوٹے تھے۔ ایک بہن جوان تھی جس کی عمر بیس سال سے زیادہ تھی۔ جذباتی طور پر وہ بھی بات کرنے کے قابل نہیں تھی لیکن مَیں نے اُس کے جذبات کا ساتھ دے کر اُس کی زبان رواں کر دی۔ مَیں نے اُسے کہا تھا کہ تمہارے اتنے خوبصورت بھائی کے قاتل کو تمہارے سامنے پھانسی دُوں گا۔ اُس سے مَیں وہی راز معلوم کرنا چاہتا تھا جو میرے ذہن میں اٹک گیا تھا۔ یہ تو مَیں نے معلوم کر لیا تھا کہ اس خاندان کی کسی کے ساتھ ایسی عداوت نہیں تھی کہ قتل تک نوبت پہنچ جاتی۔ قتل کا باعث ایک ہی رہ گیا تھا ــــ کسی لڑکی کو اس نے چھیڑا ہو گا یا کسی لڑکی کے ساتھ مراسم ہوں گے۔

مقتول کی بہن سے مَیں نے پوچھا کہ مقتول شادی شدہ تھا یا رشتے کی بات ہو رہی تھی؟ اُس نے بتایا کہ خالہ کی لڑکی کے ساتھ منگنی ہو چکی تھی۔ ابھی دن مقرر کرنا باقی تھا لیکن مقتول نہیں مانتا تھا۔ اس انکشاف نے میرا ذہن کھول دیا۔ مَیں نے انکار کی وجہ پوچھی تو

اُس نے بتایا کہ وہ ایسے گھر کا رشتہ چاہتا تھا جہاں سے نہیں مل سکتا تھا۔

"کیوں؟"

"وہ برادری کے باہر کا خاندان ہے" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ رشتہ دیا بھی نہ جاتا۔ پرسوں اس لڑکی کی شادی بھی ہو گئی ہے۔"

"کیا اس لڑکی کو اس نے دیکھا تھا؟" ـــــ مَیں نے پوچھا ـــــ "اُس کے ساتھ میل جول تھا؟"

"وہ میری سہیلی تھی" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "میرے گھر آتی رہتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ لڑکی تو اسے بہت ہی چاہتی تھی" ـــــ یہاں لڑکی روتے روتے ہچکیاں لینے لگی۔ بہت دیر روتی رہی۔ مَیں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ اس نے اپنے دل کی تسکین کے لیے کہا ـــــ "میرا بھائی شیر تھا۔ پتہ نہیں کتنی لڑکیاں اسے دیکھ کر آہیں بھرتی تھیں اور پتہ نہیں اسے کس کی نظر بد کھا گئی ہے۔ جس راستے سے گزرتا تھا، کیا مرد کیا عورتیں راستہ چھوڑ دیتی تھیں اور یہ لڑکی تو اس کے اشاروں پر ناچتی تھی" ـــــ یہاں وہ چُپ ہو گئی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگی ـــــ "لیکن اچھا ہُوا کہ اس کے ساتھ میرے بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔"

"کیوں؟"

"مَیں اُسے شریف گھر کی لڑکی سمجھی تھی" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میرا اور اس کا اتنا پیار تھا کہ آپ حساب نہیں کر سکتے مگر وہ تو کچھ اور ہی نکلی۔ آپ کو تو معلوم ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے جو شادی کی پہلی رات ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ پرسوں رات۔"

"اُس کا نام؟"

"جمیلہ" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "آپ کو رپورٹ مل چکی ہے نا! ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ وہ پلنگ کی چادر باندھ کر اور اُوپر کمبل لپیٹ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

مجھے یُوں دھکا لگا جیسے کسی نے بے خبری میں میرے منہ پر گھونسہ دے مارا ہو۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مقتول کا تعلق گمشدہ دُلہن کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لڑکی نے مجھے یاد دلایا کہ مفرور دُلہن اپنی ایک سہیلی کے بھائی کے ساتھ بے تکلف تھی۔ مَیں نے اس ناگہانی دھکے سے سنبھل کر لڑکی پر نئے زاویے سے سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ ساری جرح اور جواب لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یوں ہے کہ بہن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے بھائی اور سہیلی (دلہن) کی باہر بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا نہیں۔ اُسے یہ یقین تھا کہ وہ ایک دوسرے کو والہانہ انداز سے چاہتے تھے۔ اس کے سامنے جمیلہ (مفرور دلہن) نے اپنے ہونے والے خاوند کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نام نہیں لیا بلکہ اسے کالی چھپکلی کہا تھا اور وہ اسے کالی چھپکلی ہی کہا کرتی اور ایسی نفرت کا اظہار کیا کرتی تھی جو اس کی برداشت سے باہر تھی۔ لیکن اپنے والدین سے یہ رشتہ منسوخ نہیں کرا سکتی تھی۔ مقتول کی بہن نے میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے یہ انکشاف بھی کیا کہ مقتول بھی کالی چھپکلی کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ اُس نے دو تین بار یہ بھی کہا تھا کہ اس نے اس لڑکے (دُلہا) کو راستے میں روک کر کہا تھا کہ تم اتنی خوبصورت لڑکی کے قابل نہیں ہو۔ شادی سے انکار کر دو ورنہ پچھتاؤ گے۔ کالی چھپکلی نے کچھ مرا مرا سا جواب دیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو مقتول کے دانت توڑ دیتا لیکن دُلہا میاں کالی چھپکلی ہی ثابت ہُوا۔

"لیکن" ـــــ مقتول کی بہن نے کہا ـــــ "خدا کا شکر ہے کہ میرا بھائی اس لڑکی سے بچ گیا۔ سارے خاندان کی رسوائی ہوتی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ جمیلہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے؟"

"تو کیا اسے بھوت کوئی اُٹھا کر لے گیا ہے؟" — اُس نے جواب دیا — "اس نے جس طرح میرے بھائی پر ڈورے ڈالے تھے اسی طرح کسی اور کو بھی پھانس رکھا ہوگا۔"

"تم اس کی سہیلی تھیں" — میں نے پوچھا — "کیا جمیلہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں تھی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی" — اُس نے جواب دیا — "اس کا بھاگ جانا ثابت کرتا ہے کہ وہ کیا تھی۔ میں تو اسے شریف سمجھتی تھی۔"

میرے دل میں اس شک کا پیدا ہونا قدرتی تھا کہ جمیلہ کو مقتول نے ہی بھگایا ہوگا اور وہ اسی کی پاداش میں قتل ہوا۔ اس امکان پر بھی غور کرنا تھا۔ مقتول کی بہن سے میں براہِ راست نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ بھگا لے جانے والا اس کا بھائی ہی تو نہیں تھا۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جمیلہ کا موضوع ٹھپ کر کے میں مقتول کے قتل پر آگیا۔ اس کے متعلق دو چار باتیں کر کے میں نے لڑکی سے پوچھا — "گزشتہ رات تمہارا بھائی گھر تھا، وہ دیر سے تو نہیں آیا تھا؟"

"وہ اکثر ذرا دیر سے ہی گھر آیا کرتا تھا" — بہن نے جواب دیا — "رات کو وہ کچھ جلدی آگیا تھا۔"

"غصے میں تھا؟" — میں نے پوچھا — "خوش تھا؟ گھبرایا ہوا تھا؟"

"میں نے غور نہیں کیا" — اُس نے جواب دیا۔

"اس سے ایک رات پہلے بھی دیر سے آیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔ یہ دلہن کے فرار کی رات تھی۔

"ہاں" — اُس نے جواب دیا — "وہ جب آیا تو میں سو گئی تھی۔ صبح جاگی تو وہ ورزش کر کے آگیا تھا۔"

"وہ ہر روز کی طرح خوش باش تھا یا تم نے اس میں کوئی تبدیلی دیکھی تھی؟"

"اس میں تبدیلی تو آہی گئی تھی" — بہن نے جواب دیا — "جمیلہ کی شادی نے اُسے مغموم کر دیا تھا۔"

"تمہارے گھر میں یہ خبر کب اور کس طرح پہنچی تھی کہ جمیلہ کمرۂ عروسی سے غائب ہو گئی ہے؟"

"دوسری صبح جمیلہ کی بہن گھبرائی ہوئی آئی تھی" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے جمیلہ کے متعلق پوچھا اور پھر رازداری سے بتایا تھا کہ جمیلہ رات سے لاپتہ ہے۔"

"تمہارا بھائی کہاں تھا؟"

"گھر نہیں تھا" — اُس نے جواب دیا — "میری ماں جمیلہ کے سسرال چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد بھائی آگیا۔ میں نے اُسے یہ خبر سُنائی تو اس نے ذرا اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا تھا کہ ہاں پتہ چل گیا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اسی کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے کہا تھا — کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے — میرا بھی یہی خیال تھا۔"

پُراسرار تانگہ مل گیا

معمہ میرے لیے معمہ ہی رہا۔ میرا خیال تھا کہ جمیلہ مقتول کے ساتھ گئی ہوگی مگر بہن بتا رہی تھی کہ مقتول رات گھر سویا تھا۔ اگلی رات بھی گھر تھا۔ اگر جمیلہ اس کے ساتھ گئی ہوتی تو مقتول بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ اگر یہ جُرم مقتول کا ہی تھا تو لڑکی کو قصبے میں ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس نے جمیلہ کو کہیں چھپا رکھا ہوگا اور موزوں وقت پر قصبے سے باہر لے جانے کا پلان بنایا ہوگا۔ اس شک کے پیشِ نظر کہ جمیلہ کو مقتول لے گیا تھا، میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جمیلہ

نے دُلہا کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مقتول کی کارستانی ہے۔ اس نے برادری کے دلیر قسم کے آدمیوں کو بتایا ہوگا۔ ان آدمیوں نے مقتول کو قتل کر دیا ہوگا۔ دُلہا میں قتل جیسے جُرم کی جرأت نہیں تھی۔ وہ خودکشی کر سکتا تھا۔ اس کی بھی اس میں جرأت نہیں تھی۔ اس کا باپ اور جمیلہ کا باپ قتل کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ دُلہا اور دُلہن کے بھائی چھوٹے تھے۔ چچے، تائے، ماموں اور اُن کے بیٹے قابلِ غور تھے۔ اگر قاتل ان میں سے کوئی تھا تو اُس نے دُلہن اور دُلہا کے والدین سے اپنے ارادے کا ذکر نہیں کیا۔ اسی لیے وہ تھانے آ گئے۔ اگر وہ بھی قتل کی سکیم میں شریک ہوتے تو پولیس کو لڑکی کے فرار سے بے خبر رکھتے۔

میرا خیال میں اندھیری بھول بھلیوں میں اُلجھ گیا تھا۔ میں ذہن میں جُرم کے ارتکاب کا جو بھی نقشہ بناتا تھا اس کی لکیریں کسی نہ کسی مقام پر رُک جاتیں اور آگے گُھپ اندھیرا آ جاتا تھا۔ میں نے حالات آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ یہ ایسے حالات تھے کہ فوراً ایک شک پیدا ہوتا تھا مگر آگے جا کر ایک ایسا سوال سامنے آ جاتا جس کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔

میری کوشش تھی کہ شام تک تفتیش مکمل کر لوں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ تجربے اور فہم و فراست کی بنا پر یہ امکان میرے ذہن پر نقش ہو گیا کہ دُلہن کے فرار اور اس قتل کی واردات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تفتیش کرنے والے افسر کے لیے یہی مرحلہ مشکل ہوتا ہے۔ اگر وہ قرائن اور حالات میں بہتا چلا جائے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اپنی عقل کا استعمال اور خود اعتمادی بہت ضروری ہے۔ اگر یہ کوشش کی جائے کہ کوئی وعدہ معاف گواہ بن جائے یا یہ مشتبہ کو تشدد کی چکی میں ڈال کر کسی نہ کسی سے جھوٹا سچا اقبالِ جرم کرا لیا جائے تو عدالت میں جا کر کیس چوپٹ ہوتا اور بے عزتی ہوتی ہے۔ آج کل تو پولیس اس بے عزتی کی عادی ہو چکی ہے۔ عدالتیں بھی پروا نہیں کرتیں۔ انگریز کے زمانے میں مجسٹریٹ اور سیشن جج

شک پر ملزم کو تو بری کر دیتے تھے لیکن تفتیش کرنے والے افسر کو نہیں بخشتے تھے۔ فیصلے میں لکھ دیتے تھے کہ پولیس نے تفتیش میں اور مقدمے کی تیاری میں مجرمانہ غفلت برتی ہے۔ اس فیصلے پر متعلقہ تھانیدار کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوتی تھی۔

میں اس بے عزّتی سے بچنا چاہتا تھا۔ یہ بے عزّتی صرف میری نہیں پولیس کے پورے محکمے کی توہین تھی۔۔۔۔ میں نے وعدہ معاف گواہ کی تو سوچی ہی نہیں۔ مجھے اپنے اُوپر بھروسہ تھا کہ مجرم پیشہ ور نہ ہوئے تو میں اقبالِ جرم کرا لوں گا۔

میں نے اکھاڑے میں جانے والے نو لڑکوں کو شاملِ تفتیش کر لیا۔ اُن کے نام پتے لکھ لیے۔ اُن کے دلوں سے پولیس کا ڈر دُور کیا اور کہا کہ ان کے دوست کے قاتل کو پکڑنے کے لیے مجھے اُن کی مدد کی شدید ضرورت ہے۔ اُس وقت دن کے دو اڑھائی بج رہے تھے۔ میں ان لوگوں کو ساتھ لیے صبح سے وہاں بیٹھا تھا۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ وہ گھروں کو چلے جائیں اور کھانا کھا کر تھانے آ جائیں۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کی۔ مقتول کے باپ کو لاش کی وصولی کے لیے تھانے چلنے کو کہا اور میں تھانے چلا گیا۔ لاش تقریباً میرے ساتھ ہی تھانے میں آئی۔ پوسٹمارٹم ہو گیا تھا اور رگھوناتھ نے ایک کمال یہ کیا تھا کہ تانگے والے کو اُس نے پکڑ لیا اور اُسے تھانے لے آیا تھا۔ پوسٹمارٹم رپورٹ قابلِ فہم تھی۔ مقتول کے گلے میں رسّی ڈال کر اُسے مارا گیا تھا۔ جسم پر اور کوئی چوٹ نہیں تھی۔ موت کا جو وقت لکھا گیا تھا وہ صبح کی تاریکی کا وقت تھا۔

تانگے والا جلدی ہی مل گیا تھا۔ کانسٹیبلوں کو زیادہ وقت صرف نہیں کرنا پڑا۔ انہوں نے صرف چار تانگے چیک کیے۔ پانچویں تانگہ بان نے بتا دیا کہ اس محلے میں وہ گیا

تھا۔ اسے تھانے لے آئے۔

میں پہنچا تو اسے اندر لے گیا۔ میں نے اس پر کوئی سوال نہ کیا۔ اُسی کو بولنے کا موقع دیا۔ میں اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ بعض تانگہ بان بھی جُرم میں شریک ہوتے اور اُجرت لیتے تھے۔ یہ آدمی ایسا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ دو جوان سے آدمیوں نے اُسے کہا کہ محلّے سے ایک بیمار کو لینا اور ریلوے سٹیشن جانا ہے۔ پیسے طے کر کے وہ اُن کے ساتھ گیا اور ملانوں کے محلے میں اسے سواریوں نے روکا اور نیچے اُتر کر کہا کہ تیسری سواری ابھی آتی ہے۔ تانگہ بان نے انہیں کہا کہ جا کر بیمار کو لے آئیں۔ اُسے کیسے پتہ چلے گا کہ تانگہ آ گیا ہے۔ ایک نے کہا کہ بیمار آ رہا ہے۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ تانگہ بان نے پریشانی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اور زیادہ نہیں رُکے گا۔ دونوں نے اسے کہا کہ وہ انتظار کی جتنی اُجرت مانگے گا دیں گے۔ ایک گلی میں سے ایک عورت نکلی۔ بتی نہیں تھی۔ چاندنی تھی۔ یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ عورت ہے۔ پہچاننا مشکل تھا۔ ایک جوان نے آہستہ سے کہا — "وہی معلوم ہوتی ہے۔"

ایک نے ذرا اُونچی آواز سے کہا — "لے آؤ" — وہ عورت واپس گلی میں چلی گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد گلی میں سے کوئی اور نکلا۔ قریب آیا تو اُس کے سر پر کمبل تھا جو گھٹنوں تک گیا ہُوا تھا۔ اُس کا چہرہ کمبل میں چھُپا ہُوا تھا۔ تانگہ بان بھی نیچے کھڑا تھا۔ اُسے تانگے میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ ایک آدمی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوسرا بیمار کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ بیمار مرد تھا یا عورت؟ اُس نے جواب دیا کہ یہی سوال وہ اپنے آپ سے پوچھتا رہا ہے۔ پہلے وہ اُسے مرد سمجھتا تھا لیکن تانگے میں سوار ہوتے وقت چُوڑیوں کی چھنک بڑی صاف سنائی دی تھی۔ اُس نے تانگے سے اُترنے تک کوئی بات نہیں

کی۔ دوسرے دونوں بھی خاموش رہے۔ تانگہ بان نے اُسے عورت سمجھا۔ آگے جا کر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ عورت ہے۔ تانگہ بان کو ریلوے سٹیشن چلنے کو کہا گیا۔ ریلوے سٹیشن پر تانگہ پہنچا تو گاڑی جو پہلے ہی آئی ہُوئی تھی چل پڑی۔ اگلی سیٹ والا تانگے سے اُترا اور مایوس ہو کر بولا — "اب کیا کریں؟"

پچھلی سیٹ والے نے کہا کہ لاریوں کے اڈے پر چلو۔ تانگے والے نے کہا کہ اس وقت تو کوئی لاری نہیں ملے گی۔ ایک نے کہا کہ مِل جائے گی۔ رات کو ایک لاری جاتی ہے۔ تانگہ بان کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے تھے۔

وہ تانگہ لاریوں کے اڈے پر لے گیا۔ وہاں اِدھر اُدھر چار پانچ لاریاں کھڑی تھیں۔ جانے کے لیے تیار کوئی بھی نہیں تھی۔ تانگہ اڈے والوں کے کمرے کے سامنے رُکا تھا۔ وہاں روشنی بھی تھی۔ ایک آدمی باہر کھڑا تھا۔ وہ کمالا دس نمبریا تھا۔ اُس سے ایک سواری نے پوچھا کہ کوئی لاری جا رہی ہے؟ کمالے نے پچھلی سیٹ کی طرف غور سے دیکھا اور کمرے میں چلا گیا۔ اندر سے ایک اور آدمی نِکلا۔ اُس نے تانگے کے پیچھے آ کر بات کی۔ اس نے کہا کہ ایک لاری تھوڑی دیر تک جا رہی ہے۔ تانگہ چھوڑ دو۔ اندر آ جاؤ۔ سواریاں سٹیشن پر انتظار کر رہی ہیں۔ تانگے کی اگلی سیٹ پر جو بیٹھا تھا اُس نے دوسری سواری سے پیسے لے کر تانگہ بان کو دیئے اور رخصت کر دیا۔ وہ تانگہ لے آیا۔

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ جو دو آدمی اُسے محلے میں لے گئے تھے اُن میں سے وہ اُسے پہچان سکتا ہے جو اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے اُسے مدھم روشنی میں دیکھا تھا۔ اب شاید پہچاننے میں مشکل پیش آئے۔ بہرحال اس نے کہا کہ اُسے سامنے لاؤ تو بتا سکوں گا۔ تانگہ بان کو پتہ چل چکا تھا کہ ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے اپنے

مطلب کی بہت سی باتیں پوچھیں اور اسے تھانے میں موجود رہنے کو کہا۔ پھر بھی کچھ تانگہ بان نے میری مشکل آسان کر دی۔

دوست اور دُلہن

تانگہ بان مجھے مجرموں کے قریب لے گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں نے دُودھ کی نہر نکال لی ہے۔ میں آپ کو لاریوں کے اڈے کے متعلق کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کل لاریوں کے اڈے اُس دور کے اڈوں سے مختلف ہوگئے ہیں۔ سواریوں اور بسوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ راستہ نہیں ملتا۔ یہاں صرف جیب کترے اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ میرے وقتوں میں لاریوں کے اڈے رات کے وقت بدمعاشی کے اڈے بن جایا کرتے تھے۔ تھوڑی سی لاریاں ہوتی تھیں جو رات کو نہیں چلتی تھیں۔ اڈے کے کمرے یا کمرہ چرسیوں اور جواریوں کا اڈہ بن جاتا تھا۔ قصبوں میں ایسے دو اڈے ہوتے تھے۔ ایک لاریوں کا اڈہ اور دوسرا تکیہ۔ یہ قبرستان میں ایک کوٹھڑی ہوتی تھی جس میں قبرستان کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملنگ سا رہتا تھا۔ اس کے پاس تین چار اسی کی قسم کے ملنگ مستقل یا عارضی طور پر رہتے تھے۔ یہ لوگ چرس اور بھنگ پیتے اور اُن جواریوں کا پہرہ دیا کرتے جو اُن کی کوٹھڑی میں جوا کھیلا کرتے تھے۔ لاریوں کا اڈہ تو دس نمبریے بدمعاشوں اور غنڈوں کا اڈہ ہوتا تھا۔ یہ گروہ پولیس کے لیے دردِ سر بھی ہوتا تھا اور یہ لوگ پولیس کے کام بھی آتے تھے۔

میں اس اڈے سے واقف تھا۔ کمالے بدمعاش کو بھی جانتا تھا۔ میرے ہی قصبے کا رہنے والا تھا۔ ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ اڈے کے دونوں ٹھیکیداروں کو بُلا لائے۔ اڈہ دُور نہیں تھا۔ اتنے میں اکھاڑے والے لڑکے آ گئے۔ میں نے انہیں باری باری بُلا کر پوچھا کہ مقتول کا

سب سے زیادہ گہرا دوست کون تھا۔ میں اس لائن پر کام کر رہا تھا کہ لڑکی کو بھگا لے جانے والا مقتول تھا۔ یہ پُختہ شک تھا، یقین نہیں تھا۔ پہلے چار لڑکوں نے ایک ہی لڑکے کا نام لیا۔ میں نے دوسروں سے نہیں پوچھا۔ میں نے اس لڑکے کو دیکھ لیا۔ اُس کا نام ارشاد یا دلشاد بتایا گیا تھا۔ ذہن سے نکل گیا ہے۔ آپ اسے ارشاد کہہ لیں۔ وہ مقتول کی عمر اور اُسی کے جسم کا نوجوان تھا۔

میں نے ان سب کو برآمدے میں بُلایا اور لائن میں کھڑا کر کے تانگہ بان سے کہا کہ وہ دیکھے کہ اِن میں وہ لڑکا ہے جو اُس کے تانگے میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا؟ مجھے خدشہ تھا کہ وہ نہیں پہچان سکے گا۔ مجھے یہ بھی توقع تھی کہ اگر میرا مطلوبہ آدمی ان میں ہُوا تو وہ تانگے والے کو پہچانتا ہوگا۔ اس صورت میں اس کے چہرے کے تاثرات یقیناً تبدیل ہوں گے۔

تانگے والے نے ہر ایک لڑکے کو دیکھنا شروع کر دیا اور میں بھی ہر لڑکے کے چہرے کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ میں نے زیادہ تر ارشاد کا چہرہ دیکھا۔ تانگہ بان اُس کے سامنے رُک گیا اور اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے ارشاد کے چہرے پر بڑی صاف تبدیلی دیکھی۔ تانگہ بان اگلے لڑکے کو دیکھنے لگا۔ اُس نے ایک بار پھر ارشاد کو دیکھا۔ تانگہ بان پھر آگے چلا گیا۔

میں نے پیچھے جا کر ارشاد کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے لائن سے باہر نکال کر دبی سی آواز میں کہا — "میرے کمرے میں چل کر بیٹھو" — اُس کے چہرے پر جو رنگ اُڑا اور جو رنگ آیا اُس نے مجھے صاف بتا دیا کہ احمد یار خان! یہی تمہارا آدمی ہے۔ دوسرے کسی بھی لڑکے کے چہرے پر کوئی مشکوک تاثر نہیں تھا۔ میں نے ارشاد کو اپنے دفتر میں بھیج کر لڑکوں سے کہا — "شاباش میرے بچو! جہاں جی چاہتا ہے بیٹھو لیکن یہیں رہنا۔"

میں نے ارشاد کو اس خیال سے پکڑا تھا کہ نوجوان دوست جوانی کے جوش اور محبت

کے جذبات سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے کی مدد نتائج سے بے پروا ہو کر کیا کرتے ہیں۔ اگر اغوا کا مجرم مقتول ہی تھا تو اُس کے کسی گہرے دوست نے اُس کی مدد کی ہو گی۔ وہ ارشاد ہی ہو سکتا تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ ارشاد اس کا گہرا دوست تھا۔

تانگہ بان نے لڑکوں کے وہاں سے ہٹنے کے بعد مجھے کہا ــــ "یہی معلوم ہوتا ہے جسے آپ نے پکڑا ہے۔"

مَیں نے شناخت کا یہ جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ غیر قانونی تھا۔ ملزم کی شناخت کا طریقہ اور ہوتا ہے۔ اسے دس بارہ غیر متعلق آدمیوں میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ سب کے سروں پر پگڑیاں یا رومال ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اسے شناخت پریڈ کہتے ہیں۔ اور یہ شناخت ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ شناخت کو مصدقہ صرف اُس صورت میں سمجھا جاتا ہے کہ شناخت کرنے والا وثوق سے کہے کہ یہ ہے وہ آدمی۔ پھر مجسٹریٹ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ مَیں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مَیں مقدمے میں اس شناخت کا ذکر ہی نہیں کروں گا۔

مَیں نے اندر جا کر ارشاد کا چہرہ دیکھا تو اُس کے چہرے سے جوانی کا جوش پیلا پڑ چکا تھا۔ مَیں نے اُسے کوئی تمہیدی لیکچر نہیں دیا۔ اُس پر اپنی تھانیداری کا رعب نہیں جمایا۔ بڑے تحمل سے پُوچھا ــــ "ارشاد بھائی! دُلہن کہاں ہے؟"

اُس کا منہ کُھل گیا۔ پھر وہ ہنس پڑا مگر یہ ہنسی نہیں تھی۔ اُس نے شاید خود ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ ہنس نہیں سکا۔ وہ گھبرایا اور آہستہ سے بولا ــــ "دُلہن؟ کونسی دُلہن؟"

"دیکھو ارشاد" ــــ مَیں نے اُسے بڑے اچھے لہجے میں کہا ــــ "مَیں نے تمہیں بھائی کہا ہے۔ مَیں بھائی کا حق ادا کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ تم بڑے بھائی کا حق ادا کرو۔ تانگے والے نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ ابھی دو اور آدمی تمہیں پہچاننے کے لیے آ رہے ہیں۔ مجھے

چاہیے کہ تمہیں فوراً حوالات میں بند کر دوں، لیکن تمہاری عمر پر ترس آتا ہے۔ مجھے کچھ دو اور مجھ سے کچھ لو۔ اپنی زندگی تباہ نہ کرو..... جمیلہ کو تم لے جا رہے تھے یا تمہارا دوست؟"

وہ پیشہ ور مجرم تو تھا نہیں۔ احمق لونڈا تھا جسے ہندوؤں کی زبان میں مُورکھ بالک کہتے ہیں۔ اُس نے میری طرف دیکھا تو اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ مَیں نے چند اور باتیں کہہ کر اُس کا رہا سہا دم بھی توڑ دیا اور اُس کا ہمدرد بھی بن گیا۔ اُس نے ایک نہایت احمقانہ سوال کیا۔ کہنے لگا ــــ "آپ میرے گھر والوں کو تو نہیں بتائیں گے؟"

اُسے معلوم نہیں تھا کہ اب تو ساری دُنیا سُنے گی۔ مَیں نے اُسے ہم عمر دوستوں کی طرح کہا ــــ "نہ یار! مجھے تم ایسا کچا سمجھتے ہو کہ دوسروں کو بتاتا پھروں گا کہ تم نے مجھے کیا بتایا ہے؟"

"لڑکی کو آصف (مقتول) لے جا رہا تھا" ــــ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "مَیں تو ویسے ہی ساتھ چلا گیا تھا۔"

"ارشاد بھائی!" ــــ مَیں نے شفقت کے لہجے میں کہا ــــ "آصف قتل ہو چکا ہے۔ تم جو جھوٹ بولنا چاہو بول سکتے ہو۔ آصف اب یہ نہیں کہ سکتا کہ یہ جھوٹ ہے، لیکن مَیں تمہیں فائدے کی ایک بات بتاتا ہوں۔ تھانے اور جیل خانے کا چکر بہت بُرا ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو۔ تم جھوٹ بول کر اس میں سے نہیں نکل سکو گے بلکہ اور زیادہ پھنسو گے۔ مجھے ہر بات سچ سچ بتا دو۔ پھر مَیں تمہیں بتاؤں گا کہ جھوٹ کہاں اور کس قسم کا بولنا ہے۔ تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ مجھ سے مدد اور ہمدردی کی توقع رکھو۔ تم کلمہ گو بچے ہو۔ مَیں تمہاری مدد کروں گا۔"

اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ تو اپنی احمق ذات میں غرق ہو چلا تھا۔ مَیں نے اُسے جذباتی سہارا دیا۔ اُس نے واردات سُنا دی۔ اس کا اختصار یہ ہے کہ مقتول اور جمیلہ کی محبت تھی جس طرح مقتول کی بہن نے بیان کی تھی۔ ارشاد مقتول کا ہمراز دوست تھا۔ اُسے بتاتا رہتا تھا کہ جمیلہ کے ساتھ اُس کی شادی نہیں ہو سکتی اور وہ خالہ کی بیٹی کو پسند نہیں کرتا۔ ارشاد کے بیان کے مطابق مقتول اور جمیلہ کی باہر کہیں صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ باقی ملاقاتیں مقتول کے گھر میں اُس کی بہن کی موجودگی میں ہوتی تھیں۔ اُن کے زبانی پیغام قبولو نام کی عورت لاتی لے جاتی تھی۔ جمیلہ کی منگنی کالی چھپکلی سے ہوگئی۔ ارشاد نے باتوں کی روانی میں اُس کا نام نہیں لیا، کالی چھپکلی ہی کہا تھا۔ معلوم ہُوا کہ سب سے پہلے جمیلہ نے اُسے کالی چھپکلی کہا تھا۔ اُس نے مقتول کو بتایا۔ مقتول نے ارشاد کو بتایا، اور اس بے چارے کا یہی نام دھر دیا گیا۔

پھر شادی کا دن مقرر ہوگیا۔ مقتول انہی نوجوانوں میں سے تھا جن کی مَیں تشریح کر چکا ہوں۔ اپنے آپ کو رستمِ زماں سمجھتے ہیں اور جوانی انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ قبولو کی معرفت مقتول نے اپنی یہ سکیم جمیلہ تک پہنچائی کہ کہیں بھاگ چلیں۔ جمیلہ اپنے ہونے والے دُلہا سے بے حد نفرت کرتی تھی۔ اُس نے سکیم منظور کر لی لیکن منگنی کے بعد لڑکیوں کو پُوری طرح قید کر لیا جاتا ہے اور جب شادی کا دن مقرر ہو جاتا ہے تو لڑکی کو ایک منٹ کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ کوشش کے باوجود جمیلہ کو گھر سے نکلنے کا موقع نہ ملا۔

مقتول کا ایک دوست امرتسر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کلرک تھا۔ مقتول امرتسر جا کر

اُسے ملا اور بتایا کہ وہ ایک لڑکی کو لا رہا ہے۔ اُس دوست نے رہنے کا انتظام کر دیا اور ہر طرح کی مدد کا وعدہ بھی کیا۔ مقتول نے سوچا تھا کہ جمیلہ کو وہاں لے جا کر شادی کر لے گا اور وہیں کوئی ذریعۂ معاش بھی مِل جائے گا۔ قبولو کو منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ تھا۔ مقتول اُسے پیسے دیتا رہتا تھا۔

پھر شادی ہوگئی۔ اس موقعہ پر قبولو نے یہ سکیم بنائی کہ وہ سُسرال میں ایسی صورت پیدا کر دے گی کہ لڑکی دُلہا کی پہلی ملاقات سے پہلے ہی بھاگ آئے گی۔ حالات نے اُن کی یہ مدد کی کہ کمرۂ عروسی ڈیوڑھی کے ساتھ تھا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ گلی میں کُھلتا تھا جو رات کو اندھیری ہوتی تھی۔ قبولو چونکہ ہر گھر کی نوکرانی، ہر گھر کی فرد اور ہر گھر کی رازداں تھی، اُس نے کمرۂ عروسی کے متعلق قبل از وقت معلوم کر لیا تھا۔ اُس نے سکیم نہایت اچھی سوچی مگر اُس نے یہ نہ سوچا کہ سکیم پر عمل کرنے والے مُور کھ بالک ہیں۔ اِن مجرموں نے یہ بھی نہ سوچا کہ سکیم عین درمیان میں کوئی اور صورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔ انہوں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا کہ جُرم مکمل کر لینے سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ مسئلہ تو وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں جُرم ختم ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ انہوں نے خوش فہمیوں کی بنیادوں پر ایک سنگین جُرم کی سکیم بنائی اور خطروں کی پروا نہ کی۔

جمیلہ نے بھی اِس سکیم کی منظوری دے دی۔ وہ عقل سے نہیں اپنے دُلہا کے خلاف نفرت اور مقتول کی محبّت کے زیرِ اثر سوچ رہی تھی۔ کمرۂ عروسی کی چٹخنی چڑھا دینا، شلوار اُتار کر پلنگ کی چادر باندھ لینا اور کمبل اوڑھ لینا، اور یہ ساری ترکیبیں قبولو نے سوچی تھیں۔ مقتول نے ارشاد کو یہ سکیم بتائی اور دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کی گاڑی سے پہلے تانگہ لے آئیں گے۔ گاڑی راستے میں بدلتی تھی۔ وہاں سے امرتسر کی گاڑی ملتی تھی۔ مقتول رات ہی جمیلہ کو قصبے سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔ مقتول نے گھر سے پیسے نہیں چُرائے۔ دُلہن زیورات سمیت آ رہی

تھی۔ زیورات امرتسر فروخت کرنے تھے۔

قبولو جمیلہ کی ڈولی کے ساتھ ہی آگئی۔ شام کو اُس نے مقتول کو بتا دیا کہ نو بجے کے بعد تانگہ لے آئے۔ ارشاد کو یہ معلوم نہیں تھا کہ قبولو نے یہ انتظام کس طرح کیا۔ وہ دونوں تانگہ لے آئے۔ قبولو نے باہر جا کر دیکھا کہ تانگہ کھڑا ہے۔ مقتول نے اُسے دیکھ کر کہا — "لے آؤ"۔ اس کے جانے کے بعد لڑکی اُسی بھیس میں آگئی جس طرح قبولو نے بتایا تھا کہ آئے گی۔ ریلوے سٹیشن گئے تو گاڑی چل پڑی تھی۔ مقتول نے کہا کہ لاریوں کے اڈے پر چلو۔ تانگے والے نے کہا بھی کہ اس وقت کوئی لاری نہیں جاتی مگر مقتول کو یقین تھا کہ ایک لاری جاتی ہے۔ اس کے کہنے پر وہ لاریوں کے اڈے پر پہنچے۔

اڈے سے ایک اور ڈرامہ شروع ہو گیا۔ وہاں انہیں کمالا بدمعاش مل گیا۔ کمالا بڑی ظالم نسل کا بدمعاش تھا۔ اُس نے غالباً یہ دیکھ لیا تھا کہ ان لڑکوں کے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ اُس کی اُستادانہ نگاہوں نے یہ بھی بھانپ لیا ہوگا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ وہ اِن دونوں کو جانتا تھا اور دونوں اُسے جانتے تھے۔ اُس نے انہیں کہا کہ ایک لاری جائے گی۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ تانگے کو چھٹی دے دی گئی۔ کمالا باہر آکر انہیں یہ کہہ کر کمرے میں لے گیا کہ ذرا سی دیر بیٹھو، لاری آ جائے گی۔ وہ اندر چلے گئے۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ وہاں ایک اور آدمی بیٹھا تھا جسے مقتول اور ارشاد نہیں جانتے تھے۔ اُس نے انہیں چارپائی پر بٹھایا اور پوچھا — "یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ لڑکی نہیں لڑکا ہے"— مقتول نے کہا — "اُسے بخار ہے اس لیے کمبل لپیٹ رکھا ہے۔"

ان تینوں کی حماقت دیکھو کہ کمبل اور چادر میں تو وہ لڑکا لگتی تھی لیکن پاؤں تو چھپے

ہوئے نہیں تھے۔ جمیلہ نے زنانہ سینڈل پہن رکھے تھے جن میں سے اُس کے گورے اور زنانہ پاؤں نظر آرہے تھے۔

ارشاد نے اپنے بیان میں بتایا کہ اس آدمی نے اچانک کمالے سے ذرا غصّے سے کہا — "یار تم کھڑے کیوں ہو؟ ذرا ٹائم دیکھو۔ اٹھارہ سواریاں سٹیشن پر انتظار کر رہی ہیں۔ تین یہ آگئے ہیں۔ چوتھا میں ہوں۔ گاڑی نکالو اور چلو۔"

کمالا باہر کو دوڑا۔ اُس آدمی نے انہیں کہا کہ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ لاری ابھی نکلی نہیں تھی۔ اس بدبخت نے مجھے بھی دیر کرا دی۔ اس اجنبی نے ایسی باتیں کیں کہ یہ لڑکے اور لڑکی اسے انتظار میں بیٹھا ہوا کوئی مسافر سمجھنے لگے۔ اِن بے چاروں کو کون بتاتا کہ یہ اجنبی اُس دنیا کا مسافر ہے جہاں پولیس بھی جا کر راستہ بھول جاتی ہے۔ کمالا ڈرائیور بھی تھا۔ ڈرائیوری میں ہی وہ پکا بدمعاش بنا اور پولیس کے رجسٹر میں آیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ چابی لے کر آگیا اور بولا۔ "اُٹھو جی!"

سب اُٹھے اور باہر نکل گئے۔ کمالا انہیں ایک لاری کی طرف لے گیا۔ وہ خود ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مقتول اور جمیلہ کو پیچھے والی سیٹوں پر بٹھایا گیا۔ کمالے نے لاری چلائی مگر ریلوے سٹیشن کی بجائے اُس کا رُخ کسی اور طرف تھا۔ ارشاد کو ساتھ نہیں جانا تھا۔ وہ اڈے پر رہ گیا اور لاری اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ارشاد خوش تھا کہ اُس نے دوست کی مدد کامیابی سے کی ہے۔ وہ اپنے گھر آگیا۔

ریت کے رستم

دوسرے دن اُسے دوستوں نے یہ خبر سنائی کہ کل جس لڑکی کی شادی ہوئی تھی وہ رات

کو لاپتہ ہوگئی ہے۔ وہ صبح دیر سے جاگا تھا، اس لیے اکھاڑے میں ورزش کے لیے نہ گیا۔ اچانک اُسے مقتول مل گیا۔ وہ اُس کے گھر کی طرف آرہا تھا۔ ارشاد اُسے دیکھ کر بہت ہی حیران ہُوا۔ اُس وقت مقتول کو جمیلہ کے ساتھ امرتسر ہونا چاہیے تھا۔ مقتول کا رنگ اُڑا ہُوا تھا۔ اُس نے ارشاد کو لاری چلنے کے بعد کا واقعہ سُنایا۔ ارشاد پر سکتہ طاری ہوگیا۔

مقتول نے اُسے سنایا کہ لاری سٹیشن کی طرف جانے کی بجائے دریا کی طرف چلی گئی۔ مقتول کمالے سے پوچھنے ہی لگا تھا کہ کہاں جا رہے ہو اور سواریاں کہاں سے لوگے کہ لاری رُک گئی۔ لاری کے اندر چھوٹا سا ایک بلب جلا۔ ساتھ جو آدمی تھا اُس نے لمبا سارا چاقو نکال لیا۔ کمالے نے بھی چاقو نکال لیا۔ دونوں اُن کے سر پر آن کھڑے ہوئے۔ اجنبی نے جمیلہ کے سر سے کمبل ہٹا دیا۔ دونوں چاقو مقتول کے سامنے تھے۔ وہ بیٹھا ہُوا تھا۔

کمالے نے کہا ــــ "لڑکی چھپا کر کہاں لے جا رہے ہو؟ تمہاری کیا لگتی ہے؟ جھوٹ بولو، ہم تمہیں سیدھا تھانے لے جائیں گے۔"

مقتول کے ہوش اُڑ گئے۔ جوانی کا جوش اور جسم کی طاقت دو چاقوؤں کے سامنے ختم ہوگئی۔ یہ دراصل جُرم کا اثر تھا جس نے مقتول جیسے تنومند جوان کو ریت بنا دیا۔ کمالے نے اسے کہا۔ "تم عزت دار باپ کے بیٹے ہو۔ نیچے اُترو اور گھر چلے جاؤ۔ اگر تین پانچ کرو گے تو ہم تمہیں قتل بھی کر سکتے ہیں۔ لاش دریا میں پھینک دیں گے اور چاہیں تو پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ چلو۔ نیچے اُترو۔ سوچو مت۔"

دوسرے آدمی نے بھی اُسے دھمکی دی اور اُٹھا کر لاری سے اتار دیا۔ جمیلہ اُٹھنے لگی تو کمالے نے اُسے بازوؤں میں جکڑ کر اُٹھنے نہ دیا۔ جمیلہ نے شور مچا دیا لیکن اس کا منہ بند کر دیا گیا۔ مقتول کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ لاری چل پڑی اور دریا پار کر گئی۔ وہ دونوں جمیلہ کو لے گئے۔ مقتول واپس آگیا۔ اُس نے اگلے دن ارشاد کو بتایا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کمالے کے منہ آنے سے بھی گھبراتے تھے۔ وہ

خود مجرم تھے۔ تھانے بھی نہیں جا سکتے تھے اور کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ مقتول نے اِس ڈر کا بھی اظہار کیا کہ کمالا انہیں بلیک میل کر سکتا ہے اس لیے چُپ ہی بھلی تھی۔

ارشاد اعانتِ جرم کا مجرم تھا۔ مَیں اُسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ابھی اُس سے مقتول کے قتل کے متعلق پوچھنا تھا۔ مجھے یہ شک بھی ہُوا کہ ارشاد نے جھوٹا بیان دیا ہے۔ لڑکی پر اُس نے قبضہ کر لیا ہے اور مقتول کو قتل کر دیا ہے، لیکن کمالے بدمعاش کا ذکر اور تانگہ بان کا بیان اِس شک کے خلاف تھا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ مقتول کے قتل کے متعلق اُس کی کیا رائے ہے۔ اُس نے کالی چھپکلی کا نام لے کر میری ہنسی نکال دی۔

"اگر اُس نے اپنے ہاتھوں قتل نہیں کیا تو کروایا ہے"ــــ اُس نے کہا ــــ "اُس کے چچازاد بھائی ہیں جو اتنے دلیر تو نہیں لیکن غیرت دلیر بنا دیتی ہے۔"

میرے پوچھنے پر ارشاد نے بتایا کہ کالی چھپکلی زہری لڑکا ہے۔ وہ بے شک چُپ رہتا ہے لیکن اُس کے اندر دم موجود ہے۔ اُسے ضرور شک ہوگا کہ اُس کی دلہن مقتول لے گیا ہے۔

"مقتول نے اغوا سے پہلے یا بعد دُلہا (کالی چھپکلی) کے ساتھ کوئی طنزیہ یا ایسی ویسی بات کی تھی؟" ــــ مَیں نے اس خیال سے ارشاد سے یہ سوال پُوچھا کہ مقتول جیسے اوچھے رستم بڑکیں مارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میرا خیال درست نکلا۔ ارشاد نے بتایا کہ مقتول نے شادی سے پہلے کالی چھپکلی کو طعنے دیئے تھے۔ اور اغوا کے اگلے روز پچھلے پہر کالی چھپکلی شاید تھانے سے واپس آرہا تھا تو اُسے مقتول راستے میں مل گیا تھا۔ ارشاد بھی ساتھ تھا۔ مقتول ارشاد سے ہٹ کر کالی چھپکلی کو الگ لے گیا اور اُسے کچھ کہہ کر ارشاد کے پاس آگیا تھا۔ کالی چھپکلی وہیں کھڑا مقتول کو دیکھتا رہا تھا۔ ارشاد نے پوچھا تو مقتول نے اُسے بتایا کہ اُس نے دُلہا میاں سے کہا ہے کہ اب اپنے جیسی کوئی دلہن ڈھونڈ لو۔

"مقتول یا تم دونوں کمالے سے ملے تھے؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــ "اگر ملے تھے تو کیا بات ہوئی تھی؟"

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مقتول ... کمالے کو جا کر دھمکی دی ہوگی اور کمالے نے خفیہ طریقے سے اُسے قتل کر دیا ہوگا، لیکن ارشاد نے یہ بتا کر مسئلہ حل کر دیا کہ مقتول نے ارشاد کے مشورے کے باوجود کمالے کے پاس جانے سے گریز کیا تھا۔ کمالا اصل بدمعاش اور اُستاد تھا اور مقتول رتے کا رُستم تھا۔ میں نے اس امکان پر غور کیا کہ کالی چھوکی نے قتل کرا یا کروا سکتا ہے؟ میرا دل مان نہیں رہا تھا۔

میں نے ارشاد سے کچھ اور باتیں پوچھیں، پھر اُس کے احتجاج اور منت سماجت کے باوجود اسے حوالات میں بند کر دیا۔ لاریوں کے اڈے کے دونوں ٹھیکیدار آگئے تھے۔ ایک سکھ تھا دوسرا مسلمان۔ انہیں اندر بلا کر پوچھا کہ اڈے پر رات کمالے کے ساتھ کون تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر لاعلمی کا اظہار کیا کہ چونکہ شام کے بعد کوئی لاری نہیں چلتی اس لیے وہ شام کو ہی گھروں کو چلے گئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا انہیں معلوم ہے کہ رات اڈے پر اغوا کی ایک واردات ہوئی ہے اور ایک لاری ایک لڑکی کو لے کر گئی تھی؟ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بیک وقت کہا کہ انہیں معلوم نہیں۔

میں اُن پر زیادہ جرح نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرے پاس اب قابلِ اعتماد شہادت آگئی تھی۔ میں نے ان دونوں کو باہر بٹھا دیا اور اپنے اے۔ ایس۔ آئی رگھوناتھ سے کہا کہ لاریوں کے اڈے پر جا کر تمام ڈرائیوروں کو لاریوں سمیت یہاں لے آؤ۔ اگر کوئی لاری باہر گئی ہوئی ہو تو ایک کانسٹیبل کو وہاں چھوڑ آؤ۔ جونہی لاری آئے کانسٹیبل اُسے تھانے لے آئے اور کسی لاری میں سواریاں بیٹھی ہوئی ہوں تو لاری خالی کرا کے لے آؤ۔

اُسے تین کانسٹیبلوں کے ساتھ بھیج کر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ قبولو کو تھانے لے آئے

اور کمالے بدمعاش کو ڈھونڈنے کا انتظام کرے۔ کمالا چونکہ رجسٹرڈ بدمعاش تھا اس لیے اُس پر پابندی عائد تھی کہ قصبے سے باہر جانے سے پہلے تھانے میں اطلاع درج کرایا کرے کہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ چوکیدار کے لیے حکم تھا کہ وہ ہر رات دیکھا کرے کہ کمالا گھر میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چوکیدار نے کوتاہی کی یا کمالے سے پیسے لیے ہیں۔

انہیں بھیج کر میں قتل کی واردات کی کڑیاں ملانے لگا۔ مُخبر آئے ہوئے تھے۔ اُن سے رپورٹیں لیں۔ ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں جو کڑیاں ملا رہا تھا وہ ملتے ملتے اُلجھ جاتی تھیں۔ نظر دُلہا کے چچازاد بھائیوں پر رُکتی تھی۔ دو مُخبر ان دونوں کو اور اُن کے گھرانوں کو جانتے تھے۔ وہ میری تائید نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اس خاندان کے آدمی قتل ہو سکتے ہیں قتل نہیں کر سکتے۔ اگر وہ قاتل نہیں تو کمالا ہوگا۔

میں نے تھانے کے باہر دیکھا۔ لوگوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ اُس دَور میں جرائم کا آج والا عالم نہیں تھا۔ اُس وقت کسی گھر میں چوری ہوتی یا نقب لگتی تھی تو سارا شہر اُس گھر کو دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو جاتا اور پولیس رات سے پہلے پہلے مجرموں کو پکڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی تھی۔ اُس دَور میں پولیس اور جرائم پیشہ افراد کی آپس میں دشمنی ہوتی تھی۔ آج کی طرح دوستی نہیں تھی۔ اس قصبے میں ایک دُلہن لاپتہ ہوئی اور ایک نوجوان قتل ہو گیا اور ایسے لگتا تھا جیسے قصبے میں ہڑتال ہو گئی ہے۔ جسے دیکھو اُس کا رُخ تھانے کی طرف تھا۔ جن لڑکوں کو میں نے تھانے میں بٹھا رکھا تھا اُن کے باپ تھانے کے احاطے کے اندر پریشان کھڑے تھے۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے جا کر انہیں تسلی دی اور بتایا کہ ان سب کو گواہی کے لیے بُلایا ہے، کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا نہ کیا جائے گا۔ ارشاد کا باپ بھی موجود تھا۔ اُسے میں نے کچھ نہیں بتایا۔

رگھوناتھ تین لاریاں لے آیا۔ چوتھی باہر گئی ہوئی تھی۔ مَیں نے تینوں ڈرائیوروں کو اکٹھا کھڑا کر کے کہا — "اگر جھوٹ بولوگے تو یہ لاریاں یہیں رہیں گی .... پرسوں ترسوں رات کمالا کس کی لاری لے گیا تھا؟"

ایک ڈرائیور نے فوراً کہا — "میری"

"کہاں لے گیا تھا؟"

"یہ معلوم نہیں" — ڈرائیور نے جواب دیا — "آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ کمالا ڈرائیور بھی ہے بدمعاش بھی۔ مَیں دو آدمیوں کے ساتھ باہر چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کمالا دوڑتا آیا۔ اُس نے مجھ سے لاری کی چابی مانگی۔ مَیں نے اُسے کہا، کمالے یار دُور نہ جانا اور کہیں لاری نہ پھنسا دینا۔ اُس نے کہا، دھوکہ فریب تمہارے ساتھ ہی کرنا ہے؟ .... مَیں نے ایک تانگے سے تین آدمی اُترتے دیکھے تھے۔ کمالا میری لاری آگے لے گیا۔ تینوں کو اُس نے لاری میں بٹھایا اور لاری لے گیا۔"

"چوتھا آدمی کون تھا؟"

"وہ دیوا ماچھی تھا" — ڈرائیور نے جواب دیا۔

"دیوا ماچھی؟" — مَیں نے سخت حیرت سے پوچھا — "وہ کیا کرنے آیا تھا؟"

"کبھی کبھی کمالے کے پاس آتا ہے" — اُس نے جواب دیا — "اُس رات شام کے بہت بعد آیا تھا۔"

دیوا ماچھی کے نام نے مجھے چونکا دیا تھا۔ یہ دوسرے تھانے کی حدود کا ایک رہزن اور ڈکیت تھا۔ اُس کا شمار اُس زمانے کے نامی گرامی ڈاکوؤں میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوئی خوفناک جرائم پیشہ نہیں تھا لیکن تھا جرائم پیشہ۔ تین چار بار کا سزا یافتہ تھا۔ بردہ فروشی بھی کرتا تھا لیکن اعلیٰ قسم کی نہیں۔ کسی غریب اور جوان عورت کو ورغلا کر کہیں بیچ ڈالتا تھا۔ پیشہ ور بھک منگوں کی کوئی جوان اور اچھی صورت والی لڑکی نظر آتے تو اُسے خرید کر یا اُڑا کر عصمت فروشوں کے ہاتھ بیچتا تھا۔ رہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی کرتا تھا۔ چاقو چلانے کا ماہر تھا۔ مختصر یہ کہ اُستاد آدمی تھا۔ اُس کی تمام وارداتیں اُس کے اپنے تھانے کی تھیں۔ میرا علاقہ اس کے پڑوس میں تھا لیکن اس سے محفوظ تھا۔ اُس کا نام سُن کر مَیں چونکا۔ وہ میرے تھانے میں آگیا تھا۔

مَیں نے سوچا کہ اب لڑکی کی برآمدگی مشکوک ہوگئی ہے۔ جمیلہ یعنی کنواری دُلہن اُس کے لیے بڑا ہی قیمتی مال تھا۔ اُس زمانے میں راجے مہاراجے اور نواب ایسے مال کے بڑے موٹے گاہک تھے اور مال کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایسی خوبصورت لڑکیاں بازاروں میں نہیں دی جاتیں بلکہ راجوں مہاراجوں کے ہاں فروخت کی جاتی تھیں۔ انگریزوں کے بنائے ہوئے چھوٹی چھوٹی نگریوں کے اِن بادشاہوں کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ اُن کی رعایا بھُوکی مرتی اور یہ بادشاہ شراب میں بدمست رہتے اور اُن کے محل لڑکیوں سے بھرے رہتے تھے۔ مَیں نے سوچا کہ دیوا ماچھی کو ایسی قیمتی لڑکی کی منڈی کا علم ہوگا۔ اگر اُسے علم ہے تو پھر ایک شریف گھرانے کی دُلہن ہمیشہ کے لیے گئی۔ مجھے یہ خطرہ بھی نظر آنے لگا کہ مقتول کا قاتل دیوا ماچھی ہے۔ اُس نے خود قتل کیا یا کرایا ہے۔

"لاری کِس وقت واپس آئی تھی؟" — مَیں نے ڈرائیور سے پُوچھا۔

"تقریباً دو گھنٹے بعد۔"

"تم نے کمالے سے پوچھا تھا کہ وہ لاری کہاں لے گیا تھا؟"

"پُوچھا تھا لیکن اُس نے نہیں بتایا" — ڈرائیور نے جواب دیا — "اُس نے مجھے چابی

دیں اور چلا گیا۔"

"اس کے بعد تمہیں کمالا کہیں نظر آیا تھا؟"

"میں نے نہیں دیکھا۔"

"میں نے دیکھا تھا"۔۔۔ ایک اور ڈرائیور نے کہا۔۔۔ "ڈیڑھ دو گھنٹے گزرے، میں نے اسے بازار میں جاتے دیکھا تھا۔"

"عالی جاہ!"۔۔۔ ایک ڈرائیور نے کہا۔۔۔ "ایسا حکم جاری کریں کہ کمالے اور دلیوے جیسے اچھے بدمعاش اڈے پر نہ آیا کریں۔ ہماری درخواست ہے کہ شام کے بعد وہاں سنتری کھڑا کر دیا کریں۔ آپ غور فرمائیں کہ واردات ان بدمعاشوں نے کی اور گاڑیاں ہماری ضبط ہو گئیں۔ یہ ہماری روزیوں کا ٹائم ہے۔ ہماری روزی میں بٹے پڑے کہ نہیں!"

میں اس لاری کو نہیں چھوڑ سکتا تھا جس میں لڑکی کو لے جایا گیا تھا۔ میں نے اس کی جگہ سے باقی لاریاں چھوڑ دیں۔ مطلوبہ ڈرائیور کو شاملِ تفتیش کر کے پابند کر لیا۔ اتنے میں قبولو آ گئی۔ اس کی عمر پینتیس سال کے اِدھر اُدھر تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ آسمان کی ٹاکی اتار سکتی ہے اور لگا بھی سکتی ہے۔ میرے سامنے آئی تو میں نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

"گھبراؤ نہیں قبولو! میری موجودگی میں گھبرانے کی ضرورت نہیں، لیکن مجھے چکر نہ دینا۔" میں نے کہا۔۔۔ "عورت ذات ہو، عزت سے بات کروں گا اور جتنی دیر میرے پاس رہو گی عزت سے رکھوں گا۔"۔۔۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور حوالات کے دروازے کے سامنے جا کھڑا کیا۔

اس نے سلاخوں میں سے اندر دیکھا۔ ارشاد فرش پر بیٹھا تھا۔ میں نے قبولو سے

کہا۔۔۔ "اچھی طرح پہچان لو تاکہ تمہیں کوئی شک نہ رہے"۔۔۔ وہاں سے ہٹا کر میں نے باہر کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔۔۔ "وہ جو لاری کھڑی ہے نا! اس میں جمیلہ کو لے جایا گیا ہے۔ جمیلہ کو جانتی ہو نا! جسے تم نے کمبل اور چادر میں لپیٹ کر گھر سے نکالا اور تانگے کی طرف بھیجا تھا۔"

مُجرم کون ہے؟۔۔۔ آپ یا یہ عورت؟

قبولو پہلی بار پولیس کے پھندے میں آئی تھی اور وہ بھی اتنے سنگین جرم میں جو ایک قتل کا بھی باعث بنا۔ ارشاد کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اُسے حوالات میں دیکھ کر اُس کے چہرے سے خون اندر ہی کہیں غائب ہو گیا۔ اور میری ٹھہری ٹھہری باتوں اور تحمل نے اُس کی ساری چالاکیاں ختم کر دیں۔ میں اُسے اپنے دفتر میں لے گیا۔ جُرم کی بات ختم کر دی۔ اُسے یہ بھی نہیں کہا کہ اقبالِ جُرم کر لو۔ میں نے پوچھا "تم کون ہو؟ خاوند ہے؟ ماں باپ ہیں"؟

"کوئی نہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا اور اُس کے آنسو نکل آئے۔ میں اُسی کے متعلق اُس سے باتیں پوچھتا رہا اور وہ بتاتی رہی۔ وہ ہمدردی کے قابل تھی۔ میں دلی ہمدردی کا اظہار کرتا رہا۔ اُسے پانی پلایا۔ کھانے کی پوچھی لیکن وہ کھانا کھا آئی تھی۔

تھانیداری کو الگ رکھ دیں تو ہمارے معاشرے کے یہ کردار ہمدردی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ آپ کو اپنے شہر اور شاید اپنے محلے میں بھی قبولو جیسی کوئی عورت ملے گی۔ ایسی عورتیں جب پیدا ہوتی ہیں تو فرشتوں کی طرح معصوم اور پاک ہوتی ہیں مگر یہ جب ہمارے اور آپ کے درمیان پلتی بڑھتی اور جوان ہوتی ہیں تو یہ گناہگار اور جرائم پیشہ ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم انہیں اپنے گناہوں کا ذریعہ بھی بناتے ہیں اور انہیں گناہگار کہہ کر دھتکار بھی دیتے ہیں۔

روزی رساں تو اللہ تعالیٰ ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قبولو جیسی عورتوں کے روزی رساں ہم لوگ ہیں جن کے گھروں میں وہ کام کرتی اور جن کی اُجرت پر وہ گناہوں کا ذریعہ بنتی ہیں۔

اگر یہ جُرم تھا تو قبولو کا سب سے پہلا جرم یہ تھا کہ وہ غریب ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی۔ ماں باپ محنت مزدوری کرتے اور عزت سے کھاتے اور رہتے تھے۔ قبولو کی شکل و صورت ذرا اچھی تھی۔ ماں باپ کے گھر رہی تو عزت سے رہی۔ وہ امیروں کی بیٹی ہوتی تو امیروں کے گھر جاتی غریب تھی اس لیے ایسے آدمی کے ساتھ باندھ دی گئی جو بظاہر کہیں ملازم تھا لیکن جواری اور شرابی تھا۔ اس آدمی نے قبولو کو وہ ازدواجی زندگی نہ دی جس کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ خاوند کو چرس اور دیسی شراب کے لیے پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔ اُس نے قبولو کو مجبور کر دیا کہ وہ کوئی کام کاج کرے اور پیسے کمائے۔ اُس نے ایک گھر میں اُوپر کا کام لے لیا۔

چوتھے پانچویں سال خاوند کا دم اُکھڑنے لگا۔ اُس نے چرس اور شراب نہ چھوڑی۔ آخر وہ دمہ کی بیماری سے لگ گیا۔ تین سال قبولو نے گھروں میں کام کر کے اُس کی خدمت کی۔ اس دوران قبولو کے ماں باپ مر گئے۔ دو بچے پیدا ہوئے اور مر گئے۔ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی ایک جوان لڑکی نے ایک آدمی کی طرف پیغام بھیجنے کے لیے اُسے استعمال کیا اور پیسے دیئے۔ یہ غلط قسم کی محبت تھی جس میں قبولو کو رابطے کا ذریعہ بنایا گیا۔ اُسے اُجرت کی ضرورت تھی وہ مل رہی تھی۔

وہ گنوار اور حاجت مند لڑکی تھی۔ اُس نے مذہب اور اخلاقیات کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ ماں باپ نے عزت سے رہنا سکھایا تھا مگر خاوند نے شرم اُتار دی اور ایک اچھے گھرانے کی لڑکی نے اُسے بے حیائی کا پیغام دیا جہاں علم بھی تھا اور فضل بھی تھا۔ قبولو

نے اِس "عزت دار" گھرانے سے پیغام رسانی کا پیشہ سیکھ لیا۔ وہ جس آدمی کو پیغام دینے جاتی تھی اُسے قبولو بھی اتنی ہی پسند آ گئی جتنی بڑے گھرانے کی لڑکی پسند آئی تھی۔ یہاں سے اُس نے غیر مرد اور خاوند کے درمیان فرق مٹا دیا پیسے لیے اور چرس کے مارے ہوئے خاوند کی بیماری پر خرچ کیے۔ خاوند بچ نہ سکا۔ ایک روز مر گیا۔ قبولو کی عمر اٹھائیس سال سے ذرا اُوپر ہو گئی تھی۔ اُسے شادی کے لیے کہا گیا مگر اُس نے ازدواجی زنجیریں ہمیشہ کے لیے توڑ دیں اور ہم اور آپ جیسے عزت والے اور اُونچے ناموں والے گھرانوں کی نوکرانی بن گئی۔ عزت داروں نے اُسے گناہوں کا ذریعہ بنا لیا۔ قبولو دل جوڑنے اور توڑنے کی ماہر بن گئی۔ وہ بہت سے گھروں کے بھیدوں کی رکھوالی تھی۔ چار دیواری کی دُنیا کے بھید اُس کے سینے میں بھرے ہوئے تھے۔

اُس نے مجھے چند ایک واقعات سنائے۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی کہانی یُوں سنا رہی تھی جیسے مَیں اُسے اِس دوزخ سے نکال کر عزت کی کُرسی پر بٹھا دوں گا۔ اُس کے اندر ابھی یہ احساس پیدا نہیں ہُوا تھا کہ مَیں اُسے اِس گندے دوزخ سے تو نکال دوں گا لیکن ایسے دوزخ میں قید کر دوں گا جو اُسے ضعیف بڑھا کر کے سوسائٹی میں اُگلے گا۔ پھر قبولو پکی مجرم بن جائے گی۔ مَیں مجبور تھا۔ میرے جذبات کیسے ہی تھے، میرا فرض بڑا ظالم تھا۔ مَیں اُس کی سُنتا رہا۔ اُس کی زبان ایسی رواں ہو گئی تھی کہ مجھے کسی سوال اور جرح کی ضرورت ہی محسوس نہ ہُوئی۔ اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ سینے کا غبار نکالنے کا موقعہ ملا تھا۔ میرے سلوک اور رویّے میں اُسے وہ انسان نظر آ گیا تھا جسے وہ شاید ہمیشہ تلاش کرتی رہی تھی۔ یہ تو اُس نے دیکھ ہی لیا تھا کہ اُس کا جرم بے نقاب ہو چکا ہے اور اب ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ اُس نے جمیلہ اور آصف (مقتول) کی داستانِ محبت شروع کر دی۔

آپ ارشاد کی زبانی اور مقتول کی بہن کی زبانی یہ داستان سُن چکے ہیں۔ قبولو اُن کے درمیان پیغام رسانی کرتی اور ملاقاتوں کا انتظام کرتی تھی۔ اُس نے دو مرتبہ ان کی ملاقات اپنے گھر میں کرائی تھی لیکن یہ کام بہت خطرناک تھا، چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے تصدیق کی کہ مقتول اور جمیلہ ایک دوسرے کے لیے جان تک قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ انہوں نے فرار کی سکیم بھی اسی طرح بنائی جس طرح ارشاد نے بیان کی تھی۔ قبولو نے اعتراف کیا کہ جمیلہ جس طرح گھر سے نکلی وہ قبولو کی سکیم تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ دُلہن کے ساتھ ہی آگئی تھی۔ وہ دونوں گھروں میں کام کرتی تھی۔ اس کا دلہن کے ساتھ آنا قابلِ اعتراض نہیں تھا۔

اُس نے مقتول کو رات تیار رکھا تھا۔ اُسی نے تانگہ لانا تھا۔ ارشاد کو بھی اس سکیم کا علم تھا۔ اُسے اپنے دوست کے ساتھ رہنا تھا۔ اس سکیم کے مطابق قبولو نے گھر والوں کو اپنے مخصوص شگفتہ اور مذاقیہ انداز سے کہنا شروع کر دیا کہ دلہن کو اپنے کمرے میں بھیجو۔ قبولو کا گھروں میں کچھ اثر بھی تھا۔ قبولو نے دُلہا کی بہن کے کان میں کہا کہ دُلہا مجھے تین بار باہر بلا کر کہہ چکا ہے کہ دُلہن کو اپنے کمرے میں بھیجو۔ یہ خوشی کا موقع تھا۔ بہن نے دلہن کو اُس کے کمرے میں داخل کر دیا۔ قبولو بھی ساتھ کمرے میں چلی گئی۔ قبولو تھوڑی دیر اندر رہی۔ دُلہن کو زبانی ریہرسل کرائی اور اُس دروازے کی اندر سے چٹخنی لگا دی جو اندر کو کھلتا تھا۔

قبولو ڈیوڑھی والے دروازے سے باہر نکلی۔ اُس نے باہر جس طرف مہمان بیٹھے تھے دیکھا کہ دُلہا اُن کے ساتھ باتیں کر رہا ہے اور وہ جلدی اُٹھے گا نہیں۔ قبولو پھر دلہن کے پاس گئی اور اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ وقت ہو رہا تھا۔ قبولو نے گلی میں سے باہر جا کر دیکھا۔ تانگہ کھڑا تھا۔ وہ تین قدم آگے گئی۔ اُدھر سے اُسے مقتول کی آواز سنائی دی — "لے آؤ"۔

قبولو واپس گئی۔ دُلہن کو دیکھا۔ دوسری طرف جا کر دُلہا کو دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ قبولو

نے آکر ڈیوڑھی کی بتی بجھا دی اور دُلہن سے کہا کہ چلو۔ دُلہن نے نہایت پھرتی سے شلوار اتار دی۔ پلنگ کی چادر باندھی۔ اُوپر کمبل لیا اور نکل گئی۔ قبولو ڈیوڑھی کے دروازے میں کھڑی رہی۔ دُلہن گلی سے نکل گئی تو قبولو نے ڈیوڑھی کی بتی جلائی اور مہمان عورتوں میں گھُل مِل گئی۔ دُلہن کی گمشدگی کا انکشاف ہُوا تو اس کی تلاش میں سب سے زیادہ بھاگ دَوڑ قبولو نے کی۔ ساری رات قیامت بپا رہی۔ کوئی بھی نہ سویا۔ صبح کے وقت دُلہا کے باپ نے کہا کہ تھانے رپورٹ لکھائی جائے۔ قبولو نے مخالفت کی اور کہا کہ آج کا دن دیکھ لو، شاید واپس آجائے۔ رپورٹ لکھوائی تو پولیس آئے گی اور لوگ تماشہ دیکھیں گے۔ دونوں گھروں کے تو اوسان خطا تھے۔ بے چارے عقل کی بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی پیدا ہوگئی تھی۔

دن گزر گیا۔ رات کو اُسے مقتول ملا۔ وہ بہت حیران ہوئی۔ مقتول نے اُسے سُنایا کہ لڑکی اُن کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ قبولو نے سر پیٹ لیا۔ سوچتے سوچتے اُس نے کہا کہ وہ کمالے بدمعاش سے بات کرے گی۔ رات کو اُس نے کمالے کو ڈھونڈا۔ وہ اسے نہ ملا۔ اگلے روز مقتول قتل ہوگیا۔ قبولو کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ سمجھی کہ اسے کمالے نے قتل کیا ہے۔ اس ڈر سے کہ کمالا اُسے بھی قتل کر دے گا اُس نے کمالے سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میرے پُوچھنے پر قبولو نے دُلہا کے ردِ عمل کے متعلق بتایا کہ اُس پر تو ایک ہی چُپ طاری تھی۔ اُس نے صرف ایک بار کہا — "مَیں جانتا ہُوں۔ مَیں جانتا ہُوں۔ جو اللہ کو منظور ہوگا۔ دنیا دیکھے گی۔"

مَیں نے قبولو کو حوالات کے زنانہ کمرے میں بند کر دیا۔

وہ حوالات میں بیٹھی تھی

میرے ہیڈ کانسٹیبل کی بھاگ دوڑ اور تین مخبروں کی کوشش سے کمالا بدمعاش مل گیا۔

آدھا دن گزر گیا تھا اور وہ ایک جگہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ یہاں سے کہانی آگے سُنانے سے پہلے مَیں اپنے پڑھنے والوں سے معذرت چاہوں گا کہ مَیں نے تفتیش کے دوران کے وقت کا خیال نہیں رکھا۔ یہ نہیں بتایا کہ فلاں کو رات کے وقت تھانے میں لایا گیا اور فلاں کو دن کے وقت — مَیں تفصیلات کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ اگر ایسا کروں گا تو یہ کہانی کتاب جتنی لمبی ہو جائے گی۔ کمالے کی گرفتاری کے متعلق یاد ہے کہ اسے دوپہر سے ذرا پہلے لایا گیا تھا۔ اس قسم کے مجرم راتوں کو جاگتے اور دن بھر سوتے ہیں۔ کمالے نے اس طرح مجھے السلام علیکم کہا اور دبا کر ہاتھ ملایا جیسے دو دوست بڑے عرصے بعد ملتے ہیں۔ مَیں نے بھی اسی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔

"کمالے دوست" — مَیں نے اسے کہا — "مَیں تھک کر چُور ہو چکا ہوں۔ تم بھی تھکے ہُوئے معلوم ہوتے ہو۔ ہم دونوں کو آرام کی ضرورت ہے۔ آؤ۔ کام ذرا جلدی ختم کریں اور آرام کریں۔"

"خادم ہوں سرکار!" — اُس نے کہا — "حکم دیں۔"

"وہ لاری کھڑی دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں سرکار!"

"اور اس کے ڈرائیور کو بھی تم پہچانتے ہو!"

"ہاں سرکار!"

"اس چابی کو بھی پہچانتے ہو" — مَیں نے جیب سے لاری کی چابی نکال کر اُسے دکھائی۔

"ہاں سرکار!"

"اور تم مجھے بھی پہچانتے ہو!"

"ہاں سرکار!"

"میرے ساتھ آؤ" — مَیں اُسے حوالات کے آگے لے گیا اور ارشاد کی طرف اشارہ کر کے کہا — "تم اِسے بھی پہچانتے ہو؟"

اُس نے ماتھا سکیڑا اور میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ مَیں اُسے حوالات کے اگلے کمرے کے سامنے لے گیا جس کی سلاخوں میں سے اُسے قبولو فرش پر بیٹھی نظر آئی۔ قبولو نے سر اُوپر کیا اور ہمیں دیکھا۔ کمالے نے کہا — "اوئے میری قبولی! تُو بھی اسی چکر میں آئی ہے؟" — قبولو کچھ نہ بولی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

کمالے کو اپنے دفتر میں بٹھا کر مَیں نے پوچھا — "دیوا ماچھی اس وقت کہاں ہو گا؟"

"مَیں تو سرکار کے حضور بیٹھا ہُوں" — اس نے جواب دیا — "دیوے کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں؟"

"کمالے!" — مَیں نے ذرا رُعب سے کہا — "مقدمہ لڑنا چاہتے ہو تو مَیں تم سے کوئی بیان نہیں لُوں گا۔ زبردستی بھی نہیں کروں گا۔ میرے پاس اتنی شہادت ہے کہ تمہارے بیان کی مجھے ضرورت ہی نہیں۔ یہ بھی سُن لو کہ اغوا کا کیس، مجرم قتل ہو گیا ہے۔ یہ تم نے کیا ہے یا دیوے ماچھی نے یا کسی اور نے، مَیں یہ قتل تمہارے سر تھوپ کر ثابت بھی کر دوں گا اور تمہیں کالا پانی بھجوا دوں گا۔ خدا کی قسم یہ دُنیا تمہارے لیے جہنم بنا دوں گا۔"

اُس نے حیران ہو کر پوچھا — "قتل کون ہُوا ہے؟"

"پہلے مجھے جواب دو" — مَیں نے کہا — "اپنی ہسٹری شیٹ دیکھو۔ تمہیں ساری عمر کے لیے اندر بند کرنے کو یہی کافی ہے۔ اگر بولو گے تو فائدے میں رہو گے۔ تم اناڑی تو نہیں کمالے! قانون اور پولیس کی اُونچ نیچ سمجھتے ہو.... بولو کیا ارادہ ہے؟"

"وعدہ معاف گواہ بناتے ہو ہمیں؟" اُس نے پوچھا۔

"اگر ضرورت پڑی تو۔۔۔" مَیں نے جواب دیا۔

"ملک سرکار!" ۔۔۔ اُس نے پہلے ہاتھ جوڑے پھر میرے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ منت کرنے لگا ۔۔۔ "وعدہ معافی لکھوادو۔ ساری واردات ثابت کردوں گا۔ اللہ پاک کی قسم، مقدمہ سزا نہ ہُوا تو گولی ماردینا۔"

"پہلے بولو" ۔۔۔ مَیں نے کہا ۔۔۔ "وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ تم اب میرے پھندے سے نکل نہیں سکتے۔ مَیں اب قاتل کو نہیں ڈھونڈوں گا۔ قتل بھی تمہارے کھاتے میں جائے گا۔"

جو قارئین جرائم پیشہ افراد سے واقف نہیں وہ شاید حیران ہوتے ہوں کہ ایک مجرم میرے ساتھ بے تکلفی سے اپنے جُرم پر سودا بازی کر رہا تھا۔ جرم اور جیل اِن لوگوں کے لیے یوں ہوتا ہے جیسے دفتر اور گھر۔ کوئی جرائم پیشہ گرفتار ہوجائے تو دیکھ لیتا ہے کہ پولیس کے ہاتھ میں کیا ہے۔ اگر پولیس اندھیرے میں ہے یعنی شک ہے شہادت نہیں ہے تو وہ پولیس کو کوئی بیان نہیں دیتا۔ مقدمہ لڑتا ہے۔ اکثر جرائم پیشہ افراد قانون سے اتنے واقف ہوتے ہیں کہ وکیل کے بغیر کیس جیت سکتے ہیں، اور اگر اُسے معلوم ہوجائے کہ پولیس کے پاس شہادت ہے تو جرائم پیشہ سودا بازی کرکے اقبالِ جرم کرلیتا ہے۔ یہ نسل قید سے نہیں ڈرتی بلکہ قید کو اپنے کاروبار کا لازمی حصّہ سمجھتی ہے۔ کمالے نے دیکھ لیا تھا کہ مَیں نے شہادت کا پھندا بہت حد تک تیار کرلیا ہے۔ اس کے پاس یہی ایک چال رہ گئی تھی کہ وعدہ معاف گواہ بننے کی کوشش کرے۔ مَیں نے اُسے جھوٹا وعدہ دیا۔

وعدہ معاف گواہ جسے سلطانی گواہ بھی کہا جاتا ہے پولیس کا کام آسان کردیتا ہے۔

مَیں اس کا قائل نہیں تھا۔ سلطانی گواہ اُس واردات میں بنایا جاتا ہے جو زیادہ مجرموں نے مل کر کی ہو اور کوئی شہادت نہ ملے۔ ان میں سے ایک پکڑا جاتا ہے تو وہ وعدہ معاف گواہ لیا جاتا ہے جو سب کو پکڑوادیتا اور شہادت مہیّا کرتا ہے۔ عدالت اُسے کوئی سزا نہیں دیتی، یہ اُس کا انعام ہوتا ہے۔ یعنی ایک مجرم کو معاف کردیا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مَیں وعدہ معاف گواہ کم ہی بنایا کرتا تھا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ وعدہ معاف گواہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ نیکی کرتا ہے کہ عدالت میں مقدمے کی سماعت کے دوران بیان دے دیتا ہے کہ اُسے پولیس نے غیر انسانی تشدد کے زیرِ اثر وعدہ معاف گواہ بنایا ہے۔ اُس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ایسی صورت میں پولیس کے لیے کیس ثابت کرنا بہت ہی دشوار ہو جاتا ہے۔

دُلہن دریا پار کر گئی

کمالے نے مجھے خوش کرنے اور مجھ سے رعایت لینے کے لیے بیان دے دیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے تانگے کی پچھلی سیٹ پر دیکھ لیا تھا کہ لڑکی ہے لیکن اُسے شک نہیں ہُوا تھا۔ مقتول اور ارشاد کو اُس نے پہچان لیا کہ قصبے کے نوجوان ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ رات کو کوئی لاری نہیں جاتی۔ اُن کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ بھی فیصلہ نہیں کیا کہ انہیں جانا کہاں تک ہے۔ اندر دیوا اباہر آیا بیٹھا تھا۔ کمالے نے اُسے بتایا کہ مال معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو اندر بلا لیا گیا۔ وہاں دیوا نے پوچھا کہ یہ لڑکی تمہاری کیا لگتی ہے تو مقتول نے کہا کہ لڑکی نہیں لڑکا ہے اور بیمار ہے۔ کمالے نے بتایا کہ صاف نظر آرہا تھا کہ یہ لڑکی ہے۔ مختصر یہ کہ دونوں اُستاد تھے۔ دیوا اچھی تو آسمان سے تارے توڑنے والا

اُستاد تھا۔ دونوں بھانپ گئے۔ دلیوے کے مجرم دماغ نے فوراً اسکیم تیار کر لی اور انہوں نے لڑکی بالکل اُسی طرح اُٹھائی جس طرح مَیں دوسرے مجرموں کی زبانی سُنا چکا ہوں۔ اس سے آگے یوں ہُوا کہ مقتول کو راستے میں اُتار کر انہوں نے لاری چلائی تو لڑکی نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ دلیوے نے چاقو کی نوک اُس کی گردن پر رکھ دی۔ لڑکی نے کہا کہ میری گردن کاٹ دو مجھے قتل کر دو۔ انہوں نے کپڑے سے اُس کا منہ باندھ دیا۔

دریا کے پار قصبے سے چھ میل دُور ایک گاؤں تھا جہاں دیوے ماچھی کا ایک ٹھکانہ تھا۔ جہاں تک لاری جا سکتی تھی وہ لے گئے۔ ڈیڑھ ایک میل فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہاں سے دلیوے نے لڑکی کو کندھوں پر اُٹھا لیا۔ لاری وہیں چھوڑ کر کمالا اُس کے ساتھ گیا۔ انہوں نے لڑکی کو باری باری اُٹھایا اور اپنے ٹھکانے میں پہنچ گئے۔ کمالا واپس آ گیا کیونکہ اُسے لاری واپس کرنی تھی۔ اُس جنگل بیابان میں کوئی دیکھنے والا نہ تھا کہ لاری اِدھر کیوں آئی ہے۔

کمالا لاری واپس اڈے پر لے آیا۔ اُسے کوئی دو گھنٹے لگے۔ لاری کے ڈرائیور نے بھی بتایا تھا کہ کمالا لاری دو گھنٹے بعد لایا تھا۔ کمالا پیدل دیوے ماچھی کے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ اُسے اپنا حصّہ وصول کرنا تھا۔ دونوں نے لڑکی کو بہت پریشان کیا۔ اُس کے زیورات تقسیم کر لیے۔ ایک رات میں لڑکی کئی بار بے ہوش ہوئی۔ دیوے ماچھی نے کمالے کو بتایا کہ وہ صبح اپنے ایک آدمی کو پٹیالہ بھیجے گا۔ وہاں سے وہ گاہک لائے گا۔ ظاہر ہے کہ گاہک مہاراجہ پٹیالہ کے آدمی ہوں گے۔ دیوے نے یہ بھی کہا تھا کہ ان گاہکوں سے سودا نہ بن سکا تو وہ کوئی اور گاہک دیکھے گا۔ ایسے مال کو ساتھ لیے پھرنا خطرناک تھا۔

دیوے ماچھی نے کمالے سے کہا کہ وہ واپس چلا جائے۔ مال فروخت ہوتے ہی اُس کا حصّہ اُسے مل جائے گا۔ کمالا صبح کے وقت وہاں سے واپس آیا۔ دیوے نے اُسے یہ بھی

کہا تھا کہ اڈّے والوں کو پکّا رکھنا اور پولیس کی بھی خبر رکھنا۔ گڑبڑ کا خطرہ ہو تو قبل از وقت اطلاع دے دینا۔ کمالے کو دلیوے ماچھی پر بھروسہ تھا۔ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ لڑکی ابھی اسی گاؤں میں ہو گی۔ گاہکوں کو دُور سے آنا تھا۔ کمالا اگلی شام بھی گاؤں گیا اور دوسرے دن واپس آیا۔

یہ وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ مَیں نے تھانے کا چارج رگھوناتھ کو دیا۔ کمالے سے گاؤں کا محلِ وقوع سمجھا۔ راستہ سمجھا۔ لڑکی جس مکان میں تھی وہ معلوم کیا اور بارہ کانسٹیبل رائفلوں سے مسلّح تیار کیے۔ تین تانگے منگوا لیے۔ کمالے کو حوالات میں بند کر دیا۔ سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹہ بعد مَیں نے اپنی پارٹی تانگوں میں بٹھائی اور روانہ ہو گئے۔ گاؤں سے ایک میل دُور تانگے روکے۔ تانگہ بانوں کو وہیں انتظار کرنے کو کہا اور ہم پیدل چل پڑے۔ مَیں نے اپنی پارٹی کو حملہ اور گھیرا کرنے کی سکیم سمجھا رکھی تھی۔ تیز روشنی والی ٹارچیں بھی ساتھ تھیں۔

یہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا جس پر گہری نیند طاری تھی۔ ایک آواز آئی "کون ہو اوئے؟ اِدھر آؤ"۔۔۔ مَیں آگے گیا۔ فائدہ یہ تھا کہ چاندنی تھی۔ یہ آدمی دلیوے ماچھی کا چوکیدار معلوم ہوتا تھا۔ مَیں اُس کے قریب گیا تو اُس نے وردی سے مجھے پہچانا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ مَیں نے ریوالور اُس کے سینے پر رکھ کر پوچھا ۔۔۔ "دلیوا ماچھی کہاں ہے؟"

ایک کانسٹیبل آ گیا۔ اُس کے پاس رائفل تھی۔ مَیں نے اس آدمی سے کہا ۔۔۔ "جلدی بتاؤ دلیوا کہاں ہے۔ اس گاؤں میں اتنے آدمی نہیں جتنی پولیس آ گئی ہے"۔

اُس نے بتا دیا۔

وہ کچّا مکان تھا جیسے دیہات میں ہوتے ہیں۔ صحن کی دیوار چھ فٹ کے لگ بھگ

اُونچی تھی۔ مَیں نے اس آدمی سے معلوم کر لیا تھا کہ وہ دلیوے کا چوکیدار ہے۔ یہ غریب سے کسانوں کا گاؤں تھا جو دلیوے ماچھی جیسے ڈکیتوں کا حکم مان سکتے تھے اُن کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔

مَیں نے دلیوے کے چوکیدار سے کہا کہ دلیوے کو آواز دے کر باہر بلاؤ۔ کہو کوئی دوست آیا ہے۔ مَیں نے دو کانسٹیبلوں کو دروازے کے اِدھر اُدھر چھپا دیا اور خود دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اُس آدمی نے دلیوے کو آواز دی اور باہر آنے کو کہا۔ دروازہ کھُلا۔ دلیوا باہر آیا ہی تھا کہ میرے ریوالور کی نالی اُس کے پہلو کے ساتھ لگ گئی اور تین کانسٹیبلوں نے اُسے گھیر لیا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ وہ دلیوا ماچھی ہی تھا۔ مَیں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسے پکڑ لیا اور فوراً ہتھکڑی لگا لی۔ گاؤں کے لوگوں کو جگایا۔ اُن میں سے دو جو ذرا سیانے تھے انہیں لڑکی کی برآمدگی کا مشیر (گواہ) بنایا اور دلیوے سے کہا کہ مجھے لڑکی کے پاس لے چلو۔

"تمہیں کمالے نے بھیجا ہے؟" — دلیوے ماچھی نے مجھ سے پوچھا۔

مَیں نے پوری طاقت سے اُس کے منہ پر گھونسہ مارا۔ ایک کانسٹیبل نے اُس کے کولہے پر رائفل کا بٹ مار کر کہا "ملک صاحب نے تمہیں کیا حکم دیا ہے؟"

وہ اندر کو چل پڑا۔ مَیں اُس کے پیچھے گیا۔ کمرے میں لڑکی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ شراب ، بوتل پڑی تھی۔ لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ اُس نے دیکھا کہ پولیس آ گئی ہے تو وہ اُٹھی مگر حُسن کا سر ڈول گیا اور وہ بہوش ہو کر گر پڑی۔ یہ غیر متوقع اور اچانک نجات ملنے کا اثر تھا۔ لڑکی برآمد ہو گئی۔ اُس ریورات بھی دلیوے ماچھی نے نکال دیئے۔ مَیں نے مشیرنامہ تیار کیا۔ مشیروں کے دستخط لیے اور انہیں سمجھایا کہ انہیں گواہی کے لیے طلب کیا جائے گا۔ لڑکی کو مَیں ہوش میں لایا اور ہم کامیابی سے تھانے کو روانہ ہوئے۔ تانگے انتظار میں کھڑے تھے۔

کالی چھپکلی اور ریت کے رُستم

آدھی رات گزر گئی تھی جب ہم تھانے میں پہنچے۔ لڑکی اور دلیوے ماچھی کی حراست [illegible] کا انتظام کر کے مَیں نے مزید کارروائی صبح تک کے لیے ملتوی کر دی۔ صبح پہلا کام یہ کیا کہ کمالے سے زیورات برآمد کر لیے جو اُس نے ابھی بیچے نہیں تھے۔ ملزموں کا ریمانڈ لیا۔ لڑکی کے بیانات تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے اُن بیانات کی تصدیق کی جو دوسرے ملزم دے چکے تھے۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت بہت بُری تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ پاگل ہو جائے گی یا موقعہ ملا تو خودکُشی کر لے گی۔ وہ آخر پردہ دار لڑکی تھی۔ اُسے جب یہ بتایا کہ جس کی خاطر اُس نے اتنا سنگین جُرم کیا اور پاگلوں کی سی دلیری کا مظاہرہ کیا ہے وہ قتل ہو گیا ہے تو وہ اتنا روئی کہ اُس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ مَیں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مقتول کا قاتل کون ہے۔ لڑکی نے کمالے اور دلیوے ماچھی کے خلاف میرا شک رفع کر دیا۔ قتل کے وقت یہ دونوں گھر میں [illegible] لڑکی کے پاس تھے۔ میرے لیے اب قتل کا معمہ رہ گیا تھا۔

اگر کمالا اور دلیوا قاتل نہیں تھے تو دُلہا اور اُس کے چچازاد بھائی ہو سکتے تھے۔ [illegible] نے ارشاد کو چاندی کا تعویذ جو مقتول کی لاش سے [illegible] برآمد ہوا [illegible] دکھا کر پوچھا کہ [illegible] کا تو نہیں؟ اُس نے دیکھ کر کہا "مقتول نے کبھی تعویذ نہیں باندھا تھا" — اُس نے غور سے دیکھا اور وثوق سے کہا "یہ کالی چھپکلی کا ہے۔ [illegible] اُس کے چچازاد بھائیوں کو [illegible] جانتا ہوں وہ بھی گلے میں تعویذ نہیں ڈالتے۔"

میرا دل مان نہیں رہا تھا کہ کالی چھپکلی اتنی جرأت کر سکتا ہے۔ لیکن انسان کی فطرت کو اندر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ذہن پر زور دیا تو مجھے قبولو کا بیان یاد آ گیا۔ دُلہا کے [illegible]

اُس نے کہا تھا کہ دُلہن کے اغوا کے اگلے روز دُلہا کو یہ کہتے سُنا گیا تھا ـ" مَیں جانتا ہُوں۔ مَیں جانتا ہوں۔ جو اللہ کو منظور ہوگا۔ ساری دُنیا دیکھے گی"۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ارشاد نے بتایا تھا کہ مقتول نے اُسے طعنے دیئے تھے۔ یہ طعنے ایسے تھے جو اشتعال کا باعث بنے ہوں گے۔ مَیں نے محض شک پر کالی چھپکلی کو تھانے بلایا۔

وہ آیا تو مَیں نے سب سے پہلے اُس کی جوتی دیکھی۔ یہ اُس کے کھُرے کے مولڈ میں فِٹ آگئی۔ کھوجی کو بُلایا۔ اُس نے جوتی کا تلوا دیکھا تو کھُرے میں اُس نے سلائی میں جو خصوصیت نوٹ کی تھی وہ جوتی میں نظر آگئی۔ جس وقت ہم اُس کی جوتی اُتروا کر دیکھ رہے تھے اُس وقت اُس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ اُس کی زبان تھتھیانے لگی اور مَیں نے دیکھا کہ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"گلے کا تعویذ کہاں ہے؟" ـــ مَیں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ بیوقوفوں کی طرح میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ مَیں نے تعویذ اُس کے آگے رکھ دیا اور کہا ـــ "یہ ہے تمہارے جُرم کا ثبوت"۔ ـــ پھر مَیں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں شروع کر دیں۔ قاتل ہونے کے باوجود اُسے بےگناہ اور مظلوم کہا۔ ایسی بہت سی باتیں کہیں جن سے وہ موم ہو گیا۔ بہت سی جھک جھک اور طرح طرح کی باتوں کے بعد مَیں نے اُسے اقبالِ جُرم کے لیے تیار کر لیا۔

اُس نے اپنے طویل بیان میں کہا کہ اُس کی شکل و صورت، جسم اور رنگ کی وجہ سے اُسے دھتکارا گیا۔ لڑکی نے بھی اسے کالی چھپکلی کہا۔ وہ جسے چاہتی تھی اُس نے بھی اُسے طعنے دیئے۔ اُس نے کہا ـــ "وہ جس کے ساتھ بھاگ گئی تھی اُس نے مجھے کہا کہ اب اپنے جیسی کوئی اور ڈھونڈ لو۔ مَیں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ وہ یہیں موجود ہے تو میری دُلہن بھی یہیں

ہوگی۔ آپ نے مجھ سے پوچھا تھا تو مَیں نے کسی پر شک ظاہر نہیں کیا تھا۔ اُس وقت مجھے معلوم تھا کہ وہ کس کے ساتھ گئی ہے۔ مَیں نے موقع تلاش کرنا شروع کر دیا۔"

اُسے خیال آگیا کہ مقتول بہت سویرے اکھاڑے میں ورزش کے لیے جاتا ہے۔ اگلے دن وہ ادوائن کی گز بھر رسّی لے کر بہت سویرے گھر سے نکل گیا۔ رات وہ اُسی کمرے میں سویا تھا جہاں سے اُس کی دُلہن غائب ہوئی تھی۔ سحر کے وقت اُٹھا اور دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ وہ میدان میں گیا اور اکھاڑے کے قریب ایک درخت کے پیچھے چھُپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مقتول آیا۔ اُس نے کپڑے اُتارے اور جسم کی مالش کی۔ وہ ڈنٹر پیلنے لگا تو دُلہا دبے پاؤں اُس کے پیچھے جا پہنچا۔ رسّی کے دونوں سرے ہاتھوں میں پکڑ کر اُس کے پیچھے سے رسّی مقتول کی گردن میں پھینکی۔ مقتول کے سنبھلنے تک اُس نے تیزی سے رسّی کو مروڑ کر بڑا تنگ پھندا بنا دیا۔

مقتول کے مقابلے میں قاتل کا جسم کچھ بھی نہ تھا مگر اُس کی گردن پھندے میں آگئی تھی اور قاتل رسّی کو ابھی تک مروڑ بھی رہا تھا اور جھٹکے بھی دے رہا تھا۔ مقتول نے ایک بار زور لگایا۔ قاتل نے بیان میں کہا کہ رسّی اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ چلی تھی۔ مقتول نے ایک ہاتھ پیچھے کر کے قاتل کی گردن پکڑنے کی کوشش کی لیکن اُس کے ہاتھ میں تعویذ کا دھاگہ آگیا جو ٹوٹ گیا۔ اس کے فوراً بعد مقتول کا جسم ڈھیلا ہو گیا۔ قاتل نے پھندا اور زیادہ تنگ کر کے زور زور سے جھٹکے دیئے۔ مقتول گر پڑا۔ قاتل نے رسّی وہیں چھوڑ دی۔ تعویذ کا اُسے خیال نہ رہا اور وہ اکھاڑے سے گزر کر گھر چلا گیا۔ گھر والے ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور لیٹ گیا۔

قاتل کا جُرم ثابت کرنا آسان نہیں تھا لیکن وہ عدالت میں اپنے اقبالی بیان سے منحرف نہیں ہُوا۔ مَیں نے جو گواہیاں پیش کیں وہ اشتعال ثابت کرتی تھیں۔ موقعہ کا کوئی

گواہ نہ تھا۔ اُسے سات سال سزائے قید دی گئی۔ ہائی کورٹ نے اپیل میں اُسے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ کمالے اور دیوے ماچھی کو اغوا اور آبروریزی کی دفعات کے تحت مجموعی طور پر گیارہ گیارہ سال سزا دی گئی۔ ارشاد کو اعانتِ جُرم میں چھ ماہ اور قبولو کو تین سال۔ جمیلہ بے شک مظلوم تھی لیکن وہ ملزم بھی تھی۔ مَیں اُسے معاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس معاملے میں قانون بڑا ڈھیلا ہے۔ سزا اُس آدمی کو ملتی ہے جو لڑکی کو یا کسی کی بیوی کو ورغلا کر لے جائے۔ مَیں نے سوچا کہ جمیلہ بچ گئی تو اس سے اُن بیویوں کو شہ ملے گی جو خاوندوں کو ناپسند اور کسی اور کو پسند کرتی ہیں۔ مَیں نے اُسے دھوکہ دہی کے الزام میں پیش کیا تھا لیکن وہ بچ گئی۔ وہ بہت ہی بُری اور شرمناک سزا بھگت چُکی تھی۔ یہ سزا کیا کم تھی کہ وہ برادری سے ہمیشہ کے لیے دھتکاری گئی تھی۔

وہ دلیر تھا یا بیوقوف

اگر ایک کنواری لڑکی اپنی شلوار کو خون لگا کر سارے گاؤں کو یہ دھوکہ دینے کے لیے راستے میں پھینک سکتی ہے کہ اس کی آبروریزی ہوئی ہے اور وہ قتل ہوگئی ہے تو فوج کا ایک نائک تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔

یہ واردات پاکستان سے ڈیڑھ ایک سال پہلے کی ہے۔ واردات کا علاقہ پاکستانی ہے۔ متعلقہ افراد بقیدِ حیات ہیں، اس لیے مَیں کسی گاؤں کا نام نہیں لکھوں گا۔ افراد کے نام اصلی کی بجائے فرضی استعمال کر رہا ہُوں۔ مَیں اُس وقت واردات کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا اور یہ تھانہ دیہاتی علاقے کا تھا۔

پنجاب کے دیہاتی علاقوں کی تھانیداری سے اللہ بچائے۔ برادریوں کے مابین خاندانی دشمنیوں پر قتل اور خون خرابے روزمرّہ کا معمول ہیں ــــ اللہ کا فضل" توخوب ہوتا ہے۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رشوت دیتے ہیں لیکن ہر ایک کیس گول نہیں کیا جا سکتا۔ مقدمہ تو قائم کرنا ہی پڑتا ہے۔ استغاثہ کمزور کر کے ملزم کو چھڑا لیا جاتا ہے۔ البتہ انگریزوں کے زمانے میں یہ کام بہت مُشکل تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ اکٹھے کام کرتے تھے چغلی کا ڈر رہتا تھا۔ انگریز افسر اچانک تھانوں پر جا دھمکتے تھے اور زیرِ تفتیش وارداتوں کی بال کی کھال اتارنے بیٹھ جاتے تھے۔ اس لیے ہر واردات کی تفتیش سوچ سمجھ کر اور پوری محنت سے کی جاتی تھی۔

میرا تھانہ ایسے ہی ایک علاقے میں تھا۔ قتل کے سات مقدمے کورٹ میں چل رہے

تھے اور نو زیرِ تفتیش تھے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر پکّا فرعون تھا۔ پولیس کا تو دشمن تھا۔ جب دورے پر آتا تھا تو کانسٹیبلوں کے پرائیویٹ بکس بھی کھول کر دیکھا کرتا تھا۔ پولیس کپتان بھی انگریز تھا۔ تھانیداروں کو واردات سُنا کر ان کا امتحان لیتا تھا۔ اُردو بولتا تھا لیکن ماں بہن کی گالیاں پنجابی زبان میں دیا کرتا تھا۔ زیرِ تفتیش کیسوں کی کارگزاری اور روزنامچہ پوری توجہ اور غور سے دیکھتا تھا۔ ذراسی سُستی یا ہیرا پھیری نظر آئے تو معطّل کر دیتا تھا۔

اُدھر ہمارے دیہات کے مسلمان بھائیوں کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے کے مویشی چرانے، مویشیوں کو زہر دینے، کھلیان جلانے، ایک دوسرے کی عورتیں اغوا کرنے اور قتل کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمارے لیے یہ مُشکل پیدا کر دیتے تھے کہ تفتیش میں ذرا بھر تعاون نہیں کرتے تھے۔ گاؤں کا بچّہ بچّہ اس طرح بُدھو بن جاتا تھا جیسے ان کے گاؤں میں کوئی واردات ہوئی ہی نہیں۔ اصل مجرم کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی یہ لوگ تفتیش میں کوئی مدد نہیں کرتے تھے کیونکہ اسے وہ گاؤں اور برادری کے خلاف غدّاری سمجھتے تھے۔ ان حالات میں پولیس کو جادوگری کرنی پڑتی تھی۔ ساری تفتیش اندھیرے میں ہوتی تھی۔ تھانیداروں کو عقل اور خود فراست کے زور پر سراغرسانی کرنی پڑتی تھی۔

لڑکی غائب شلوار موجود

وہ ایسے ہی حالات تھے جن میں ایک روز میرے تھانے میں یہ رپورٹ درج کرائی گئی کہ عائشہ نام کی ایک لڑکی، عمر بیس سال دو روز سے لاپتہ ہے۔ گاؤں سے نصف میل دُور ایک کھڈ سے اُس کی شلوار ملی ہے۔

رپورٹ درج کرانے والا اُس کا باپ تھا۔ اس کے ساتھ لڑکی کا چچا تھا۔ لڑکی کنواری

بتائی گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ شلوار کا رنگ آسمانی ہے اور اس پر خون کے داغ دھبے ہیں۔ انہوں نے شلوار موقعہ واردات پر ہی پڑی رہنے دی تھی۔

عائشہ کے باپ سے تمام تر ضروری معلومات لی گئیں۔ میرے کچھ سوال ایسے تھے جن کا جواب کوئی بھی باپ صحیح نہیں دیا کرتا۔ مثلاً یہ سوال کہ کیا لڑکی کو گاؤں کے کسی آدمی کے ساتھ کبھی دیکھا گیا تھا یا گاؤں کے کسی آدمی کو لڑکی ایسی ہی نظروں سے دیکھتی تھی یا گاؤں کے کسی آدمی پر کبھی شبہ کیا گیا تھا کہ وہ لڑکی میں غیر معمولی دلچسپی لیتا ہے؟ اکثر والدین قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے ہیں کہ ان کی لڑکی نیک پاک ہے۔ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی بلکہ اسے زبردستی اغوا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس راز سے پولیس کو اپنی کوششوں سے پردہ اٹھانا پڑتا ہے کہ لڑکی کتنی کچھ نیک پاک ہے۔

میں دو کانسٹیبلوں کو ہمراہ لے کر اُس مقام پر گیا جہاں شلوار پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا۔ اس کے بالائی حصے پر خون کے تین دھبے تھے۔ شلوار پر خون یہ گواہی دیتا تھا کہ لڑکی کی آبرو پر حملہ کیا گیا ہے لیکن شلوار برآمد ہونے والی جگہ پر تشدد اور زبردستی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ واردات دو روز پہلے ہوئی تھی۔ بارش بھی نہیں برسی تھی اور آندھی بھی نہیں چلی تھی۔ وہاں مٹی تھی۔ پاؤں کے کچھ نشان موجود تھے۔ کھوجی بلائے گئے۔ انہوں نے کھرا اُٹھایا۔ یہ دو انسانوں کے پاؤں کے نشان تھے۔ ایک کھوجی بوڑھا اور بہت تجربہ کار تھا۔ اُس نے یہ رائے دی کہ ایک کھرا عورت کا ہے اور دوسرا مرد کا۔ وہ اس طرح یہاں سے گزرے تھے کہ مرد آگے اور عورت پیچھے تھی۔ دونوں کھرے بتاتے تھے کہ وہ شلوار کے قریب سے گزر گئے ہیں۔ وہاں رُکے نہیں۔

کھوجی ہماری بہت مدد کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی نظریں زمین کے اندر چلی جاتی ہیں۔ کسی ملزم کے کھرے کا ذرا سا نشان نظر آجائے تو یہی

ان کے لیے کافی ہوتا تھا۔ آج کل ان کی قدر و قیمت ختم ہو گئی ہے۔

کھرے یا پاؤں کے نشان، شلوار کے پاس رُکے نہیں تو یہ سوال پیدا ہوا کہ لڑکی پر تشدد کس جگہ کیا گیا؟ اور اگر اسے قتل کیا گیا ہے تو لاش کہاں ہے؟ لیکن جو سوال میرے ذہن پر غالب آگیا، وہ یہ تھا — "کیا واقعی لڑکی کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے اور کیا واقعی اسے قتل کر دیا گیا ہے؟" اگر اس کی شلوار پھینک دی گئی ہے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنی رضامندی سے گھر سے نہیں نکلی نہ ہی وہ کسی آشنا کے ساتھ گئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو شلوار اُس کے ساتھ ہوتی۔

نمبردار میرے ساتھ تھا جو اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس سے پوچھا کہ گاؤں کا کوئی آدمی لاپتہ تو نہیں؟ اس نے کہا "نہیں"۔

دو کھوجی جھکے ہوئے زمین پر اس طرح کھرے دیکھنے لگے جس طرح بو گیر کتے شکار کی بو سونگھتے اور ادھر اُدھر بھاگتے دوڑتے ہیں۔ کھوجی بیٹھ جاتے تھے اور نظریں زمین پر گاڑ دیتے تھے۔ وہ مٹی سے بھید لے رہے تھے۔ میں وہیں کھڑا لڑکی کے باپ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

"گاؤں میں کسی کے ساتھ عداوت ہے؟" — میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواب دیا کہ برادری کے ایک خاندان کے ساتھ عداوت چلی آرہی ہے۔

"لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے یا کسی سے وعدہ کیا تھا؟"

"جی، اسی خاندان میں لڑکی کی منگنی ہوئی تھی" — باپ نے جواب دیا — "پھر ہم نے جواب دے دیا"

"کیوں؟"

"برادری کہتی تھی کہ دشمنوں کو لڑکی نہ دو" — اُس نے جواب دیا۔

"لڑکے والوں نے پھر کیا کیا تھا؟"

"انہوں نے دھمکی دی تھی کہ لڑکی کی ڈولی ہمارے سامنے نہیں اُٹھے گی"۔ باپ نے کہا اور یہ بھی بتایا کہ یہ کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔

لاش ملی لیکن لڑکی کی نہیں

چارپائیاں وہیں آگئی تھیں۔ گاؤں والوں کا ایک ہجوم وہاں اکٹھا ہو گیا تھا۔ میٹھے دودھ کی ایک بالٹی بھی آگئی تھی۔ مَیں نے نمبردار سے کہا کہ وہ اُس لڑکے کے باپ کو بلائے جس کے ساتھ لڑکی کی منگنی ہُوئی اور توڑی گئی تھی۔ وہ تماشائیوں کے ہجوم میں نہیں تھا۔ اتنے میں میرا وہ مخبر میرے پاس آگیا جسے مَیں نے گاؤں میں بھیج دیا تھا۔ اس نے میرے کان میں اپنی رپورٹ دی۔ مَیں نے شلوار ایک کانسٹیبل کو دے کر تھانے بھیج دیا تاکہ وہ اسے ڈاکٹری معائنے کے لیے بھیجنے کے لیے کاغذات اور پارسل تیار کرے۔

اُس لڑکے کا باپ آگیا جس کے ساتھ لڑکی کی منگنی کر کے توڑی گئی تھی۔ مَیں نے فالتو لوگوں کو دُور ہٹا دیا اور اس سے پوچھا "اکبر کہاں ہے؟" — اکبر اُس کے بیٹے کا نام تھا۔

"اکبر....." وہ گھبرا گیا — "وہ ...."

"وہ تین دن ہُوئے گھر سے غیر حاضر ہے" — مَیں نے اُس کا فقرہ مکمل کر کے اس کی مشکل آسان کر دی۔

"جی۔ جی" — اُس نے ہکلا کر کہا — "وہ آجائے گا۔ بچہ تو نہیں کہ گُم ہو جائے گا"

"جی۔ وہ بچہ بالکل نہیں" — مَیں نے کہا — "اُس نے تمہاری دھمکی پر عمل کیا ہے۔"

"دیکھو چوہدری! ہیرا پھیری چھوڑ دو۔ مَیں تم پر سیدھا سوال کرتا ہوں [illegible] سیدھا جواب [illegible] جان چھڑاؤ۔ مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ مقدمے میں پوری مدد کروں گا [illegible]"

"اللہ پاک کی قسم ہے" — اُس نے جواب دیا — "پیر دستگیر [illegible] قسم ہے، مجھے کچھ بھی علم نہیں۔ لڑکے کا تیسرا دن ہے گھر نہیں آیا"

"اور تیسرا ہی دن ہے کہ لڑکی بھی گھر نہیں آئی [illegible] مخاطب ہو کر کہا — "اور دو روز بعد کافر کا بچہ پولیس کہتا [illegible]"

"اگر تم لڑکی واپس کر دو تو مَیں راضی نامہ کرا دوں گا [illegible] سے کہا — "پر پتہ چلا نہیں کروں گا" [illegible]

"دیکھو چوہدری! چار سال گزرے اِن لوگوں نے لڑکی والوں نے [illegible] لیکن چھ سات روز بعد واپس کر دی تھی۔ تم بھی واپس کر دو۔"

اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ یہ خبر مجھے مخبر نے دی تھی۔ لڑکے کا باپ [illegible] بھی چھپانا چاہتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی چند ایک باتیں [illegible] مجھے گمراہ کرنے کے [illegible] چار سال گزرے اس کی بھتیجی اس لڑکی کے ماموں [illegible] معاملات کی بنا پر اغوا [illegible] سے واپس کر دی گئی۔ اب ظاہر یہی ہوتا تھا کہ ان [illegible] نے انتقاماً لڑکی کو اغوا کیا ہے [illegible] اس پر مجرمانہ حملہ بھی کیا ہے۔

اس علاقے میں کھڈ اور خشک ندی نالے عام تھے [illegible] بیٹھا تفتیش کر رہا تھا اور کھوجی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ دو گھنٹے گزر گئے [illegible] نے تھوڑی دُور دیکھا تھا کہ گدھ اُتر رہے ہیں۔ پھر مَیں نے وہاں درختوں پر بھی گدھ بیٹھے ہوئے دیکھے تھے مگر مَیں نے اس لیے توجہ نہ دی کہ کوئی مُردار ہوگا۔ میرے لیے گدھ کوئی [illegible]

نئی چیز نہیں تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ اُس طرف سے دونوں کھوجی بہت تیز تیز چلے آرہے تھے اور بُوڑھا کھوجی چادر ہلا رہا تھا۔ وہ ہمیں بلا رہا تھا۔

مَیں اُن کی طرف چل پڑا۔ ہم ان کے قریب پہنچے تو وہ کچھ کہے بغیر آگے آگے چل پڑے۔

وہاں سے بنجر اور کھڈوں کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ علاقہ اتنا بنجر تھا کہ مویشی بھی اُدھر نہیں جاتے تھے۔ عام راستوں سے بہت ہٹا ہُوا تھا۔ کھوجی ایک جگہ رُک گئے۔ وہاں گِدھوں کا ایک غول اِدھر اُدھر بیٹھا تھا اور کھوجی پتھر اٹھا اٹھا کر نیچے مار رہے تھے اور نیچے سے گِدھ اُڑ کر باہر آرہے تھے۔

مَیں نے جا کر دیکھا۔ ایک نشیبی جگہ ایک لاش پڑی تھی اور اس کے قریب ایک کلہاڑی رکھی ہوئی تھی۔ پہلی نظر سے مَیں نے یہی سمجھا کہ لڑکی کی لاش ہے لیکن یہ کسی آدمی کی تھی۔ لاش کی حالت یہ تھی کہ پیٹ گِدھوں نے چیر پھاڑ کر اندر سے کھا لیا تھا۔ سینہ بھی کھا لیا تھا۔ پسلیاں ننگی ہوگئی تھیں۔ بازو اور ٹانگیں الگ ہو چکی تھیں اور دھڑ کے قریب ہی پڑی تھیں۔ ان کا زیادہ تر گوشت گِدھوں اور گیدڑوں وغیرہ نے کھا لیا تھا۔ ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ آنکھیں گِدھوں نے نکال لی تھیں۔ صرف چہرہ اور سر سلامت تھا۔ لاش کو دیکھ کر پہلے تو سب پر سنّاٹا طاری ہوگیا۔ کسی کی اُونچی سانس بھی نہیں نکلتی تھی۔ اس خاموشی میں ایک آدمی کی دھاڑ توپ کی طرح سنائی دی۔

یہ دھاڑ اکبر کے باپ کی تھی اور لاش اکبر کی تھی ــــ یہ وہی نوجوان تھا جس کے ساتھ گمشدہ لڑکی کی منگنی ہُوئی اور ٹوٹی تھی اور اسی کے متعلق میرے دل میں یہ شک پیدا ہُوا تھا کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا ہے اور انتقاماً اُس پر مجرمانہ حملہ کر کے قتل کر دیا ہوگا مگر وہاں

اُس کی اپنی لاش پڑی تھی۔ مَیں تو لڑکی برآمد کر کے واپس کرانا اور کیس وہیں ختم [illegible] رہا تھا لیکن یہاں قتل کا ایک اور کیس رجسٹر کرنا پڑا۔

بات جو ایک عام ذہن کے آدمی کو بھی سمجھ آسکتی تھی، یہی تھی کہ اس مقتول [illegible] لڑکی کو اغوا کیا اور اُسی روز یا دوسرے روز لڑکی کے لواحقین [illegible] عام ذہن کا نہیں تھا۔ پولیس کو مقدمہ قائم کرنا پڑتا ہے جس کے لیے استغاثہ مضبوط اور [illegible] ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے گواہوں اور ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ عدالت [illegible] پولیس کے منہ پر تھوک کر مقدمہ خارج کر دیتا ہے اور یہ تو اکثر ہوتا تھا کہ سیشن جج اپنے [illegible] یہاں تک لکھ دیتے تھے کہ تفتیش کرنے والے تھانیدار نے دانستہ کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے۔

دوسری لاش کی تلاش

اس لاش کے ٹکڑے اکٹھے کرائے اور پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کا انتظام کر [illegible] نے یہ دیکھا کہ لاش کی کھوپڑی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کلہاڑی کے ساتھ بال چپکے ہوئے تھے۔ [illegible] اسی کلہاڑی سے قتل کیا گیا تھا۔

مجھے امید تھی کہ مقتول کا باپ جو اپنے جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا [illegible] ذہنی حالت میں کوئی کام کی بات بتا دے گا۔ مَیں نے اس سے بہت سوال پوچھے۔ [illegible] جرح کی لیکن اس نے ــــ "مجھے کچھ پتہ نہیں"ـــــ کے سوا کچھ بھی نہ کہا۔ صرف یہ پتہ چلا کہ یہ کلہاڑی مقتول کی تھی۔ دستہ نیا اور پر بنوایا گیا تھا اور اس پر تین چار رنگ کیے گئے تھے [illegible] انہی سے کلہاڑی پہچانی گئی تھی اور اسی کلہاڑی کے ساتھ بال تھے اور خون بھی جما ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے اس کلہاڑی سے مقتول نے قاتل پر وار کیا

ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی سوچا کہ یہ کلہاڑی یقیناً سر پر ماری گئی ہے۔ اگر یہ قاتل کے سر میں اُتری ہے تو وہ بھی زندہ نہیں ہوگا اور اگر وہ زندہ ہے تو دیکھنا پڑے گا کہ کون ہے اور کہاں ہے؟

میں نے لوگوں کو یہ کہہ کر دوڑایا کہ اِدھر اُدھر جا کر دیکھو کہیں کوئی اور لاش تو نہیں پڑی؟ کھوجیوں سے کہا کہ وہ اپنی کارروائی کریں۔

گھنٹہ بھر کی تلاش سے کہیں کوئی اور لاش نہ ملی۔ البتہ کھوجیوں نے مجھے ساتھ لے جا کر پاؤں کے بُجھے بُجھے نشانات سے واردات کا ایک منظر دکھایا جو اس طرح تھا ــــ خُون کے خشک قطرے کھڈ سے نکلے اور آگے چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھ پاؤں کے نشان کھڈ کی طرف آتے تھے۔ مقتول کھڈ کی طرف آ رہا تھا اور اس کا خون زمین پر گر رہا تھا۔ ایک جگہ مٹی نرم تھی۔ کھُرا بتاتا تھا کہ یہاں مقتول رُکا تھا۔ ہم آگے گئے۔ مقتول چلا آ رہا تھا اور آگے گئے اور کھوجیوں نے مجھے ایک جگہ روک لیا۔

میں نے زمین دیکھی۔ پاؤں کے بے شمار نشان اس طرح گڈمڈ تھے جیسے دو تین آدمی یہاں ناچتے رہے ہوں۔

"یہاں لڑائی ہُوئی تھی" ــــ بوڑھا کھوجی بولا۔

اس سے آگے خون کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خون وہاں سے کھڈ کی طرف آیا تھا۔ مقتول زخمی ہو کر گاؤں کی طرف آیا تھا اور اس نے گاؤں تک پہنچنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ یہ شارٹ کٹ تھا مگر زخم نے اسے اس کھڈ سے آگے نہ جانے دیا۔

شلوار پر خون، ایک معمّہ

قاتل کون تھا؟

ان حالات میں تھانیداروں کو مداریوں کے کرتب کرنے پڑتے ہیں جو [illegible] کر دماغ تھک جاتا ہے اور رات کو نیند بھی نہیں آتی، اور جب سر پر انگریز افسر ہوتے تھے اور عدالت میں بال کی کھال اتارنے والے صفائی کے وکیل بمع گواہانِ صفائی موجود ہوتے تھے اور جب تفتیش میں گاؤں کے لوگ ذرہ بھر تعاون نہیں کرتے تھے تو تھانیداروں کا جینا حرام ہو جاتا تھا۔ میرے لیے لڑکی کی گمشدگی کے ساتھ اس آدمی کا قتل جس پر اغوا کا شبہ کیا جا سکتا تھا، چکی کے دو پتھر بن گئے اور مجھے پیسنے لگے۔ میرے دماغ میں واردات کے جو پہلو اُٹھے وہ یہ تھے:

لڑکی کو مقتول اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔ لڑکی کے لواحقین نے اسے راستے میں جا لیا اور قتل کر دیا ــــ لڑکی مقتول کے ساتھ جا رہی تھی۔ راستے میں کوئی غنڈے بدمعاش لوگ ملے۔ انہوں نے مقتول کو قتل کر کے لڑکی کی آبروریزی کی اور اُسے اُٹھا کر لے گئے اور کہیں قتل کر کے لاش دبا دی ــــ لڑکی اپنی مرضی سے مقتول کے ساتھ جا رہی تھی ــــ لڑکی کسی اور کے ساتھ اپنی مرضی سے جا رہی تھی کہ اس کے سابق منگیتر مقتول نے دیکھ لیا اس نے لڑکی کو اس نامعلوم آدمی سے چھیننا چاہا اور لڑائی میں وہ مارا گیا ــ قاتل بھی زخمی ہُوا ــ قاتل کسی اور گاؤں کا رہنے والا تھا ــ مقتول کو لڑکی کے والدین نے قتل کیا اور لڑکی کو بھی قتل کر کے لاش کہیں غائب کر دی ــ لڑکی کی آبروریزی کی گئی لیکن میں نے یہ شُبہ بھی دل میں رکھا کہ لڑکی کی آبروریزی نہیں ہوئی اور شلوار اور اس پر خون پولیس اور والدین کو دھوکہ دینے کا ایک ڈھونگ ہے۔

میں تھانے میں چلا گیا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے شہر بھیج دی۔ شلوار کا پارسل [illegible] کانسٹیبل کے ہاتھ لاہور بھیج دیا۔ ساتھ ہی میں نے واردات کی ضروری تفصیل لکھ بھیجی [illegible]

کوواردات کے علاقے میں پھیلا دیا۔ کھوجی اپنا کام کرتے رہے۔ کھوجیوں کی حیثیت صرف اتنی ہوتی تھی کہ وہ تفتیش آسان کر دیا کرتے تھے یا یوں کہنا چاہیئے کہ اندھیرے میں پولیس کا ہاتھ پکڑ کر جہاں تک ان کا تجربہ ساتھ دیتا تھا رہنمائی کرتے تھے مگر عدالت میں ان کی شہادت کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً قانون کسی کھوجی کا اس قسم کا بیان قبول نہیں کرتا تھا کہ میں نے جو کھُرا دیکھا وہ اس ملزم کا تھا۔

کھوجیوں نے رات کے وقت مجھے یہ رپورٹ پیش کی کہ لڑکی کسی اور کے ساتھ گئی ہے اور ریلوے سٹیشن کی طرف گئی ہے۔ (یہ برانچ لائن کا چھوٹا سا سٹیشن تھا) مقتول وہاں تک ساتھ ہے جہاں لڑائی ہوئی ہے اور جہاں سے خون اور اُس کا کھُرا گاؤں کی طرف واپس گیا ہے اور کھڈ میں جا کر ختم ہو گیا ہے۔

میں سوچنے لگا ”کیا مجھے کھوجیوں پر بھروسہ کر کے تفتیش کو اس لائن پر ڈال دینا چاہیئے کہ لڑکی کسی اور کے ساتھ اپنی مرضی سے گئی ہے؟ مگر شلوار؟“

انگریزوں کی حکومت میں سرکاری دفتر، ڈاکٹر اور جس محکمے کے ساتھ بھی واسطہ پڑتا تفتیش کے معاملے میں پورا پورا تعاون اور فوری کارروائی کرتے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ تو مرے ہی دن مل گئی۔ لاہور سے شلوار والے خون کی تیسرے دن رپورٹ آگئی۔ مقتول کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ کلہاڑی کھوپڑی میں سوا تین انچ اُتری ہے۔ کلہاڑی کے ساتھ جو بال ہیں وہ مقتول کے معلوم ہوتے ہیں۔ مقتول کی پیٹھ پر دونوں شولڈر بلیڈوں کے درمیان کلہاڑی کا ایک آڑا زخم ہے اور ایک زخم گردن کے دائیں طرف ہے جو دو انچ گہرا ہے۔ معدے کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا کیونکہ معدہ گدھ کھا گئے تھے۔ چونکہ دل، پھیپھڑے، جگر، تلی وغیرہ نہیں تھے اس لیے موت کے وقت کا تعین نہیں کیا جا سکا — کام کی بات یہ معلوم ہوئی کہ کلہاڑی پر جو

خون ہے وہ مقتول کا ہے — گویا مقتول اپنی ہی کلہاڑی سے قتل ہُوا۔

لاہور سے شلوار پر لگے ہوئے خون کے متعلق جو رپورٹ آئی اس نے میرے کان کھڑے کر دیئے۔ لکھا تھا کہ خون جسم کے کسی اور حصے کا ہے۔ خون ایسی شہادت بالکل نہیں دیتا کہ لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ تفصیل سے دی گئی تھی جو ساری کی ساری سنانا ضروری نہیں۔ اس نے میرا شُبہ پختہ کر دیا کہ شلوار اور اس پر خون ایک ڈھونگ ہے۔ مگر یہ سوال پیچیدہ تھا۔ اس ڈھونگ میں لڑکی بھی شامل ہے یا اسے اغوا کرنے والوں نے پولیس کو تفتیش میں گمراہ کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لڑکی کے لواحقین نے اسے مقتول کے ساتھ نازیبا حالت میں دیکھ لیا اور مقتول کو بھی قتل کر دیا ہو اور لڑکی کو بھی قتل کر کے اس پر اس طرح پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہو کہ وہ لاپتہ ہو گئی ہے۔

بھائی اس بہن کا

جس روز شلوار کی رپورٹ آئی اُس روز پولیس کپتان بھی آگیا۔ اُس نے یہ کیس دیکھا تو کہنے لگا کہ بہت دلچسپ کیس ہے۔ اس نے اس وقت کی تفتیش کی تفصیل پوچھی اور پھر مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اب کیا کروں گا۔ میں نے اسے بتایا تو اللہ نے مجھ پر کرم کیا۔ اس کے ذہن میں بھی یہی لائن آئی تھی۔ اُس نے خوش ہو کر میری راہنمائی کی اور میں نے جو منصوبہ کے تمام کرتب دکھا کر اس پر ظاہر کیا کہ ”صاحب بہادر کا اقبال بلند ہو۔ میں اسی لائن پر چلنا چاہتا تھا۔“

حقیقت یہ ہے کہ اُس نے بہت سارے مشورے ایسے دیئے تھے جو میرے لیے نئے تھے اور میں نے نہیں سوچے تھے۔ خدا نے اُسے بڑا قابل دماغ دیا تھا۔

جب وہ واپس جانے لگا تو مجھے کہا — "تمہیں یہ لڑکی مل جائے گی" — پھر اُس نے مُسکرا کر کہا — "اگر تم لڑکی کو اور قاتل کو پکڑ لو تو مَیں تمہیں انگلینڈ سکاٹ لینڈ یارڈ میں بھیج دوں گا۔"

مَیں نے غلاموں کی طرح اُس کا شکریہ ادا کیا اور دل میں کہا — "تم اگر ذرا جلدی ٹل جاؤ تو یہی انعام کافی ہے" — مَیں نے پہلے سیلوٹ کیا اور جب اس کا گھوڑا چل پڑا تو مَیں مغلیہ دَور کے درباریوں کی طرح جھک کر کورنش بجا لایا۔ میرے محرّر نے جب کہا — "دفع ہو گیا ہے" — تو مَیں سیدھا ہُوا۔

مَیں مقتول اور گُم شُدہ لڑکی کے گاؤں چلا گیا۔ مخبروں سے کوئی ایک بھی کام کی بات معلوم نہ ہوئی۔ گاؤں کے لوگوں نے زبانوں کو تالے لگا لیے تھے۔ یہ دو خاندانوں کی عداوت کا معاملہ تھا اس لیے دوسرے خاندان کوئی بات بتا کر ان سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ مَیں نے ایک گھر کی ڈیوڑھی میں ڈیرہ ڈال دیا۔

لڑکی کے دو بھائی تھے۔ ایک چھوٹا، ایک بڑا۔ اس کا باپ تھا اور ایک چچا۔ مَیں نے انہیں بلا کر باہر بٹھا دیا۔ سب سے پہلے باپ کو اندر بلایا۔ اسے ہر طرف سے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ اصل بات پر نہ آیا۔ پھر اس کے چچا کو بلایا اور اسے اعتماد میں لینے کے سینکڑوں جتن کیے۔ اس نے ہر ایک سوال کا جواب خود اعتمادی سے دیا لیکن میرے مطلب کی ایک بھی بات اس کے منہ سے نہ نکلی۔

لڑکی کے بڑے بھائی کو بلایا۔ اس پر مَیں نے سیدھا وار کیا۔ مَیں نے کہا — "تمہارا باپ اور تمہارا چچا پھسل گئے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ اپنی بہن کی لاش کہاں پھینکی ہے؟"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوری دلیری سے بولا — "لاش

کہیں پھینکی نہیں۔ اگر بہن زندہ سامنے آگئی تو اس کی لاش کہیں پھینکوں گا نہیں۔ لاش گھر میں پڑی ہو گی اور مَیں تمہارے پاس کلہاڑی لے کر خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ اور اگر اُس آدمی کا اتا پتا مل گیا تو اُس کی لاش بھی تمہیں خود دکھاؤں گا اور اپنے ہاتھ تمہارے آگے کر کے کہوں گا یہ لے تھانیدار، ہتھکڑی لگا لے۔"

اتنی پختہ بات سُن کر میرا دل مان گیا کہ قصّہ کچھ اور ہے اور میرا شبہ بے بنیاد ہے۔ پھر بھی مَیں نے اسے کہا — "دیکھ جوان! غیرت والے بھائی اسی طرح باتیں کیا کرتے ہیں۔ مَیں پولیس کا آدمی ہوں۔ مَیں صرف باتوں سے راضی نہیں ہوں گا۔"

اُس تیس چوبیس سال کی عمر کے گبھرو جوان نے میرا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا — "مَیں جانتا ہوں تم صرف باتوں سے راضی نہیں ہو گے۔ تم نے ہمارے دشمنوں کا خنزیر کھا لیا ہو گا۔ ہمارے گھر سے تمہیں ایک پیسہ نہیں ملے گا۔ ایک ہماری عزت گئی۔ دنیا کے سامنے بدنام ہوئے اور تم ہم پر الزام لگاتے ہو کہ ہم نے اپنی بہن کو قتل کر کے لاش کہیں پھینک دی ہے" — مَیں درمیان میں بولنے لگا تو اس نے بڑے رُعب سے کہا — "دیکھو ملک صاحب! تم تھانیدار ہو، میرے خدا نہیں ہو۔ تمہارے گھر میں بیٹی کی ذات ہے۔ غیرت کرو۔ مجھے ہتھکڑیوں اور پھانسی کا ڈر نہیں۔ جس دن سے میری بہن غائب ہوئی ہے، مَیں پھانسی کے تختے پر کھڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے اب تمہاری دھونس اور ہتھکڑیاں ڈرا نہیں سکتیں۔ اصل مجرم پکڑو، نہیں تو مجھے حوالات میں بند کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے بچے میرے ہاتھوں یتیم ہو جائیں۔"

دیہات کے لوگ تھانیداروں کو خدا سمجھا کرتے تھے۔ ایسی دھونس سے پولیس کے آگے کوئی نہیں بولتا تھا، لیکن اس نوجوان نے مجھے ہلا کے رکھ دیا۔ مَیں بھی مسلمان تھا اور دو بچیوں کا

باپ اور ایک بہن کا بھائی۔ مَیں نے اس کی بات تسلیم کر لی کہ لڑکی اپنے لواحقین کے ہاتھوں قتل نہیں ہُوئی۔

اس کے باپ اور چچا کا انداز بھی بتاتا تھا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ مَیں نے اس کے چھوٹے بھائی کو نہ بلایا۔ بڑے بھائی کو یقین دلایا کہ مَیں نے دوسرے فریق سے رشوت نہیں لی اور مَیں اس کی بہن کو اپنی بہن اور بیٹی سمجھتا ہوں۔ اسے مَیں نے کہا کہ مَیں اس کی ماں سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔

اُس نے کہا کہ یہ مہربانی کرو کہ اسے یہاں نہ بلانا۔ ہمارے گھر چلو اور اکیلے چلو۔ کوئی سپاہی ساتھ نہ ہو۔ جو پوچھو گے بتائیں گے۔ عزت خاطر کریں گے لیکن ہم گاؤں میں یہ نہیں کہلوانا چاہتے کہ ہماری ماں کو پولیس نے طلب کیا ہے۔

مَیں اُس وقت وردی میں تھا۔ مجھے اس جوان کی باتیں اتنی اچھی لگیں کہ مَیں نے اسے کہا — "مَیں تمہارے خاندان کی پُوری عزت کروں گا۔ مَیں وردی میں تمہارے گھر نہیں جاؤں گا اور دن کے وقت بھی نہیں جاؤں گا۔ آج رات کو آؤں گا۔"

لڑکی دوسرے گاؤں جاتی تھی

مَیں اُسی رات دیہاتی کپڑے پہن کر اُن کے گھر گیا۔ لڑکی کی ماں کو الگ بٹھا کر پوچھا کہ لڑکی عام طور پر کس طرح کے کپڑے پہنا کرتی تھی۔ مَیں نے اپنے ذہن پر بہت ہی زور دے کر تفتیش کی ایک لائن نکالی تھی اور اس میں پولیس کپتان کے مشورے بھی شامل تھے۔ مَیں اب ان کے مطابق تفتیش کر رہا تھا۔

ماں نے بتایا کہ لڑکی ہمیشہ سُوٹ ہی پہنا کرتی تھی یعنی شلوار اور قمیض کا رنگ ایک ہی ہوتا تھا۔ یہ بات میرے کام کی تھی۔

مَیں نے اُس سے پوچھا "لڑکی کے کتنے سُوٹ تھے؟"

اس نے بتایا "پانچ۔"

میرے پوچھنے پر اس نے ہر ایک سُوٹ کا رنگ بھی بتا دیا۔ میں نے اسے کہا کہ ایک سوٹ وہ پہن کر گئی ہے۔ باقی چار سُوٹ مجھے دکھا دو۔ وہ اُٹھی تو مَیں بھی اس کے ساتھ لالٹین لے کے چل پڑا۔ لڑکی کا سُوٹ کیس الگ تھا۔ مَیں نے لالٹین پکڑے رکھی۔ لڑکی کا باپ اور بھائی بھی ساتھ کھڑے تھے۔ سُوٹ کیس سے یہ کپڑے برآمد ہوئے — تین سوٹ یعنی ایک ہی رنگ کی شلوار اور قمیض جن میں ایک سُوٹ پھولدار تھا اور ایک قمیض آسمانی رنگ کی تھی — یہ قمیض اُس شلوار کے ساتھ کی تھی جو باہر سے خون آلود برآمد ہوئی تھی۔ کپڑوں کا یہ تھا جوڑا گھر میں نہیں تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی یہ سُوٹ پہن کر گئی ہے اور آسمانی رنگ کی شلوار ویسے ہی ساتھ لے گئی تھی — راستے میں پھینک جانے کے لیے۔ یہ یاد رکھیے کہ شلوار ایسی جگہ پھینکی گئی تھی جہاں درخت تھے۔ قریب پانی کا چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے وہاں آرام کے لیے بیٹھتے تھے۔ وہاں سے راستہ بھی گذرتا تھا۔

گھر میں ماں نے جو تھا جوڑا بہت سنبھال کر رکھا، نہ ملا۔ گھر سے کوئی نقدی یا زیور کی کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ مَیں سوچنے لگا کہ لڑکی کو ان لوگوں نے خود قتل نہیں کیا۔ اکبر کو بھی انہوں نے قتل نہیں کیا تو قاتل کون ہے اور لڑکی کس کے ساتھ گئی ہے؟ — یہ امر یقینی تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی ہے۔

مَیں نے اس کی ماں کو الگ کر کے کہا — "جب تک تم کوئی سراغ نہیں دو گی، لڑکی نہیں ملے گی۔ یہ بتاؤ کہ اکبر کے علاوہ گاؤں کے کسی اور لڑکے کو لڑکی نے کبھی پسند کیا تھا؟ یا تمہیں کبھی شک ہُوا تھا؟"

اُس نے قسمیں کھا کر کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور نہ ہی اُس نے کبھی اکبر کے متعلق پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

"لڑکی کسی دوسرے گاؤں میں کبھی گئی تھی؟"

"ہاں" — ماں نے بلاجھجک کہا — "فلاں گاؤں میں میری بہن ہے۔ لڑکی وہاں جایا کرتی تھی۔ تین تین چار چار روز رہتی تھی۔"

"تمہاری اس بہن کا کوئی لڑکا جوان ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "سب سے بڑے لڑکے کی عمر ابھی چھ سال ہے۔"

"لڑکی دوسرے گاؤں جایا کرتی تھی" — یہ الفاظ میرے دماغ میں اٹک گئے۔ مَیں وہاں سے خوش و خرّم نکلا۔ میری تفتیش غلط راستے پر نہیں جا رہی تھی۔ مَیں گاؤں سے نکلا تو سرکاری چوکیدار راستے میں کھڑا ملا۔ گاؤں میں صرف اسے پتہ تھا کہ مَیں آ رہا ہوں۔ وہ میری واپسی کے انتظار میں وہاں کھڑا تھا۔ اُس نے پوچھا — "میرے لیے کوئی حکم؟"

مَیں نے اُسے کہا کہ فلاں گاؤں کا چوکیدار صبح میرے پاس آ جائے اور اسے سختی سے کہنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

مَیں تھانے چلا گیا اور جب چارپائی پر لیٹا تو دو گھنٹے نیند ہی نہ آئی۔ مَیں نے اکبر کے قتل کو ابھی نظر انداز کر رکھا تھا۔ ساری توجہ لڑکی پر تھی اور پولیس والوں میں جو چھٹی حس ہوتی ہے وہ مجھے بتا رہی تھی کہ لڑکی کا سراغ مل گیا تو اکبر کا قاتل بھی مل جائے گا۔

دیہات کے سرکاری چوکیدار بڑے کام کے لوگ ہوتے تھے۔ تھانے میں گھر گھر کی خبریں دیا کرتے تھے۔ اُن کی بیویاں بھی ہماری مخبر ہوتی تھیں۔ غریب لوگ تھے۔ اُن کی بیویاں بڑے گھروں میں کام کاج کیا کرتی تھیں اور ہر گھر میں آتی جاتی تھیں۔

صبح ہی صبح دوسرے گاؤں کا چوکیدار آ گیا۔ وہ کوئی بڑا گاؤں نہیں تھا۔ کسی کے گھر مہمان آتے تو سارے گاؤں کو پتہ چل جاتا تھا۔ مَیں نے اس چوکیدار سے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تو اُس نے یہ رپورٹ دی — لڑکی اپنی خالہ کے پاس آیا کرتی ہے۔ تین چار دن رہتی ہے۔ گاؤں کا ایک جواں سال آدمی نور احمد، فوج میں نائک ہے۔ سال میں دو دفعہ چھٹی آتا ہے۔ ایک بار دس بارہ دنوں کے لیے اور ایک بار مہینے کی چھٹی لے کر۔ وہ جب چھٹی آتا ہے تو لڑکی اپنی خالہ کے پاس ضرور آتی ہے اور پانچ چھ دن رہتی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی چھوڑ جاتا ہے اور لینے کے لیے بھی آ جاتا ہے۔ میری (چوکیدار کی) بیوی نے بتایا ہے کہ لڑکی نور احمد سے ملتی ہے۔ وہ اُس کی خالہ کے گھر بہت آتا جاتا ہے۔ رات کو دیر سے وہاں سے نکلتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی کا اس کے ساتھ دوستانہ ہے۔ لڑکی کی اس کے ساتھ شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ ذات نہیں ملتی۔

مَیں نے چوکیدار سے پوچھا کہ لڑکی کی گمشدگی کے دنوں نور احمد چھٹی آیا تھا؟ اُس نے بتایا کہ نہیں۔ دو مہینے گزرے، وہ چھٹی آیا تھا۔

نائک نور احمد کا تعاقب

مَیں نے نور احمد کی یونٹ کا نمبر معلوم کر لیا اور یہ چھاؤنی بھی۔ گاؤں کے ریلوے سٹیشن سے چھاؤنی پینتیس میل دُور تھی۔ مَیں نے دوسرے ہی دن لڑکی کے باپ اور چچا کو ساتھ لیا اور اُس چھاؤنی میں جا پہنچا۔ پولیس سٹیشن کا ہیڈ کوارٹر بھی وہیں تھا۔ دفتری طریقہ تو کچھ اور ہوتا ہے لیکن مَیں نے یہ دلیری کی کہ سیدھا پولیس کپتان کے دفتر میں چلا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ڈانٹ کر بلکہ گالیاں دے کر دفتر سے نکال دے گا اور مجھے اس بدتمیزی پر

معطل کر دے گا کہ مَیں دفتری طریقہ اختیار کرنے کی بجائے اپنے آپ کو اتنا بڑا افسر سمجھ بیٹھا ہوں کہ پولیس کپتان کو براہِ راست ملنے چلا گیا ہوں۔ لیکن مجھے اس چیز کا بھروسہ تھا کہ اس نے اس کیس کو "دلچسپ" کہا تھا اور اتنی دلچسپی لی تھی کہ مجھے مذاق میں کہا تھا کہ وہ مجھے سکاٹ لینڈ یارڈ بھیج دے گا۔

مَیں نے اندر اطلاع بھجوائی تو اس نے فوراً بلا لیا۔ مَیں نے پہلے تو اس غیر سرکاری حرکت کی معافی مانگی پھر خوشامد اور جی حضوری کے کمالات دکھانے شروع کیے مگر اس نے دھماکے سے کہا۔ "کام بولو کیا ہے۔ کس واسطے اِدھر آگیا"۔

مَیں نے جلدی جلدی اسے اپنی تفتیش کی تفصیل سنائی۔ اُس کا غصّہ مسکراہٹ میں بدل گیا۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ نائک نور احمد فلاں نمبر رجمنٹ میں ہے۔ اُس کے کمانڈنگ آفیسر سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اُسے کہیں کہ میری مدد کرے۔ مَیں نے اسے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کا باپ اور چچا بھی ساتھ ہیں تاکہ لڑکی برآمد ہو تو اُس کی شناخت کر سکیں۔

پولیس کپتان نے کہا کہ ان دونوں کو رجمنٹ میں نہ لے جانا۔ انہیں پولیس لائنز میں ٹھہراؤ۔ اُس نے مجھے کہا کہ مَیں وہاں وردی میں نہ جاؤں تاکہ ملزم اگر مجھے دیکھ لے تو شک نہ کرے ورنہ باوردی تھانیدار کو دیکھ کر وہ چوکنا ہو جائیگا۔ اُس نے اسی وقت اپنے پی اے سے کہا کہ فلاں رجمنٹ کے سی۔ او (کمانڈنگ آفیسر) سے ملا دو۔ نمبر مل گیا۔ پولیس کپتان نے سی۔ او کو سارا کیس سُنایا۔ سی۔ او انگریز تھا۔ اُس نے مجھے اُسی وقت بلا لیا۔

مَیں نے لڑکی کے باپ اور چچا کو پولیس لائنز میں چھوڑا۔ وردی اتاری اور بیگ سے اپنے کپڑے پہن کر رجمنٹ میں گیا۔ گورا کمانڈنگ آفیسر بڑی عزت سے پیش آیا۔ مَیں انگریزی میں اُسے کہانی سُنانے لگا تو مَیں نے محسوس کیا کہ میری انگریزی تھانے کے اندر

ہی ٹھیک رہتی ہے۔

صاحب نے مُسکرا کر کہا ــــ "ہم اُردو ٹھیک جانتا ہے۔ اُردو بولو"۔

اُسے مجھ پر یا شاید اپنی مادری زبان پر رحم آگیا تھا۔ مَیں نے اُردو میں لے دے کر واردات اور اپنی تفتیش سُنائی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ بور ہوگا لیکن وہ اتنی دلچسپی سے سُنتا رہا کہ ایک بار بول پڑا ــــ "بہت اچھا انسپکٹر۔ بہت اچھی سٹوری ہے اور ٹھیک سے سُناؤ۔ آہستہ سُناؤ"۔

مَیں نے باقی کہانی مزے لے لے کر سُنائی اور اسے بتایا کہ مجھے شُبہ ہے کہ اس کی رجمنٹ کا نائک نور احمد لڑکی کو لے آیا ہے اور مَیں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔

اُس نے اسی وقت صوبیدار میجر کو اور نور احمد کے کمپنی صوبیدار کو بلایا۔ دونوں آئے تو سی۔ او نے ان سے پوچھا "نائک نور احمد شادی شدہ ہے؟ اور کیا وہ فیملی کوارٹرز میں رہتا ہے؟"

کمپنی صوبیدار نے کہا "نہیں صاحب! وہ شادی شدہ نہیں ہے اور بارک میں رہتا ہے"۔

فوج میں شادی شدہ افراد میں سے کچھ کو فیملی کوارٹر ملتے ہیں جو بارکوں کے قریب ہی ہوتے ہیں۔ بارکوں میں جو افراد رہتے ہیں وہ بغیر اجازت باہر نہیں جا سکتے۔ مَیں نے سی۔ او سے کہا کہ مہربانی کر کے یہ انتظام کریں کہ رات کے وقت نائک نور احمد پر نظر رکھیں۔

صوبیدار میجر نے کہا ــــ "نہیں صاحب! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ رات کے وقت کوئی جوان یا عہدیدار لائنوں سے غیر حاضر ہو"۔

مَیں نے اُسے کہا ــــ "جناب! مَیں پولیس کا آدمی ہوں۔ اگر ایک کنواری لڑکی اپنی شلوار کو خون لگا کر سارے گاؤں کو یہ دھوکہ دینے کے لیے راستے میں پھینک سکتی ہے کہ اُس

کی آبروریزی ہوئی ہے اور وہ قتل ہوگئی ہے تو فوج کا ایک نائک تو بہت کچھ کرسکتا ہے۔"

سی۔ او نے انہیں حکم دیا کہ رات کے وقت وہ کسی کی ڈیوٹی لگائیں جو چوری چھپے اس کا خیال رکھے اور وہ جہاں کہیں جائے [illegible]پ کر اُس کا پیچھا کرے اور دیکھے کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ سی۔ او نے مجھے کہا کہ میں کل ساڑھے آٹھ بجے صبح اُس کے دفتر میں آجاؤں۔

مَیں نے صوبیدار میجر اور صوبیدار کو اپنی طرف سے کچھ ہدایات دیں اور وہاں سے پولیس لائنز چلا گیا۔

مَیں دوسرے دن ساڑھے آٹھ بجے سی۔ او کے دفتر میں گیا۔ برآمدے میں صوبیدار میجر اور صوبیدار کھڑے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک نائک اور ایک حوالدار بھی کھڑا تھا۔ حوالدار رجمنٹل پولیس کا تھا۔ صوبیدار میجر نے اندر جا کر سی۔ او کو میری اطلاع دی پھر مجھے بلایا۔

سی۔ او نے ہنس کر کہا۔۔۔ "آپ کا شک ٹھیک ہے صاحب!"

مجھے بتایا گیا کہ رجمنٹل پولیس کے حوالدار نے رات چھُپ کر دیکھا۔ نور احمد رات گیارہ بجے کے بعد بارک سے نکلا اور سنتریوں کی نظر سے بچتا ہُوا لائنوں کی حدود سے باہر نکل گیا۔ پولیس حوالدار نے اُس کا تعاقب کیا۔ نور احمد تیز تیز چلتا چھاؤنی کے اُس علاقے میں چلا گیا جہاں بیرے اور ملازم وغیرہ معمولی معمولی سے مکانوں میں رہتے ہیں۔ نور احمد نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھُلا اور وہ اندر چلا گیا۔ رجمنٹل پولیس کا حوالدار اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور چھپا رہا۔ نور احمد صبح چار بجے اس مکان سے نکلا اور بارک میں آگیا۔

یہ خون وہ نہیں تھا

مَیں نے سی۔ او سے کہا کہ اس مکان پہ چھاپہ مارنا ہے۔ میرے ساتھ رجمنٹ کے

کسی ذمہ دار افسر کا ہونا ضروری ہے۔ اس نے صوبیدار میجر کو ہی کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ نائک نور احمد کو پابند کر لیا گیا۔

مَیں دوڑا گیا۔ پولیس لائنز سے لڑکی کے باپ اور چچا کو ساتھ لے آیا۔ صوبیدار میجر، پولیس حوالدار اور نائک نور احمد کو ساتھ لے کر ہم اُس علاقے میں گئے جہاں وہ مکان تھا۔ راستے میں نور احمد نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ عائشہ کے باپ اور چچا کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اُن کے ساتھ اس نے صرف ہاتھ ملایا تھا۔ وہ گھبرایا ہُوا بھی نہیں تھا۔

اُس علاقے میں پہنچ کر مَیں نے سب کو روکا اور نور احمد سے میں نے کہا۔۔۔ "نائک نور احمد! آپ ہمیں اُس مکان میں لے چلیں جہاں آپ نے فلاں گاؤں کے فلاں آدمی کی بیٹی عائشہ کو رکھا ہُوا ہے۔"

مَیں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اُس نے گھبرانے یا جھوٹ بولنے یا ٹال مٹول کرنے کی بجائے یہ کہا۔۔۔ "بسم اللہ۔ آؤ۔ سارے آجاؤ۔"

مجھے یہ ڈر محسوس ہُوا کہ مکان میں لڑکی نہیں ہوگی ورنہ نور احمد اتنی دلیری کا مظاہرہ نہ کرتا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔ نور احمد نے ہماری راہنمائی کی اور ایک کچے سے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھُلا۔ ایک لڑکی کا چہرہ نظر آیا اور چہرہ کواڑ کے پیچھے ہو گیا۔

نور احمد نے ہمیں کہا "آجاؤ"۔۔۔ اور دروازے کے پیچھے کھڑی لڑکی سے کہا۔۔۔ "گھبرانا نہیں۔ اللہ مالک ہے۔"

ہم اندر گئے۔ عائشہ سامنے کھڑی تھی۔ مَیں تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ اس کے باپ اور چچا نے اسے شناخت کر کے مجھے بتایا کہ یہی ان کی گمشدہ بیٹی ہے۔ نور احمد پورے اطمینان سے الگ کھڑا رہا۔ عائشہ کے باپ اور چچا نے گالی گلوچ شروع کر دی۔ مَیں نے انہیں روک دیا اور

عائشہ سے کہا — "تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی"— نور احمد نے فوجیوں کے لہجے میں کہا — "اس کی عمر بیس سال ہے۔ یہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ شادی کر چکی ہے"— نور احمد اندر گیا اور ایک سوٹ کیس سے اس نے نکاح نامہ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ اغوا کی واردات ہے اور اس کا تعلق ایک آدمی کے قتل کے ساتھ بھی ہے۔

نور احمد کی جگہ صوبیدار میجر بول پڑا۔ اس نے کہا — "تھانیدار صاحب! یہ فوج کا آدمی ہے اور ہمارے رجمنٹ کا نائک ہے۔ اب آپ جو کارروائی کریں گے وہ ہمارے سی او صاحب کے آرڈر سے کریں گے۔ یہ گاؤں نہیں ہے، فوج ہے۔ یہاں فوج کا دستور چلتا ہے، سول پولیس نہیں۔"

صوبیدار میجر کے لہجے میں میرے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے نائک کی طرفداری کر رہا ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو صوبیدار میجر نے لڑکی کے باپ اور چچا سے کہا کہ آپ ذرا باہر چلے جائیں۔ وہ چلے گئے تو صوبیدار میجر نے ہم سب کو اندر لے جا کر ایک چارپائی پر بٹھایا۔ لڑکی کو صحن میں بٹھا دیا۔ اس نے نور احمد سے کہا "ہمیں صحیح واقعہ سنا دو۔ پھر جو اللہ کرے گا۔"

نور احمد غالباً اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے صاف صاف بتایا کہ لڑکی اسے چاہتی تھی اور وہ لڑکی کو چاہتا تھا۔ اس کے گاؤں میں لڑکی اپنی خالہ کے ہاں جاتی تھی اور وہاں پہلی بار وہ ملے تھے۔ پھر ہر چھٹی کے دوران وہ ملتے رہے۔ ان کی محبت پاک تھی۔ ان کی شادی ذات کے فرق کی وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے لڑکی کو ایک رات بتائی کہ وہ فلاں جگہ آئے گا اور لڑکی آ جائے۔ انہوں نے یہ پروگرام دو ماہ پہلے بنایا تھا جب نور احمد چھٹی گیا ہوا تھا۔

نور احمد نے اسے کہا تھا کہ ایک فالتو شلوار ساتھ لانا۔ وہ جس چھاؤنی سے گاڑی پر گیا اور گاؤں سے اڑھائی میل دور ان کا جو سٹیشن تھا وہاں اترا۔ اس کی جیب میں چاقو تھا۔ رات تک وہ ادھر ادھر چھپتا پھرتا رہا۔ مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پہنچا۔ لڑکی آ گئی۔ ایک شلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ نور احمد نے اپنی انگلی میں چاقو کی نوک ماری اور خون شلوار کے پائنچے پر مل دیا اور شلوار ایسی جگہ پھینک دی جہاں سے لوگ گزرتے تھے۔ اس نے یہ ڈرامہ یوں کھیلا تھا کہ شلوار برآمد ہو گی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ لڑکی کو خراب کر کے کہیں قتل کر دیا گیا ہے۔

صوبیدار میجر نے کہا — "لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ فوجی بیوقوف ہوتے ہیں۔ جب تم اتنی دلیری کر رہے تھے تو شلوار اور خون کا ناٹک بنانے کی کیا ضرورت تھی؟"— صوبیدار میجر نے مجھ سے کہا — "انسپکٹر صاحب! فوجی میں دلیری ضرور ہوتی ہے عقل نہیں ہوتی۔"

"جی ہاں"— میں نے کہا — "اس نے تو بے عقلی کی ہے لیکن میری عقل کا ایسا امتحان لیا کہ ساری عمر یاد رکھوں گا۔ اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ شلوار والا خون ڈاکٹروں سے ٹیسٹ کروایا جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ یہ خون کیسا ہے۔"

بہرحال نور احمد نے بتایا کہ اس نے اس قسم کی ایک کہانی اپنے کمپنی کلرک سے سنی تھی۔ اس کی فوجی عقل کو یہ طریقہ بڑا ہی انوکھا اور کامیاب نظر آیا تھا۔ اس نے شلوار وہاں پھینکی اور جب پون ایک میل آگے گئے تو اسے اچانک بالکل اپنے پیچھے سے آواز آئی "ٹھہر جاؤ۔ مرد ہو تو لڑکی مردوں کی طرح لے جاؤ۔"

وہ فوجی تھا۔ برما فرنٹ پر لڑ کر آیا تھا۔ تیزی سے پیچھے مڑا۔ عائشہ ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ آدمی کلہاڑی اپنے سر سے اوپر اور پیچھے لے جا چکا تھا۔ عائشہ ذرا پیچھے تھی۔ اس نے اتنی پھرتی دکھائی کہ جست لگا کر آگے ہوئی اور کلہاڑی جو ابھی اس آدمی کے سر سے پیچھے ہی تھی

عائشہ نے پکڑ لی اور زور سے پیچھے کھینچی۔ وہ مرد تھا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے نہ نکلی۔ البتہ اس کا وار رک گیا۔ نور احمد نے اُچھل کر اُس کے پیٹ میں لات ماری۔ کلہاڑی اس آدمی کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، اور عائشہ کے ہاتھ میں رہ گئی۔ عائشہ نے کلہاڑی نور احمد کو دے دی۔

انہیں ابھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ آدمی کون ہے۔ اندھیرا گہرا تھا۔ نور احمد نے کلہاڑی کے تین وار کیے۔ ایک گردن پر لگا۔ ایک پیٹھ پر اور آخری وار سر پر لگا۔ نور احمد نے کلہاڑی اس کے سر میں ہی رہنے دی اور عائشہ کو لے کر سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ نور احمد نے اسے لڑکھڑاتے دیکھا تھا۔ گرتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اب وار کرنے کے قابل نہیں رہا۔ عائشہ اور نور احمد کو بالکل علم نہیں تھا کہ وہ کون تھا۔ میں نے نور احمد کو بتایا کہ وہ عائشہ کا پہلا منگیتر اکبر تھا۔

وہ دلیر تھا یا بیوقوف؟

خون کے نشان کھوجیوں نے مجھے دکھائے تھے۔ ان سے باقی کہانی مکمل ہوتی تھی۔ اکبر کلہاڑی اٹھا کر یا کلہاڑی کے سہارے وہاں سے گاؤں کو چل پڑا تھا اور کھڈ میں جا کر مر گیا تھا۔ اپنے قتل کا آلہ قتل اس کے اپنے ہی پاس رہا۔ نور احمد صبح سے پہلے پہلے چھاؤنی پہنچ گیا۔ اُس نے مکان کا انتظام اور اس کے دوستوں نے نکاح کا انتظام کر رکھا تھا۔ نکاح پڑھا گیا۔ اب وہ ہر رات یہ خطرہ مول لیتا تھا کہ رات گیارہ بجے کے بعد چوری چھپے اپنی بیوی کے پاس چلا جاتا تھا اور صبح چار بجے بارک میں آجاتا تھا۔

یہ سراغ لگانا ناممکن تھا کہ اکبر ان کے پیچھے کس طرح چلا گیا تھا۔ اس نے شاید رات کو عائشہ کو گاؤں سے باہر جاتے دیکھ لیا ہوگا اور کلہاڑی لے کر اس کا پیچھا کیا ہوگا۔ بہرحال

یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

نور احمد نے جس دلیری سے اپنے جرم کی تفصیل سُنا دی، اس سے یہ رائے قائم کرنا مشکل تھا کہ وہ دلیر ہے یا بے وقوف۔ میرے خیال میں اس میں دونوں ہی وصف تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس جوان کا مستقبل کس طرح تاریک ہو گیا ہے اور اُس نے ایک نوجوان لڑکی کی بھی زندگی تباہ کر دی ہے۔ نور احمد کو تو اب جیل جانا تھا۔ بہرحال اس کی رجمنٹ کے افسروں نے میری اور اس کی ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ وہ اس طرح کہ جب میں نے لڑکی کی برآمدگی کے کاغذات تیار کر لیے اور صوبیدار اور پولیس حوالدار سے دستخط لینے لگا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

صوبیدار میجر نے کہا — "ہمارے سامنے کوئی لڑکی برآمد نہیں ہوئی۔ ہمارے سی او صاحب سے بات کرو۔"

ہم رجمنٹ کے دفتر میں گئے۔ مجھے باہر کھڑا کر دیا گیا۔ صوبیدار میجر اپنے سی او کے دفتر میں جانے کی بجائے کسی اور افسر کے دفتر میں چلا گیا۔ پھر میں نے دو انگریز افسروں کو صوبیدار میجر کے ساتھ سی او کے دفتر میں جاتے دیکھا۔ بہت دیر بعد نائک نور احمد کو اندر بلایا گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد سب باہر نکلے۔

اتنی دیر میں ان کا رجمنٹل پولیس حوالدار میرے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے کہا — "آپ کو یہ آدمی نہیں ملے گا۔ فوجی ایک دوسرے کی پوری مدد کیا کرتے ہیں۔ یہ نائک ہماری رجمنٹ کا ہی نہیں ڈویژن کا بھی ایتھلیٹ ہے۔ فوج میں ایتھلیٹ کو گھوڑے کی طرح پالا جاتا ہے اور اسے رجمنٹ کی عزت سمجھا جاتا ہے۔"

آخر مجھے سی او نے اندر بلایا اور صرف اتنا کہا "آپ اپنے محکمے کی طرف سے نہیں لکھیں

کہ آپ کو ہمارا ایک نائک کیوں مطلوب ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

مَیں پولیس کپتان کے پاس گیا۔ اُسے پوری رپورٹ دی۔ اُس نے اُسی وقت سی۔ او کو ٹیلی فون کیا، لیکن صرف ایک منٹ میں سی۔ او نے بات ختم کر دی۔ پولیس کپتان نے ریسیور بڑی زور سے رکھا اور پنجابی زبان کی موٹی ساری گالی دی۔

اس کے بعد پولیس اور فوج میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رجمنٹ نے لکھا کہ واردات والی رات نائک نور احمد ڈیوٹی پر تھا اور اس عرصے میں رجمنٹ لائنز سے کبھی غیر حاضر نہیں ہُوا۔

ہمیں اپنی کارروائی پوری کرنی تھی۔ نائک نور احمد کو بہرحال ہم نے بڑے جتن کر کے پولیس کی حراست میں لیا اور چالان عدالت میں دے دیا لیکن ملزم کی رجمنٹ نے دستاویزی ثبوت پیش کر دیا کہ ملزم واردات کی رات موقعۂ واردات سے بتیس میل دُور نائٹ ڈیوٹی پر تھا۔ ہمارا کیس ایسا چوپٹ ہُوا کہ مجسٹریٹ نے مقدمہ سیشن سپرد کیا ہی نہیں اور ملزم کو چھوڑ دیا۔

لیکن نور احمد اور عائشہ سزا سے بچ نہ سکے۔ بعض قارئین کرام کو ۱۹۴۶ء کا آخری مہینہ یاد ہو گا جب ملک میں اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے تھے۔ مسلمان پاکستان کے نام پر اور غیر مسلم متحدہ ہندوستان کے نام پر الیکشن لڑ رہے تھے۔ ملک کا بچّہ بچّہ اس الیکشن میں سپاہیوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ ہر کسی کی توجہ الیکشن پر تھی۔ انہی دنوں اخباروں میں چھوٹی سی ایک خبر چھپی تھی ——
"جہلم چھاؤنی میں ایک شقی القلب دیہاتی نے ایک رجمنٹ کی بارک میں جا کر نور احمد نام کے ایک نائک کو کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے قتل کر دیا ہے۔ اس سے پہلے وہ اُس کی بیوی کو جو قاتل کی اپنی بہن تھی، اُس کے مکان میں قتل کر آیا تھا۔ فوجیوں نے قاتل پر قابو پا لیا اور اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ قتل کی وجہ دیرینہ عداوت بیان کی جاتی ہے۔"